ساہتیہ اکادمی انعام یافتہ

دو گز زمین

عبد الصمد

نصرت پبلشرز۔ لکھنو

اپنی نانی اماں مرحومہ کے نام

پہلا حصّہ

۱

بہار شریف سے پچھم پندرہ میل پر ایک چوراہا ہے جس کے اُتّر جانب چار میل کچے راستے پر چلنے کے بعد ایک مشہور گاؤں ہے بین۔ یہ کوئی مردم خیز گاؤں تو نہیں لیکن اس میں ایک مرد پیدا ہوا تھا شیخ الطاف حسین، جس کی وجہ سے گاؤں کا نام زندہ و تابندہ رہے گا۔ شیخ صاحب اپنی نوجوانی سے ملکی سیاست میں دل چسپی لینے لگے تھے۔ اُس زمانے میں خلافت تحریک اپنے شباب پر تھی۔ یوں تو یہ تحریک مسلمانوں سے مذہبی اور جذباتی طور پر منسلک تھی لیکن مقتدر ہندو رہنماؤں کی حمایت نے اُسے ایک قومی تحریک بنا دیا تھا۔ افریقہ سے جب گاندھی جی کچھ کر گزرنے کا جذبہ لے کر ہندوستان آئے، اس وقت انہوں نے بھی خلافت تحریک کی افادیت اور اہمیت کو محسوس کیا۔ برسوں سے انگریزوں کے سامنے جھکی ہندوستانی قوم میں پہلی بار زندگی کے آثار نظر آئے تھے۔ اُس کی جھکی ہوئی کمر آہستہ آہستہ سیدھی ہو رہی تھی اور اقتدار کے نشہ میں چور انگریز کے چہرے پر پریشانی سی نظر آتی تھی۔

خلافت تحریک کے سلسلے میں ملک کے بڑے بڑے رہنما بین آئے۔ مولانا شوکت علی، مولانا محمد علی، گاندھی جی، بی اماں ——— بین اور آس پاس کے دیہاتوں کے ہر گھر میں گایا جاتا۔ ؎

بولیں اماں محمد علی کی
جان بیٹا خلافت پہ دے دو

اِن رہنماؤں کی آمد پر گاؤں میں جو بڑے بڑے جلسے ہوئے، اُن کے چشم دید گواہوں کا کہنا ہے کہ پھر کانگریس اور مسلم لیگ بھی ایسے جلسے نہیں کرا سکی۔ روایت ہے کہ گاندھی جی کی چپل اس گاؤں میں آ کر ٹوٹ گئی تھی تو اسے بنوانے کے لیے خاص طور پر شہر بھیجا گیا تھا۔ یہ وہ زمانہ تھا جب موتی لال نہرو کے بارے میں خواص و عوام میں یہ بات بہت مشہور تھی کہ اُن کے کپڑے پیرس سے دُھل کر آتے ہیں، عطر، سینٹ اور دوسری خوشبوؤں میں بسے ہوئے۔

شیخ صاحب، گاؤں کے بڑے زمیندار نہیں تھے۔ سولہ آنہ میں چھ آنہ اُن کا حصّہ تھا لیکن

عزّت سولہ آنہ کی تھی۔ گاؤں کے کنارے بڑی سی حویلی تھی کھپریل، بڑے بڑے دالان، بڑے بڑے کمرے۔ سامنے ایک بہت بڑا میدان تھا جس میں جلسے ہوا کرتے۔ اُس کے بعد تالاب، جس میں مہمانوں کی خاطر کے لیے مچھلیوں کے بہترین زیرے چھوڑے جاتے۔ لوگ جب حویلی کے پاس سے گزرتے تو ذکر کرتے کہ حویلی کے فلاں دالان میں گاندھی جی ٹھہرے تھے اور فلاں کمرے میں علی برادران۔ شیخ صاحب سامنے کے دالان میں اکثر بیٹھے رہتے لیکن گاؤں کے لوگوں کے لیے ضروری نہیں تھا کہ گزرتے ہوئے اُنھیں سلام کریں ہی۔ جب کہ دس آنہ حصّہ والوں کی حویلی جو پختہ اور دو منزلہ تھی، کے سامنے سے سلام کیے بغیر گزر جانا، جرم تھا جس کی سزا لازمی تھی۔ شیخ صاحب کی عزّت اور وقار پر سارے علاقے کے لوگ رشک کرتے۔ یہ یقین عام تھا کہ ایک سیدانی کے قدم کی برکت نے اِس گھر کی کایا پلٹ دی ہے ورنہ اُن کے آبا و اجداد بھی گاؤں کے زمین دار اور رئیس تھے چھ آنے کے حصّہ دار، لیکن اُنھیں یہ عروج کبھی حاصل نہیں ہوا تھا۔ شیخ صاحب کے دادا پولیس کے داروغہ تھے۔ ایک مہم میں اُنھوں نے ڈاکوؤں کے ایک مشہور گروہ کا قلع قمع کیا تھا، ڈاکوؤں کا سردار بھاگ نکلا اور اُس نے قسم کھائی کہ بدلہ لیے بغیر چین سے نہیں بیٹھے گا۔ چنانچہ ایک بار ڈولی سے آتے ہوئے ڈاکوؤں نے گھیر لیا، کہار تو ڈولی چھوڑ کر فرار ہو گئے۔ یہ تنہا، نہتے، اُدھر درجن بھر ڈاکو خطرناک ہتھیاروں سے لیس۔ کچھ ڈاکو زخمی ضرور ہوئے لیکن ان لوگوں نے ان کی تکا بوٹی کر ڈالی، صرف ایک ہاتھ صحیح سلامت ملا جسے سرکاری اعزاز کے ساتھ دفن کیا گیا۔ شیخ امداد حسین کی بہادری اور بے جگری کے درجنوں قصّے قرب و جوار کے لوگوں کو یاد تھے۔ اُن کے پوتے شیخ الطاف حسین جب سنِ بلوغ کو پہنچے تو اُن کی والدہ نے لڑکی کے سلسلے میں بس ایک ہی شرط رکھی، لڑکی کھری سیدانی ہو۔ اُس زمانے میں ذات کا کھرا ہونا فخر کی بات تھی اور پھر سید کو تو لوگ سر آنکھوں پر بیٹھاتے، اُنہیں میر صاحب کہا جاتا، اُن سے دعا کرائی جاتی اور اُن کی بددعا سے لوگ ڈرتے۔ آخر تلاش بسیار کے بعد شیخ پورہ کے ایک مشہور سید خاندان کی صاحبزادی سے رشتہ طے ہوا۔ حکیم سید نظیر حسین، طبیبِ وقت حکیم ارشد کے صاحبزادے تھے۔ حکمت تو خیر اُنہوں نے شریفوں کے اطوار کے مطابق پڑھ لی تھی لیکن مطب میں کبھی نہیں بیٹھے، البتہ خاندان بھر کے حکیم تھے، یا پھر اُن لوگوں کے جن سے ذاتی مراسم تھے۔ یہ لوگ اُن سے ایسے امراض کی دوائیں بنواتے جو بہت سے حکیم اور ڈاکٹروں کے ہاتھ سے گزر کر کہنہ ہو چکے ہوتے۔ ایک عطار دالان اور صحن میں بیٹھا کچھ نہ کچھ کوٹتا رہتا، بڑی بڑی لگن میں دوائیں سوکھتی رہتیں ——— بارات میں

صرف بیس آدمی گئے، لیکن دعوتِ ولیمہ میں سیکڑوں نہیں ہزاروں شریک ہوئے اور دس دس کوس کے اندر رہنے والے قریب و دُور کے جو رشتہ دار شریک نہیں ہو سکے، اُن کے لیے خاصے سینیوں میں سجا کر بھیجے گئے۔

شیخ پورہ کی سیدانی، جب بین کے رئیس گھرانے کی بہو بن کر آئی تو اُس نے اپنے کھرے ہونے کا یوں ثبوت دیا کہ اُس کے سامنے دس آنے، سولہ آنے اور بتیس آنے کے گھرانوں کی بہوؤں کا وقار اور دبدبہ بھی ماند پڑ گیا۔ اُن کے میکے میں دو وقت کی روٹی ہی میسّر تھی، اس کے علاوہ گھر میں اور کچھ نہ تھا۔ یوں اللہ کا دیا سب کچھ تھا، عزّت، احترام، وقار ——— سسرال میں اُنھیں بی بی صاحبہ کا لقب ملا تو انہوں نے زندگی بھر اس کی لاج رکھی بلکہ لاج کو بھی نئے معنی عطا کیے۔ رئیسوں کے اطوار میں کسی غریب گھرانہ کی لڑکی کا گھُل مِل جانا آسان نہیں ہوتا۔ یوں بھی وہاں ہر فرد کے ناشتے اور کھانے کے اوقات اور پسند الگ الگ تھی۔ پہلے اگر کسی کو وقت پر اپنی پسندیدہ مرغوب چیز نہیں ملتی تھی تو اب ملنے لگی۔ گھر کا کاروبار اس طرح پھیلا ہوا تھا کہ اُس کے اور چھور کا پتا ہی نہیں چلتا تھا۔ سیدانی کے قدم کی برکت سے گھر میں خانہ داری کا ایک باقاعدہ نظام قائم ہوا۔ ہر کام، اصول و قاعدے کے مطابق اپنے وقت پر انجام پانے لگا۔ گھر میں تعلیم کی کوئی روایت نہیں تھی، عام طور پر پانچ چھ سال کی عمر میں دھوم دھام کے ساتھ بچّوں کے مکتب کرا دیے جاتے جس کے لیے اپنے وقت کے مشہور عالموں اور بزرگوں کو مدعو کیا جاتا۔ مکتب کے بعد گھر ہی پر مولوی صاحب یا حافظ صاحب اُردو، فارسی اور عربی کے سی پارے پڑھاتے، پہاڑے رٹوانے اور قرآن شریف پڑھاتے، میلاد کی کتابیں پڑھائی جاتیں۔ چار قاعدوں اور تیس پاروں کے بعد تعلیم کا سلسلہ منقطع ہو جاتا۔ صاحبزادے فرفر قرآن پڑھنے لگتے، تختی کی مشق کی بدولت خوش خط تحریر لکھنے لگتے اور فارسی اشعار کے معنی بتانے لگتے۔ اس سے زیادہ تعلیم کی ضرورت بھی نہیں تھی۔ سرسیّد کو نیچری قرار دے کر اُن کا نام لینے پر پابندی عائد تھی۔ یوں پروگرام بنایا جاتا، جامعہ ازہر اور استنبول کے مدرسوں میں بھیجے گا، لیکن اس کی نوبت کبھی نہ آتی۔ بی بی صاحبہ کے آنے سے قبل اس خاندان میں زیادہ سے زیادہ دو اولاد ہو کر سلسلہ منقطع ہوتا۔ اللہ اللہ خیر صلّا۔ بی بی صاحبہ کو اللہ نے تابڑ توڑ آٹھ بچے عطا فرمائے۔ چار بیٹے، چار بیٹیاں۔ جو خاندان کئی کئی پشتوں سے بچّے کے لیے ترس رہا تھا، وہاں اللہ نے ایک دو نہیں، آٹھ صورتیں دکھا دیں۔

شیخ صاحب کا خیال تھا کہ وہ دِلّی سے دو دو مولویوں کو گھر بلائیں گے جو دن رات گھر ہی پر رہ کر اُن کی تعلیم و تربیت کا نظم سنبھالیں گے ۔ وہ جو فیصلہ کر لیتے' اُس میں ترمیم کی بہت کم گنجائش ہوتی ۔ اُنہوں نے اپنے بچّوں کے سبھی کام شاہی دھوم دھام کے ساتھ کیے اور مکتب تو اِس قدر شاندار کیا کہ دیکھنے والوں نے دیکھا اور سُننے والوں نے سُنا ۔

گاؤں میں یوں تو سب کچھ تھا' اگر کوئی ایسی ضرورت پڑ جاتی تو شہر بہت دور نہیں تھا ۔ یہ ضرور ہے کہ پندرہ بیس میل کا فاصلہ دن بھر اور کبھی کبھی رات اور دن میں طے ہوتا ۔ ایک ضرورت ایسی بھی جس کے لیے اکثر لوگ شہر کی دوڑ لگاتے رہتے ۔ گاؤں میں ڈاکٹر کا کوئی وجود نہیں تھا' غیر سند یافتہ ایک حکیم اور ایک وید ضرور موجود تھے لیکن اُن کے یہاں زمین دار گھرانوں کے نوکر چاکر اور غریب رشتہ دار ہی جاتے ۔ شیخ صاحب کا گھرانہ یوں بھی لمبا چوڑا تھا' پھر اُن کے ہاں آئے دن مہمانوں کا سلسلہ جاری رہتا ۔ اُن کی چار گھوڑوں کی بگھی' چار میل دور بس اڈّے سے گاؤں اور گاؤں سے بس اڈّے کا چکّر لگاتی رہتی ۔ ایسے موقع پر بی بی صاحبہ نے اُنہیں مشورہ دیا کہ کیوں نہ شہر میں بھی اپنا ایک مکان ہو" ڈاکٹر اور دوسری ضرورتوں کے لیے وہاں آنا جانا لگا ہی رہتا ہے' اِدھر اُدھر ٹھہرنا پڑتا ہے' اپنا مکان ہو جائے گا تو پھر بچّوں کے لیے بھی بہت آسانی ہو جائے گی ۔ مشورہ اُن کو پسند آیا اور شہر میں زمین خرید لی گئی ۔ گاؤں کی حویلی کے نقشے پر وہاں تعمیر ہوئی ۔ کھلی فضا میں رہنے کی عادت سے مجبور ہو کر حویلی کے چاروں طرف کافی زمینیں چھوڑ دی گئیں ۔ حویلی کا نام "بین ہاؤس" رکھا گیا ۔ شہر میں رہنے کے لیے ایک گماشتہ جی کی بحالی ہوئی اور اِس طرح گاؤں اور شہر کے درمیان رشتہ استوار ہوا ۔

خلافت تحریک نے جب تحریک جنگ آزادی کی شکل اختیار کر لی تو پھر اس تحریک کے سبھی سپاہی' جنگ آزادی کے سپاہی بن گئے' گویا تحریک وہی رہی' مقصد بدل گیا ۔ شیخ الطاف حسین نے جنگ آزادی میں کچھ زیادہ ہی زور شور سے حصّہ لیا ۔ پرنس آف ویلس کی آمد کے بائیکاٹ کے سلسلے میں وہ جیل بھی ہو آئے ۔ کھیتوں اور زمین داری سے اُن کی آمدنی کا ایک بڑا حصّہ تحریک آزادی میں صرف ہونے لگا ۔ وہ لوگ جو مالی حیثیت سے کمزور تھے اور جیل جانے کے بعد اُن کے گھر والوں کا کوئی پُرسان حال نہ تھا' اُن کی دیکھ بھال ایسے لوگوں کے ذمّہ فرض تھا جو اتفاق یا کسی اور وجہ سے جیل نہیں جا سکتے تھے ۔ شیخ صاحب روپے پیسے سے تو مدد کرتے ہی' اُن کے گھر سے ایسے

لوگوں کے بال بچّوں کے لیے کھانا تک پک کے جاتا، اس میں ہندو مسلمان کی کوئی تفریق نہیں تھی۔ جو لوگ اپنی ذاتی اور سماجی زندگی میں چھوت چھات پر عمل کرتے بھی ہوتے، وہ آزادی کی جنگ میں شریک ہو کر سب کچھ بھلا دیتے۔

کسی باہری آدمی کا بین تک پہنچنا آسان نہیں تھا۔ پٹنہ سے بس، ٹیکسی یا ٹرین کے ذریعہ بہار شریف آنا ہوتا، اس میں بھی آٹھ دس گھنٹے صرف ہو جاتے۔ بہار شریف سے بس یا ٹیکسی کے ذریعہ اس چوراہے تک جانا ہوتا جہاں سے بین کے لیے کچّا راستہ تھا۔ آنے والا اگر شیخ صاحب کا مہمان ہوتا اور اُنہیں آمد کی خبر ہوتی تو اُن کی بگھی اُس کے انتظار میں سڑک ہی پر موجود ہوتی، ورنہ پھر پیدل ہی جانا پڑتا۔ سامان لے جانے کے لیے مزدور دستیاب ہو جاتے۔ بڑے لیڈروں کو آمد و رفت میں خاصی تکلیف ہوتی، اُن کے دو دو دن تو صرف آنے جانے میں لگ جاتے اُن کے ساتھ بہت سے لوگ ہوتے۔ ظاہر ہے سب کے لیے سواری کا انتظام کرنا ممکن بھی نہیں تھا، اس لیے لوگوں کو پیدل ہی جانا پڑتا۔ شیخ صاحب باپ دادا کی ڈیوڑھی چھوڑ کر جانا نہیں چاہتے تھے لیکن جب لیڈروں میں سے دو ایک نے اُنہیں شہر ہی میں رہنے کا مشورہ دیا تو انہوں نے بھی بہار شریف ہی میں قیام کرنے کا فیصلہ کر لیا۔

۲

شہر میں آنے کے بعد اُن کی سیاسی سرگرمیاں بہت بڑھ گئیں۔ جنگ آزادی کا صوبائی مرکز پٹنہ تھا۔ آئے دن وہاں سرگرمی رہتی، دِلّی سے رہنما آتے رہتے۔ بہار شریف سے پٹنہ جانا آسان تھا۔ پٹنہ سے بھی لوگ بہار شریف آتے رہتے۔ شیخ صاحب کی وجہ سے بہار شریف اور اُس کے قرب و جوار میں آزادی کے سلسلے میں سرگرمیاں بڑھتی جا رہی تھیں اور اس جوش کو برقرار رکھتا تھا۔ شیخ صاحب کے یہاں سیاسی مہمانوں کا تانتا بندھا رہتا۔ آخری ٹرین پٹنہ سے دس بجے رات میں بہار شریف پہنچتی تھی۔ چنانچہ اُن کے ہاں رات کا دسترخوان ٹرین کی آمد کے بعد ہی بچھتا۔ اتفاق یہ کہ اکّا دکّا مہمان آ ہی جاتے۔ رات دن چولہا سلگتا رہتا اور باورچی خانہ میں ہر دم چہل پہل رہتی۔ کام کرنے والوں کی بھی کمی نہیں تھی۔ بی بی صاحبہ کے ساتھ بین سے بھی بہت سی عورتیں آئی تھیں۔ چوبیس گھنٹے میں

کسی وقت بھی کوئی آجاتا تو کھائے پیے بغیر نہ جاتا۔ اُن کے ہاں آنے والے لوگوں سے کبھی اُن کا نام و پتہ نہیں پوچھا جاتا۔ اکثر ایسا بھی ہوتا کہ بہت سے لوگ اطمینان سے وہاں ہفتوں پڑے رہتے۔ اُنہیں دو وقت شیخ صاحب کے دستر خوان میں شریک ہونے کا موقع بھی ملتا لیکن اُن سے کبھی یہ نہیں پوچھا جاتا کہ وہ کون ہیں، کیوں آئے ہیں، کہاں سے آئے ہیں اور کب جائیں گے۔ اپنی سرگرمیوں کی وجہ سے شیخ صاحب کو اپنے گھر بار کو دیکھنے کا بہت کم موقع ملتا تھا۔ اُنہیں تو بی بی صاحبہ سے ملے ہوئے بھی کئی کئی روز ہو جاتے۔

حویلی کافی بڑی تھی۔ مردانہ اور اندرون خانہ میں کافی فاصلہ تھا۔ مرد اگر اندر جانا چاہتے تو اُنہیں اپنی آمد کی خبر کرانی پڑتی۔ بی بی صاحبہ، شیخ صاحب کی ضرورتوں اور جذبات سے پوری طرح واقف تھیں۔ وہ اُن کی عزت اور وقار میں چار چاند لگانے کے لیے کوشاں رہتیں۔ شیخ صاحب کے ہاں سے جو بھی واپس جاتا وہ بی بی صاحبہ کے حسن، اخلاق اور سلیقہ مندی کی تعریف کرتا ——— وہ اپنے شوہر کی زبردست پرستار تھیں اور اُن کے خلاف کچھ بھی سننا اُنہیں گوارا نہ تھا۔ [illegible]

شیخ صاحب کو اللہ نے آٹھ بچے عطا کیے۔ شہر میں آنے کے بعد اُن کی تعلیم کا سلسلہ جاری تھا۔ ایک مولوی اور ایک حافظ ہمیشہ گھر پر موجود رہتے۔ بڑے صاحبزادے سرور حسین نے کم عمری میں قرآن شریف، اُردو و فارسی اور حساب کے سبق ختم کر دیے تو خود مولوی و حافظ صاحبان نے مشورہ دیا کہ گھر ہی پر پڑھا کر انٹرنس کا امتحان دلوایا جائے۔ شیخ صاحب نے کچھ پس و پیش کے بعد اس مشورے کو قبول کر لیا اور پٹنہ سے ایک ماسٹر صاحب انگریزی اور دوسرے علوم کی تعلیم کے لیے بُلائے گئے۔ تین برس پڑھانے کے بعد اُنہوں نے سرٹیفکٹ دے دیا کہ اب یہ امتحان میں بیٹھ سکتے ہیں۔ اس زمانے میں بہار، بنگال اور اُڑیسہ کے لیے صرف ایک ہی یونیورسٹی تھی، کلکتہ یونیورسٹی، جو انٹرنس سے امتحان لینا شروع کرتی تھی۔ سرور حسین نے امتحان دیا اور پوری یونیورسٹی میں اوّل آئے۔ خاندان میں پہلی بار کسی فرد نے انگریزی تعلیم حاصل کی تھی اور نام پیدا کیا تھا۔ شیخ صاحب کے لیے یہ ایک نیا تجربہ تھا۔ اُن کے اندر تعلیم کے تئیں ایک نیا حوصلہ پیدا ہوا۔ اُنہوں نے سرور حسین کا نام کلکتہ کے پریذیڈنسی کالج میں لکھا دیا اور دوسرے صاحبزادے اصغر حسین کو بھی انٹرنس کی تیاری میں لگا دیا۔

اِدھر ہندوستان میں خلافت تحریک ابھی چل ہی رہی تھی، اُدھر ترکی میں خلافت کا خاتمہ ہوگیا اور کمال اتاترک بیسویں صدی کے جدید مسلمانوں کے سمبل بن کر اُبھرے۔ لیکن ہندوستان کے مسلمانوں کے ایک بڑے طبقے نے کمال اتاترک کو اپنا سمبل ماننے سے صاف انکار کر دیا۔ سلسلہ خاصا اُلجھ گیا تھا۔ لاکھوں افراد خلافت تحریک میں اپنے آپ کو کھپا چکے تھے اور خلافت کو یکسر رد کر دینا اُن کے بس سے باہر تھا ـــــ اُس وقت گاندھی جی کی دُور اندیشی اور ہوشیاری کام آئی کہ اُنہوں نے کمال خوبی سے مسلمانوں کا رُخ تحریک آزادی کی طرف موڑ دیا۔ جس سے اُن کی طاقت کو ایک نیا عنوان حاصل ہوا اور ملک میں قومی یک جہتی کا ایک نیا دور شروع۔ 'مین ہاؤس' دونوں تحریکوں کا مرکز بنا۔ اب وہاں سارا زور آزادی کے حصول پر لگنے لگا۔ انگریز سرکار کی نظروں میں شیخ صاحب تو پہلے ہی سے چڑھے ہوئے تھے، اُن کے گھر میں آنے جانے والوں پر کڑی نگاہ رکھی جانے لگی جب بھی وہاں کوئی جلسہ ہوتا تو اس میں مخبروں کی ایک بڑی تعداد شریک رہتی۔ شیخ صاحب اور دوسرے لوگ اس بات سے اچھی طرح واقف تھے۔ وہ تو خود چاہتے تھے کہ اُن کی سرگرمیوں کی لمحہ لمحہ خبر انگریزوں کو ملتی رہے تاکہ اُن کی نیند حرام ہو۔

سرور حسین چھٹیوں میں کلکتہ سے آئے تو شیخ صاحب نے اُن کی شادی کر دینے کا فیصلہ کر لیا۔ اُنہوں نے قبل ہی یہ سوچ رکھا تھا کہ اپنی یتیم بھانجی سے بیٹے کا رشتہ کریں گے اگرچہ عمر میں وہ سرور حسین سے چار پانچ سال بڑی تھیں اور سرور حسین اُنہیں آپا کہتے تھے۔ خاندان بھر کے لوگ اس رشتہ کے مخالف تھے۔ خود بی بی صاحبہ دبی زبان سے اظہارِ ناپسندیدگی کر چکی تھیں لیکن شیخ صاحب کے سامنے کسی کی ایک نہ چلی۔ اُن کی دلیل یہ تھی کہ جب آنحضرتؐ نے عین نوجوانی کی حالت میں ایک بڑی عمر کی بیوہ سے شادی کی تو پھر یہ تو اُن کی سنت ہے جس کی پیروی ہر مسلمان کے لیے سعادت۔ اس کے آگے سب چپ ہو جاتے تھے۔ سرور حسین نے جب والد کا یہ فیصلہ سُنا تو چپ چاپ سر جھکا دیا۔ اُنھیں بس یہ لگ رہا تھا کہ جس لڑکی کو وہ ہمیشہ آپا کہتے آئے تھے، اُسے بیوی کیسے سمجھیں گے۔ اس زمانے میں یہ رواج عام نہیں ہوا تھا کہ رشتہ داروں اور دوستوں سے ماں باپ کو اپنی پسند، ناپسند کے بارے میں کہلوایا جائے اور لحاف میں مُنہ چھپا کر رو دیا جائے۔ شادی ہوگئی اور دلہن اپنے کمرے سے اُس کمرے میں آگئی جسے خاص طور پر اُس کے قیام کے لیے بنوایا گیا تھا۔ اُدھر شیخ صاحب کے بھانجے اختر حسین کلکتہ سے بی اے کا امتحان دے کر آئے تو اُن سے شیخ صاحب نے اپنی بڑی صاحبزادی عصمت بی بی کا، جن کی عمر محض بارہ سال تھی، عقد کر دیا۔ سرور حسین کچھ روز تک شرمائے شرمائے پھرنے کے بعد مہندی لگے ہاتھ پیروں کے ساتھ

کلکتہ چلے گئے۔ اِدھر اصغر حسین انٹرنس کا امتحان دے کر آئے تو اُنھیں تبدیلیِ آب و ہوا کے لیے شیخ صاحب کے سگے ماموں نے اِسلام پور بُلا بھیجا جہاں اُن کی بہت بڑی زمین داری اور کاشتکاری تھی۔ اُنہوں نے اپنے اکلوتے صاحبزادے کو بیرسٹری کی تعلیم کے لیے انگلینڈ بھیجا تھا اور خود چھُری کانٹوں کے عادی ہو کر ان کا انتظار کرتے رہے تھے۔ صاحبزادے واپس آئے تو اُن کی ایک بڑے گھرانے میں دھوم دھام سے شادی ہوئی اور اُن کے قیام کے لیے اسلام پور جیسے دُور افتادہ گاؤں میں امریکہ کے صدر کے سرکاری مکان وھائٹ ہاؤس کے طرز پر ایک عظیم الشان حویلی کی تعمیر کی گئی۔ اُس وقت اُن لوگوں کے اعتراض کا کوئی جواب نہیں دیا گیا جنھوں نے یہ بنیادی سوال اُٹھایا تھا کہ صاحبزادے بیرسٹری تو کسی بڑے شہر میں کریں گے، پھر گاؤں میں اتنی بڑی حویلی کیوں ——— پھر ہوا یوں کہ شادی کے چند ماہ بعد ہی صاحبزادے اللہ کو پیارے ہو گئے اور اتنی بڑی لق و دق حویلی میں بوڑھے ماں باپ نوجوان حاملہ بہو کے ساتھ رہ گئے۔ بہو نے چند مہینوں میں ایک بچّی کو جنم دیا اور خود شوہر سے جا ملیں۔ حویلی میں ایک دودھ پیتی بچّی رہتی، اس کی دیکھ بھال کرنے والے دو بوڑھے جسم، چار لرزتے کانپتے ہاتھ اور جیبوں پر کام کرنے والے اجنبیوں کی ایک پوری فوج ——— اب دودھ پیتی بچی بارہ سال کی ایک لڑکی بن چکی تھی۔ اصغر حسین جب چھٹیاں گزارنے اسلام پور آئے تو وہ اس بچّی کے رشتہ کے لیے پسند کر لیے گئے۔ گھر کا لڑکا تھا، دولت بھی گھر ہی میں جانی تھی۔ کچھ پوچھ تاچھ کرنے یا کسی سے کچھ دریافت کرنے کی ضرورت نہیں تھی۔ اگرچہ بھانجے شیخ الطاف حسین کی انگریز دشمنی سے سخت نفرت تھی اور اسی وجہ سے آنا جانا بھی ترک کر رکھا تھا لیکن خون، پھر خون ہی ہوتا ہے۔ جس روز اصغر حسین کو جانا تھا، اس سے ایک روز قبل گاؤں کے چند معززین کے سامنے پوتی کا نکاح پڑھا دیا اور کئی خوانچے پھل، مٹھائی اور ناشتے، دو آدمیوں کے ساتھ بہار شریف روانہ کر دیے۔

نکاح کی مٹھائیاں جب بہار شریف پہنچیں تو وہاں دبا دبا سا ایک ہنگامہ برپا ہو گیا۔ سرور حسین کی شادی کی تھکن ابھی لوگوں کے ذہنوں پر طاری تھی کہ اس پر ایک مزید ضرب پڑ گئی۔ شیخ صاحب، مدن موہن مالویہ اور پنڈت موتی لال نہرو سے ملنے پٹنہ گئے ہوئے تھے جو کلکتہ سے بذریعہ ٹرین دہلی جا رہے تھے اور چند منٹوں کے لیے پٹنہ جنکشن پر رُکنے والے تھے۔ شیخ صاحب کے سیاسی نظریات کی وجہ سے ماموں سے اُن کے تعلقات کشیدہ تھے۔ ماموں کو جب انگریز حکومت نے خان بہادر کا خطاب دیا تو اپنے پرائے سبھی مبارک باد دینے گئے، نہیں گئے تو سگے بھانجے۔ دراصل یال گنگادھر تلک اس دن بہار شریف

آرہے تھے انگریز گورنر کے اُس حکم کو توڑ کر، جس کی رو سے اُنہیں صوبہ بہار میں داخل نہیں ہونا تھا۔ ظاہر ہے کہ انگریز پولیس اُنہیں گرفتار کرنے کا تہیہ کیے ہوئے تھی اور یہ گرفتاری جس جلسے میں ہونے والی تھی، اس کی صدارت شیخ صاحب کو کرنی تھی۔ خان بہادر ماموں تک جب یہ بات پہنچی تو اُنہوں نے بس اتنا ہی کہا کہ انگریز سرکار بہادر کے دم سے ڈاک کا اتنا اچھا نظام تو ملک میں قائم ہے۔ اصغر حسین کے غیر متوقع عقد سے بی بی صاجبہ کو غصّہ سے زیادہ دکھ تھا۔ وہ اپنے بچّوں کی ماں تھیں لیکن اُن کے معاملوں میں دخیل نہیں تھیں۔ بڑے بیٹے کی شادی میں بھی اُن کی مرضی کو دخل نہیں تھا۔ اصغر حسین کو اُنہوں نے ہی ماموں کے یہاں بھیجا تھا کہ کچھ دن دودھ دہی کھالے، پھر تو کلکتہ میں ہوسٹل اور ہوٹل کا کھانا نصیب میں ہے ہی۔ اُنہیں کیا پتہ تھا کہ بیٹا جب وہاں سے واپس آئے گا تو غیر ہو چکا ہو گا۔ اُنہیں شیخ صاحب سے ڈر بھی تھا کہ وہ سُنیں گے تب کیا ہو گا۔ ماموں سے اُن کے تعلقات یوں ہی خراب ہیں، آنا جانا بھی بند ہے۔ کمال ہے ماموں کا بھی کہ انہوں نے بیٹے کے باپ سے بھی کچھ پوچھنے کی بھی ضرورت محسوس نہیں کی اور یوں عقد پڑھا دیا۔ شیخ صاحب واپس آئے تو گھر بھر نے اُن سے خاص رازداری برتی۔ یہ ذمّہ داری بی بی صاجبہ کی تھی کہ وہ اُنہیں بیٹے کے عقد کی خبر دیں۔ چنانچہ کھانے کے وقت کہ اس وقت شیخ صاحب کو خبریں سُنانے کا دستور تھا، انہوں نے اصغر حسین کے عقد کی خبر دے دی۔ شیخ صاحب سر جھکائے کھاتے رہے، ادھر بی بی صاجبہ انتظار میں تھیں کہ شاید اس خاموشی کے پیچھے کوئی بڑا طوفان آنے والا ہے۔ لیکن ہاتھ منہ دھو کر جب شیخ صاحب اپنی مخصوص آرام کرسی پر لیٹے اور حقّے کی نَے ہاتھ میں لی تو بس اتنا ہی کہا۔

"ماموں کا حق تھا ـــــــ ہم اس سلسلے میں کیا عرض کر سکتے ہیں۔"

اس کے بعد ہی نکاح کی مٹھائیاں اور پھل تقسیم کیے گئے، اور رشتہ داروں میں یہ خبر عام ہوئی۔

۳

نہ بیماری ہوئی نہ اس میں بداحتیاطی، شیخ الطاف حسین پینتالیس سال کی عمر میں اچانک اللہ کو پیارے ہو گئے۔ گھر میں ایک کہرام سا مچ گیا۔ کسی کی سمجھ میں نہ آرہا تھا کہ یہ آخر یہ بیٹھے بٹھائے کیا ہو گیا۔ گھر میں کوئی بڑا تھا نہیں۔ لڑکے سب ابھی زیرِ تعلیم تھے، بی بی صاجبہ خاصی کم عمر تھیں۔ صرف بھانجے

اور داماد اختر حسین ہی گھر میں بڑے رہ گئے تھے جو کلکتہ سے وکالت پاس کر کے گھر آ گئے تھے۔ انہوں نے ممانی و ساس کی ڈھارس بندھائی اور ماموں کی جگہ پر اُٹھنے بیٹھنے لگے۔ اُنہیں بچپن ہی سے خلافت اور آزادی کی تحریکوں سے لگاؤ ہو گیا تھا۔ جب بھی کوئی لیڈر اُن کے ہاں آتا تو وہ اس کے زیادہ سے زیادہ نزدیک رہنے کی کوشش کرتے اور اس سے سیاسی معاملات پر باتیں کرتے، اس کے کھانے پینے اور آرام کا خیال رکھتے، اُس کی سواری کے انتظام میں دوڑ دھوپ کرتے۔ انہیں کھدّر کے کپڑوں سے بھی اُنسیت تھی۔ دوسری طرف شیخ صاحب کے لڑکے فرماں بردار بیٹوں کی طرح وہی کرتے جو اُن کے والد کا حکم ہوتا۔ وہ بلا ضرورت کسی کے پاس نہیں پھٹکتے تھے۔ اکثر ایسا ہوا کہ شیخ صاحب نے کسی کو پہنچانے اُن میں سے کسی ایک کو پٹنہ بھیجا اور راستہ بھر دونوں کی کوئی بات چیت نہیں ہوئی۔ والد صاحب کے انتقال کے وقت دونوں بھائی کلکتہ میں تھے۔ باقی دونوں بھائی بہت چھوٹے تھے اور گھر ہی پر مولوی صاحب سے قرآن شریف اور اُردو فارسی پڑھ رہے تھے۔ بہنیں چھوٹی تھیں، دور نزدیک کا کوئی ایسا رشتہ دار تھا نہیں جو اُن کی خبر گیری کرتا۔ بھانجے کی جوان مرگی کا سُن کر ماموں تعزیت میں آئے۔ اُن کی موجودگی میں جو بائی کانگریس کے بڑے بڑے لیڈر بھی تعزیت کو آ گئے تو وہ ایسے مکدّر ہوئے کہ فوراً واپسی کی ٹھان لی۔ سرور حسین اور اصغر حسین جب باپ کی موت کا سُن کر کلکتہ سے آئے تو اُنہیں پھوپھی زاد بھائی اور بہنوئی میں باپ کی شباہت نظر آئی۔ اُن کا غم آدھا رہ گیا۔ زمینداری کا نظام ایسا مربوط اور گٹھا ہوا تھا کہ ہاتھ تبدیل ہو جانے سے اُس میں زیادہ فرق نہیں آتا تھا۔ چنانچہ گھر جیسا چل رہا تھا، چلتا رہا۔ البتہ اُس کی رونق میں کمی ضرور آ گئی۔

شیخ صاحب نے اپنی زندگی ہی میں اختر حسین کو حویلی ہی کے احاطے میں زمین دے دی تھی جس میں اُنہوں نے ایک بنگلہ تعمیر کرا لیا تھا۔ وکالت شروع کرنے کے بعد جب اُن کے مؤکل آتے تو وہ اُن سے اپنے بنگلے ہی میں ملاقات کرتے، یوں اُن کا زیادہ وقت شیخ صاحب ہی کی بیٹھک میں گزرتا۔ شادی ہو چکی تھی، دو بچّے بھی ہو چکے تھے وہ سبھی شیخ صاحب ہی کی حویلی میں رہتے۔ ایک ہی گھر تھا، ایک خاندان تھی۔ اختر حسین اپنی وکالت سے جو کچھ کماتے، وہ ممانی کے ہاتھوں میں لا کر رکھ دیتے۔ اُن کی اپنی کوئی مخصوص ضرورت نہیں تھی۔ سرور حسین اور اصغر حسین پہلے کی طرح کلکتہ میں پڑھتے رہے۔ سرور حسین بی اے میں فرسٹ آئے، اسکالرشپ پائی تو اُن کی خواہش کے مطابق اُنھیں آئی سی ایس تیاری کے لیے ولایت بھیجا گیا جہاں وہ ایک مہربان انگریز عورت کے ہاں پیئنگ گیسٹ کے طور پر مقیم رہے۔

اِدھر اصغر حسین کی بی اے میں پڑھتے ہوئے شادی ہوگئی۔ امتحان شادی کے بعد دیا۔ پاس تو ہو گئے لیکن کوئی اچھی پوزیشن نہ لا سکے۔ یوں بھی اُنہیں کون سی نوکری کرنی تھی۔ سسرالی جائداد بہت پھیلی ہوئی تھی، اب اُنہیں ہی سب کچھ سنبھالنا تھا۔

ملک میں مسلم لیگ کا قیام تو بہت پہلے ہو چکا تھا لیکن اُس میں زندگی اس وقت آئی جب نہرو رپورٹ شائع ہوئی اور مسلمانوں کے اندر کانگریس کے تئیں بددلی پھیلی۔ چالاک اور موقع شناس لیڈروں نے اس موقع سے پورا فائدہ اُٹھایا اور بددلی کے پس منظر میں اُنہوں نے مسلمانوں کو یہ بات ذہن نشین کرا دی کہ اُنہوں نے اِس ملک پر سات سو برس تک حکومت کی ہے اور کانگریس آزادی حاصل کر کے اُنہیں ہندوؤں کا غلام بنانا چاہتی ہے۔ اِس لیے اِس بات کی ضرورت ہے کہ اُن کی علیٰحدہ پارٹی ہو، ایک نعرہ ہو، اور ایک بالکل الگ مقصد ہو ______ جو بیج بونا تھا اس کے لیے اُس کی زمین تیار کی جا رہی تھی۔ دیکھتے ہی دیکھتے مسلم لیگ ایک طاقت ور تنظیم بن کر سامنے آ گئی۔ چھوٹے سے چھوٹے شہر اور قصبے میں نہ صرف اُس کی شاخیں قائم ہو گئیں بلکہ آئے دن جلسے جلوس بھی ہونے لگے۔ اُن کے اپنے اخبارات نکلنے لگے جو پانچ کی جگہ بیس کی خبر دیتے۔ وہ لوگ جو یقین کے "پکے" نہیں تھے اور جن کا مزاج یہ تھا کہ جدھر کا پلڑا بھاری ہو، اُدھر ہی کو جھک جاؤ، بہت آسانی سے مسلم لیگ کے لیڈر بن بیٹھے۔ خود کانگریس کے اندر بعض افراد ایسے تھے جو ہوا کے رُخ کو پہچاننے کی کوشش کر رہے تھے۔ ہوا کے رُخ کو دیکھ کر وہ چپکے سے مسلم لیگ میں شامل ہو گئے۔ رہ گئے وہ لوگ جو اپنے یقین اور نظریے کے سہارے کانگریس سے چمٹے ہوئے تھے اُن کی حالت قابلِ رحم ہوتی چلی گئی۔ ملک کی سیاست میں انگریزوں کے رہتے ہوئے مذہب اور ذات پات در آیا تھا۔ کانگریس سب سے نمایاں جماعت تھی لیکن اس میں در پردہ ہندو تھے، مسلمان تھے، سِکھ اور کرسچین تھے۔ وہ بھی علاقے مذہب کی بنیاد پر پہچانے جاتے۔ ہندو علاقہ میں مسلمانوں کو کوئی نہیں پوچھتا تھا اور مسلمان علاقہ میں ہندو کی آواز کوئی معنی نہیں رکھتی تھی ______ نئی صورت حال میں ہندو لیڈروں کے تو اپنے علاقے تھے۔ اُن میں اُن کی ساکھ نہ صرف قائم تھی بلکہ بیداری آنے کے ساتھ ساتھ اس میں روز افزوں اضافہ ہی ہو رہا تھا۔ دوسری طرف مسلم لیگ نے جب اپنے آپ کو مسلمانوں کی واحد نمائندہ کہنا شروع کر دیا تو زیادہ تر مسلمانوں نے اپنے عمل سے اس کے اِس دعوے کو تسلیم بھی کر لیا۔ کانگریس کے مسلمان لیڈروں کی ساکھ اُن کے علاقے میں بہت تیزی سے ختم ہو رہی تھی۔ دس سال کے اندر اندر ملک دو سیاسی جماعتوں کا اسٹیج بن گیا۔ اسٹیج کی ملکیت البتہ انگریز کی تھی جس نے

اپنی مرضی کے حدود کے اندر ہی اُن کو اسٹیج کے استعمال کی اجازت دے رکھی تھی۔ چنانچہ مسلم لیگ نے جب تقسیم ملک کا مطالبہ کیا تو چند برسوں کے بعد کانگریس کو بھی اُسے تسلیم کرنے میں تامل نہیں رہا۔

بہار شریف نے خلافت اور آزادی کی تحریکوں کے طفیل میں مولانا شوکت علی، مولانا محمد علی، بال گنگا دھر تلک، مدن موہن مالویہ، شری بابو، انوگرہ بابو، پروفیسر عبدالباری وغیرہ کو نہ صرف دیکھا اور سُنا تھا بلکہ اُن سے دلی قربت بھی محسوس کی تھی۔ 'بین ہاؤس' تو سیاسی سرگرمیوں کا مرکز ہی تھا۔ بہار شریف کے بہت سے معززین جب سڑکوں پر آتے تو فوراً پہچان لیے جاتے۔ سید مہدی حسن، محمد محسن، محمد فخرالدین، بنسی لال، اجودھیا پرشاد وغیرہ وہ لوگ تھے جو ہمیشہ ڈائس پر نظر آتے۔ شہر میں کانگریس کا جو بھی ہیولیٰ لوگوں کے ذہن میں تھا، اُس کے ساتھ شیخ صاحب کے علاوہ یہ لوگ بھی کہیں نہ کہیں ضرور موجود ہوتے۔

لیکن ہوا یوں کہ جب مسلم لیگ کو مسلمانوں کی واحد نمائندہ جماعت کہلوانے کی ضرورت محسوس ہوئی تو سید مہدی حسن، محمد محسن وغیرہ نے کانگریس کو خدا حافظ کہہ دیا اور مسلم لیگی قائدین کہے جانے لگے۔ مسلم لیگ میں ان لوگوں کی شمولیت کے بعد شہر میں لیگ کا ایک بہت بڑا جلسہ بھی ہوا، جس میں بھاری تعداد میں لوگ شریک ہوئے۔ اصغر حسین کا قیام زیادہ تر اسلام پور میں رہتا تھا لیکن بہار شریف آنا جانا لگا رہتا۔ بہار شریف کا انگریز ایس ڈی او گرونِنگ جب ٹرانسفر پر جانے لگا تو اُس نے اصغر حسین کو اپنی پُرانی گاڑی بخش دی تھی۔ مہینہ میں تین چار دفعہ یہ گاڑی اسلام پور اور بہار شریف کے درمیان دوڑ لگاتی رہتی تھی۔ اس سے پہلے اصغر حسین کی دعوت پر ایس ڈی او شکار کھیلنے کے لیے اسلام پور جاتا تب یہ گاڑی سڑکوں پر نظر آتی۔ اس وقت اس کے ساتھ کچھ اور گاڑیاں بھی ہوتیں۔ اس وقت سب ڈویژنل آفیسر آئی سی ایس ہوا کرتا تھا۔ اصغر حسین یوں تو ایک بڑے قوم پرست لیڈر کے بیٹے تھے لیکن جب انہوں نے نہرو رپورٹ کا بہ نفسِ نفیس مطالعہ کیا اور ایک چھوٹے سے جلسہ میں ایک ایسے کانگریسی لیڈر کی تقریر سُنی جو چند روز کے بعد ہندو مہاسبھا میں شامل ہو گیا تھا تو وہ کانگریس سے متنفر ہو گئے۔ اُن کی بیوی کے دادا کے ہاں انگریز کلکٹر اور کمشنر آتے رہتے تھے۔ ایک بار گورنر کو بھی اُنہوں نے اسلام پور جیسے دور افتادہ گاؤں میں کھانے پر مدعو کیا تھا تو میلوں میل راستے پر سُرخ قالین بچھائے گئے تھے — اس وقت گورنر کا مطلب گورنر ہوتا تھا — حاکم! اصغر حسین نے یہ سب کچھ اپنی آنکھوں سے دیکھا تھا۔ وہ کلکتہ کے پریزیڈنسی کالج میں پڑھتے ہوئے تھے اور اُن کے چند ساتھیوں نے آئی سی ایس میں کامیابی حاصل کی تھی۔ انھیں شان و شوکت بہت اچھی لگتی تھی۔ اتفاق سے خدا نے انھیں اُن کی پسند کی زندگی بخش دی تھی۔

انہوں نے اسلام پور میں جب یہ سُنا کہ بہار شریف میں مسلم لیگ کا بڑا جلسہ ہونے والا ہے تو وہ دوسرے ہی دن اپنی پرانی انگریزی گاڑی پر بہار شریف روانہ ہوگئے۔ جو مسلم لیگی وہاں آرہے تھے اُن میں اُن کے پریزیڈنسی کالج کے زمانہ کے ایک ساتھی بھی تھے جو پٹنہ کے ایک بہت ہی مشہور بار ایٹ لا کے صاحبزادے تھے۔ اُن کی وجہ سے اُنہوں نے شہر میں آنے والے سبھی لیڈروں کو دوپہر کے کھانے پر بین ہاؤس میں مدعو کیا۔ اختر حسین کسی ضروری کام سے شہر سے باہر گئے ہوئے تھے۔ کھانے پر چونکہ بہت سے لوگ آرہے تھے اس لیے اُس کی تیاری ایک روز قبل ہی سے شروع ہوگئی۔ درجنوں مُرغ خریدے گئے، دیہات سے پلے ہوئے مجرب بکرے منگوائے گئے۔ پٹنہ کے ایک بڑے ہوٹل میں کام کرنے والے باوردی بیروں کو بُلایا گیا۔ میدان میں شامیانہ لگا کر سینکڑوں کرسی ٹیبل لگائے گئے۔ ہر پلیٹ کے ساتھ ایک گلاس اور ہر گلاس میں ایک نیپکن۔ اس دعوت کے اہتمام میں اصغر حسین نے ٹھیک وہی منظر پیدا کرنے کی کوشش کی جو اُن کے دادا نے انگریز گورنر کے اعزاز میں اسلام پور میں پیدا کیا تھا۔ جہاں تک کہ سلیقہ اور انتظام کا سوال تھا تو اس معاملے میں اصغر حسین کے اندر ماں اور باپ دونوں کی خصوصیات یکجا ہوگئی تھیں اور اخلاق میں تو اس خاندان نے دور دور تک نام پیدا کیا تھا۔

مسلم لیگی قائدین ایک بہت بڑے جلوس کی شکل میں کھانے کے لیے آئے۔ سیکڑوں افراد اُن کے آگے پیچھے نعرے لگا رہے تھے 'مسلم لیگ زندہ باد'، 'پاکستان پائندہ باد'، 'کانگریس مُردہ باد'، 'گاندھی جی مُردہ باد' ——— مہدی حسن کی کھُلی ہوئی فورڈ پھولوں سے لدی ہوئی تھی' اس میں چھ سات لیڈر بیٹھے ہوئے تھے' اُن کے پیچھے درجنوں کھُلی ہوئی بگھیوں میں دوسرے افراد سوار تھے۔ بین ہاؤس کے میدان میں داخل ہو کر اُنہوں نے دیر تک خوب نعرے لگائے۔ کافی لوگ جمع ہوگئے تھے۔ موقع' دستور اور مصلحت کے پیشِ نظر تقاریر کا ایک سلسلہ شروع ہوا۔ ٹھیک اُسی وقت اختر حسین ایک بگھی پر سوار میدان میں داخل ہوئے اور یہ سارا منظر دیکھ کے ہکّا بکّا رہ گئے۔ اُن کی سمجھ میں کچھ نہ آیا۔ بگھی پر بیٹھے بیٹھے اُنہوں نے صورت حال کو سمجھنے کی کوشش کی۔ جب وہ کچھ سمجھ پائے تو بگھی کو رخصت کر کے سیدھے اپنے کمرے میں گئے۔ کھدر کے کرتے، پاجامہ اور ٹوپی میں وہ اس ماحول میں بڑے اجنبی اجنبی سے لگ رہے تھے۔ اُن کا کمرہ مقفل نہیں رہتا تھا اس لیے اُن کے کمرے کا سامان بھی باہر صحن میں لگا دیا گیا تھا۔ اُن کے کمرے میں دو چوکیاں لگی رہتی تھیں جن پر فرش بچھا رہتا اور گاؤ تکیے پڑے رہتے۔ رات کو وہ اسی فرش پر سوتے۔ اِس وقت کمرے میں کچھ بھی نہیں تھا۔ کونے میں ایک چٹائی لپٹی ہوئی رکھی تھی۔ اُنہوں نے

چٹائی بچھائی اور کپڑے تبدیل کیے۔ اتنے میں اصغر حسین کمرے میں داخل ہوئے۔

"آداب عرض بھائی جان ــــــ آپ کس وقت آئے، ہمیں بالکل پتہ نہ چلا۔"

"بس ابھی آرہا ہوں۔"

"آپ کا پروگرام آج شاید آنے کا نہیں تھا، اس لیے آپ کے کمرے کی چوکیاں بھی میں نے باہر لگوا لیں ــــــ"

"اچھا کیا ــــــ مہمانوں کی خاطر تواضع میں کچھ کمی نہیں رہنی چاہیے۔"

"آپ کی دعا سے بہت اچھا انتظام ہو گیا ہے۔ آپ تو جانتے ہیں ناصر مطیع اللہ کے صاحبزادے میرے ساتھ پریزیڈنسی کالج میں پڑھتے تھے۔ وہ ایک جلسہ کے سلسلے میں آئے ہوئے تھے۔ میں نے انھیں کھانے پر مدعو کیا تو کچھ اور لوگوں کو بھی بلانا پڑا۔"

اختر حسین خاموش رہے۔ اصغر حسین نے لجاجت سے کہا۔

"بھائی جان ــــــ آپ باہر چلیے نا۔ گھر میں آپ ہی سب سے بڑے ہیں۔ آپ کا کھانے پر موجود رہنا بہت ضروری ہے۔"

"اصغر میاں، آپ کیا کہہ رہے ہیں۔ آپ جانتے ہیں وہ کون لوگ ہیں۔؟"

"ان کے سیاسی نظریات سے ہمیں کیا لینا دینا۔ وہ میرے دوست ہیں اور میں نے انھیں بلایا ہے۔"

"اگر آپ کے والد بزرگوار موجود ہوتے تو کیا وہ اس دعوت میں شریک ہوتے۔؟"

"بالکل ہوتے ــــــ یہ میرے دوست کی دعوت ہے۔"

"لیکن ان کے ساتھ اتنے لوگ جو آئے ہیں اور نعرے لگا رہے ہیں، ان کا مطلب۔؟"

"ظاہر ہے کہ میرے دوست لیڈر ہیں۔ وہ جہاں جائیں گے، وہاں ان کے ماننے والے بھی جائیں گے اور پھر ان کے نعرے لگانے پر پابندی کون لگا سکتا ہے۔ میں نے تو سبھوں کو بلایا بھی نہیں ہے۔"

"بہرکیف آپ ان کی خاطر کیجیے۔ میں شرکت نہیں کرسکوں گا۔"

"بھائی جان، آپ کی شرکت ذاتی ہوگی۔ آپ ابا مرحوم کی جگہ پر سرپرست کی حیثیت سے وہاں پر رہیں گے۔"

"بھئی میرا دل گوارا نہیں کرتا کہ جن لوگوں کے ساتھ سڑکوں، گلیوں اور میدانوں میں جنگ ہو رہی ہے، ان کے ساتھ بیٹھ کر کھانا کھاؤں۔"

اصغر حسین نے بہت کوشش کی۔ اختر حسین کی بہت خوشامدیں کیں، لیکن وہ ٹس سے مس نہ ہوئے۔ آخر انہوں نے خود ہی مہمانوں کو کھلا پلا کے رخصت کر دیا۔ اختر حسین کے لیے جب اندر سے سینی میں کھانا آیا تو انہوں نے طبیعت کی خرابی کا بہانہ کر دیا۔ سینی کا کھانا وہی تھا جو دعوت کے لیے بنا تھا۔ اختر حسین کا اس طرح کھانا نہ کھانا ایک غیر معمولی بات تھی۔ بی بی صاحبہ نے باہر پردہ کا حکم دیا اور خود آ گئیں۔ اختر حسین اس وقت عصر کی نماز پڑھ رہے تھے۔ انہوں نے سلام پھیر کر انہیں سلام کیا۔

"بیٹے تم نے کھانا نہیں کھایا ——؟"

"طبیعت میں گرانی سی ہے۔ سوچا کہ سو جاؤں تو زیادہ بہتر ہے۔"

"سفر کی تکان ہو گی۔ تم نے کہا ہوتا تو کچھ ہلکی پھلکی سی غذا تیار ہو جاتی۔"

"کوئی بات نہیں، رات میں کچھ جلدی کھا لوں گا۔"

"میں ابھی پھلکے بھجوا دیتی ہوں۔ انڈوں کے ساتھ کھا لینا —— رات کے کھانے میں تو ابھی دیر ہے۔"

اختر حسین کچھ نہیں بولے۔ بی بی صاحبہ اندر چلی گئیں۔

شامیانہ کے اندر پھیلا گھر کا سامان جب اندر آنے لگا تو اختر حسین نے مزدوروں کو ہدایت کر دی کہ اُن کی چوکیاں وہ اُن کے کمرے میں نہ لائیں، اُن کے بنگلے پر پہنچا دیں۔ اُن کے اس فیصلہ سے گھر میں ایک ہلچل سی مچی۔ کچھ بولنے کی کسی میں ہمت نہیں تھی۔ اُن کی بیوی اُن کے معاملے میں کبھی دخل نہیں دیتی تھیں۔ وہ راضی بہ رضا قسم کی عورت تھیں۔ وہ گھر میں سب لوگوں کو دبی دبی زبان سے شوہر کے بارے میں بولتے دیکھتی رہیں اور انتظار کرتی رہیں کہ کب شوہر کا حکم ہو، اور وہ اپنے بنگلے چلی جائیں۔ بی بی صاحبہ کو گھر کی سرگرمیاں پسند نہیں آ رہی تھیں۔ وہ سیاست سے واقف نہیں تھیں اور صرف یہ جانتی تھیں کہ گھر میں سب خوش رہیں، مل جل کے رہیں۔ انہوں نے داماد کو ہمیشہ بیٹا سمجھا تھا لیکن وہ اُن سے کچھ پوچھ تاچھ نہیں کر سکتی تھیں۔ اختر حسین نے اب سونا پڑنا اپنے گھر میں شروع کر دیا، اس کے علاوہ اُن کے رویّے میں اور کوئی فرق نہیں آیا۔ پہلے ہی کی طرح وہ کھانے ناشتے پر حویلی آ جاتے، کبھی زیادہ مصروف رہتے تو منگوا لیتے۔ جو کچھ کماتے، وہ بی بی صاحبہ کے ہاتھوں میں لا کر رکھ دیتے۔ اصغر حسین دو چار روز رہ کر اسلام پور واپس چلے گئے تھے۔ چند مہینوں کے بعد خبر آئی کہ پٹنہ کے لان میں انہوں نے مسلم لیگ کے ایک جلسہ میں باقاعدہ اُس میں شمولیت اختیار کر لی۔ بی بی صاحبہ نے یہ خبر ویسے ہی سنی جیسے انہوں نے کانگریس میں شمولیت اختیار کر لی ہو۔ کانگریس کے بارے میں اُن کی واقفیت یہ تھی کہ یہ ہندو مسلمان

دونوں کی بھلائی چاہتی ہے۔ اِدھر مسلم لیگ کے بارے میں اُن کو پتہ چلا تھا کہ وہ صرف مسلمانوں کی بھلائی چاہتی ہے۔ وہ ایک دیندار خاتون تھیں۔ پانچوں وقت کی نماز اور نوافل پڑھتیں، پورے روزے رکھتیں، گھر میں، رمضان میں عورتوں میں اس کا مقابلہ چلتا کہ کون سب سے زیادہ قرآن شریف کے پارے ختم کرتا ہے۔ دو ختم تو بہت عام تھے۔ اُن کے شوہر کے ملنے والوں اور مہمانوں میں ہندوؤں کی تعداد اچھی خاصی تھی۔ اُن میں کچھ لوگ چھوت چھات کو بھی مانتے تھے، اُن کے لیے کھانے پینے اور رہنے سہنے کے علیحدہ انتظام کرنے پڑتے۔ لیکن بی بی صاحبہ کے دل میں اُن کے لیے کوئی علیحدہ جذبہ بیدار نہیں ہوتا تھا۔ کانگریس اور مسلم لیگ میں وہ زیادہ فرق نہیں جانتی تھیں۔ دونوں اُنھیں ایک ہی سکّے کے دو رُخ نظر آتے۔

اصغر حسین کا بہار شریف آنا جانا لگا رہتا۔ اسلام پور سے پٹنہ کا راستہ بہار شریف ہو کر جاتا تھا وہ جب بھی کسی ضرورت سے پٹنہ جاتے تو بہار شریف میں ضرور ٹھہرتے۔ پٹنہ سے واپسی پر بھی وہ ماں سے ملنا نہ بھولتے۔ وہ مسلم لیگ کے ضلع شاخ کی مجلس عاملہ کے ممبر ہو گئے تھے اِس لیے جب بھی آتے جاتے بہار شریف میں ٹھہرتے تو بہار شریف کے بہت سے مسلم لیگی کارکن اُن سے ملنے کو آجاتے۔ خوب نعرہ بازی ہوتی، پھولوں کے ہار پہنائے جاتے۔ کانگریس کے جو کارکن اختر حسین کے پاس آتے، وہ نعرہ بازی کبھی نہیں کرتے تھے۔ یوں بھی اب بین ہاؤس میں کانگریس کے جلسے جلوس کا رواج باقی نہیں رہا تھا۔ کانگریس کا دفتر ایک الگ عمارت میں تھا جس میں آئے دن میٹنگیں ہوتی رہتیں۔ پولیس کے چھاپے بھی پڑتے رہتے۔ اختر حسین اکثر جیل جاتے رہتے تھے۔ اُن کا ایک سوٹ کیس جیل میں کام آنے والے ضروری سامان سے ہر دم بھرا رہتا۔ پولیس جب اُنہیں گرفتار کرنے آتی تو وہ ایک منٹ بھی دیر نہ کرتے۔ اگر وہاں پر گھر کا کوئی فرد موجود نہ ہوتا تو گھر والوں کو بھی اُن کی گرفتاری کی خبر دیر سے ملتی ورنہ وہ یہی سمجھ لیتے کہ کسی ضروری کام سے گئے ہیں اور دو چار روز میں آجائیں گے اور اکثر ہوتا بھی یہی۔

اختر حسین نے اپنے مکان کے آگے ایک گول چبوترہ بنوایا تھا جس پر گرمی کی شاموں میں چھڑکاؤ کیا جاتا اور کرسیاں بچھائی جاتیں۔ درمیان میں ایک گول میز رہتی جس پر تازہ اخبارات رکھے جاتے۔ اختر حسین ایک آرام کرسی پر براجمان ہوتے۔ اجودھیا پرشاد، بال گووند ورما، رتلال پرشاد شرما، حکیم محمد عاصم، مولانا محمد کاظم اور علی احمد رضوی وغیرہ وغیرہ تقریباً روزانہ ہی شام کے وقت وہاں آتے اور رات گئے تک کانگریس، مسلم لیگ، گاندھی جی، سبھاش چندر بوس، شری بابو اور انوگرہ بابو کی سیاسی چشمک کے بارے میں دھواں دھار

باتیں ہوتیں۔ اصغر حسین جب گھر آتے تو انہیں یہ باتیں بُری لگتیں۔ وہ اپنی ماں سے کہتے کہ بھائی جان کیوں کھلم کھلا انگریز سرکار بہادر کی دشمنی مول لیتے ہیں۔ بی بی صاحبہ کی سمجھ میں یہ بات نہیں آتی کہ اس میں سرکار بہادر کی دشمنی کا کیا سوال ہے۔ یہ لوگ تو ملک کی، سب لوگوں کی بھلائی کی باتیں کرتے ہیں اور شیخ صاحب کے وقت سے کرتے آ رہے ہیں، اب سرکار بہادر اس کو اپنی دشمنی سمجھے تو اِس میں اس کی سمجھ کا پھیر ہے، کوئی کیا کر سکتا ہے۔ اصغر حسین سمجھ جاتے کہ ماں، بھائی جان سے کچھ کہنا نہیں چاہتیں۔ سرور حسین جو آئی سی ایس کرنے ولایت گئے تو پھر وہاں سے لگاتار دو بار فیل کرنے کے بعد ہی لوٹے۔ اُس زمانے میں آئی سی ایس میں بیٹھنے کے لیے قانون کی پڑھائی بہت ضروری تھی، سو وہ اُن کے بہت کام آئی۔ بہار شریف تو بہت ہی چھوٹی جگہ تھی، انہوں نے پٹنہ میں وکالت شروع کی۔ ایک مکان وہاں کرایہ پر لیا۔ لیکن اُن کی بیوی پٹنہ جانے کو ہرگز تیار نہیں ہوئیں۔ وہ اختر حسین کی ہمشیرہ تھیں اور شادی کے بعد بھی بھائی کے ساتھ رہتی آئی تھیں۔ سسرال میں باقاعدہ کبھی نہیں رہیں۔ یوں بھی ان کے اور سرور حسین کے درمیان ایک عجیب سا حجاب قائم تھا۔ شاید قبل سے قریبی رشتہ کی موجودگی اُنھیں ایک دوسرے کے قریب آنے سے روکتی تھی۔ ضروری باتیں ہوں ہاں میں ہو جاتیں۔ سرور حسین نے ولایت سے بیوی کو کبھی خط نہیں بھیجا اور بیوی نے کبھی اُنھیں سلام نہیں کہلوایا۔ ویسے یہاں سے جو بھی اُنہیں خط لکھتا وہ اُن کی بیوی کی خیریت ضرور لکھ دیتا۔ کافی کہنے سننے پر بھی وہ شوہر کے ساتھ پٹنہ جانے کو تیار نہیں ہوئیں تو وہ تنہا ہی پٹنہ میں رہنے لگے۔ دیہات سے کھانا پکانے کو ایک نوکر آ گیا، ایک منشی جی بھی ساتھ رہنے لگے۔ دونوں چھوٹے بھائیوں اور بہنوں کو پٹنہ بُلا لیا۔ بی بی صاحبہ شوہر کی ڈیوڑھی چھوڑنے پر راضی نہیں ہوئیں، ویسے وہ کبھی کبھار پٹنہ جاتی رہتی تھیں۔ بہار شریف سے ہر ہفتہ وہ باقرخانی، کلچے، نمک پارے، مختلف قسم کے حلوے اور کباب وغیرہ پٹنہ بھیجتی رہتیں۔ سرور حسین آدمی ذہین تھے، ولایت میں قانون پڑھے ہوئے تھے۔ جلد ہی انہوں نے پیشہ میں نام کمایا اور طرار وکیلوں میں اُن کا شمار ہونے لگا سیاست سے اُنہیں کوئی دلچسپی نہیں تھی، اخبار روزانہ پڑھتے لیکن حالات حاضرہ پر گفتگو کبھی نہیں کرتے۔ اُنہیں اصغر حسین کی مسلم لیگ سے وابستگی بھی اچھی لگتی اور اختر حسین کی کانگریس دوستی بھی۔ اختر حسین سے تو وہ دو دو رشتوں میں چھوٹے تھے، اُن کے سامنے وہ زیادہ زبان بھی نہ کھولتے۔ بڑے دن اور دوسری چھٹیوں میں گھر آتے، اُس وقت بھی بیوی سے اُن کا دوری کا رشتہ قائم رہتا۔

سرور حسین نئے زمانے کے آدمی تھے ولایت میں برسوں ایک لینڈ لیڈی کے ساتھ رہے تھے۔

اُس کی بیٹیوں، بھتیجیوں کے ساتھ پکنک، سومنگ اور اور گھومنے پھرنے جایا کرتے۔ اُن لوگوں کی وہ بہت سی تصویریں لے کر آئے تھے جنھیں اُن کے بھائی بہنوں نے بہت شوق اور دل چسپی سے دیکھا لیکن جب بیوی کو یہ تصویریں دکھائیں تو اُنھوں نے دیکھے بغیر مُنہ پھیر لیا۔ سرور حسین اُنھیں تو کچھ نہیں سمجھا سکے لیکن ماں، بہنوں اور بھائیوں کو اُنھوں نے سمجھایا کہ ولایت میں لڑکی لڑکے کا ساتھ گھومنا پھرنا کوئی غیر معمولی بات نہیں، بلکہ یہ تو اُن کی تہذیب ہے۔ تب ہی بی بی صاحبہ نے یاد کیا تھا کہ جنّت مکانی شیخ صاحب اسی لیے تو فرنگی تہذیب کے خلاف لڑتے رہے۔ ہماری تہذیب میں تو لڑکی یا کونے میں رہے یا گور میں۔ اُنھیں اپنے بیٹے پر فخر ہوتا کہ اتنے دنوں ولایت میں رہنے کے باوجود وہ کسی فرنگن کو نہیں لایا، جب کہ لوگوں نے اُن کو کتنا ڈرایا تھا اور کیسی کیسی باتیں کہی تھیں۔ دراصل وہ بھروسے کی بڑی پکی تھیں۔ اللہ پر بھروسا، شوہر پر بھروسا، بال بچّوں پر بھروسا، داماد پر بھروسا، کانگریس پر بھروسا، مسلم لیگ پر بھروسا ——————

۴

الیکشن کا زمانہ تھا۔ پٹنہ اور بہار شریف ملا کے بہت بڑا حلقہ تھا، اس میں مسلمانوں کی تعداد خاصی تھی۔ کانگریس نے ایک بہت ہی مشہور لیڈر خواجہ عبدالحمید کو ٹکٹ دیا تھا جو نہ صرف مسلمانوں بلکہ ہندوؤں اور دوسرے لوگوں میں بھی یکساں طور پر مقبول تھے۔ وہ ضلع کانگریس کے صدر بھی تھے۔ ۱۹۴۲ کے اندولن میں جیل جا کے ابھی ابھی چھوٹے تھے۔ الیکشن سے بہت پہلے جب بھی امیدوار کا نام آتا، اکثر لوگ اُن ہی کا نام لیتے۔ دوسری طرف مسلم لیگ نے مولوی عبدالغنی کو کھڑا کیا۔ بہت پہلے ضلع کانگریس میں خواجہ عبدالحمید کے بعد حفظ مراتب میں اُن ہی کا نام لیا جاتا تھا۔ لیکن ۱۹۳۶ کی مشترکہ کانگریس مسلم لیگ وزارت کی ناکامی کے بعد انھوں نے کانگریس سے استعفیٰ دے کر مسلم لیگ میں شمولیت اختیار کر لی تھی۔ وہ بڑے زبردست مقرّر تھے۔ تقریر کرتے تو گاندھی اور نہرو کی وہ دھجیاں اُڑاتے کہ اُن کا جواب دینے کی کوئی ہمت نہ کرتا۔ جناح صاحب نے جب مولانا آزاد کو 'شو بوائے' کہا تو اس خطاب کو پٹنہ ضلع کے گاؤں گاؤں میں پہنچانے کا ذمّہ مولوی صاحب نے لے لیا تھا۔ اس کا نتیجہ خاطر خواہ نکلا اور بچّہ بچّہ مولانا آزاد کا بر سرِ عام مذاق اُڑانے لگا۔ کانگریس کا کوئی مسلمان لیڈر اُنھیں دکھائی پڑ جاتا تو وہ اُس سے

تمسخر کے انداز میں مولانا آزاد کی خیریت پوچھتے۔ اخباروں میں خبر آئی تھی کہ علی گڑھ ریلوے اسٹیشن پر مسلم یونی ورسٹی کے لڑکوں نے مولانا کو دیکھ کے اپنے پاجامے کھول دیے اور "شو بوائے" کے نعرے بلند کیے۔ اس کا چرچا بہت دنوں رہا۔ ان میں دو ایک لڑکے اس علاقے کے بھی تھے، جب وہ چھٹیوں میں گھر آئے تو انہیں بڑی شاباشی ملی اور ہاروں سے لاد دیا گیا۔ یہ لڑکے بڑے زبردست اور پرجوش مسلم لیگی تھے۔ علی گڑھ پاجامہ، شیروانی، ترکی ٹوپی، جس پر مسلم لیگ کا چاند اور تارا بنا ہوتا، زیب تن کیے یہ لڑکے بڑے رومانٹک لگتے۔ انہوں نے گاؤں گاؤں گھوم کر مسلمانوں کو کانگریس اور مسلم لیگ کا فرق بتایا، مسلم لیگ کے تقسیم ہند کے مطالبہ کی اہمیت بتائی، مولانا آزاد کی مسلم دشمنی اور ہندو پرستی کے بارے میں تقریریں کیں، گاندھی اور نہرو کی گندی سیاست کے بارے میں بتایا اور سردار پٹیل کی صاف گوئی اور کھرے پن کی تعریفیں کیں۔ ان لڑکوں نے گھوم گھوم کر مسلم لیگ کے لیے کافی چندے بھی جمع کر لیے۔ اس طرح مسلم لیگی امیدوار کی کامیابی کے لیے انہوں نے بہت حد تک زمین ہموار کر دی۔ صوبائی مسلم لیگ نے اس جگہ پر کامیابی کو اپنے وقار کا سوال بنا لیا تھا۔ یہ علاقہ کانگریس کا گڑھ رہا تھا۔ یہاں قومی لیڈروں کی ہمیشہ آمد ہوتی رہی تھی۔ کانگریس کے رام گڑھ اجلاس میں اس ضلع نے سب سے زیادہ ڈیلی گیٹ بھیجے تھے۔ صوبائی مسلم لیگ کے کئی لیڈر باقاعدہ یہاں کام کر رہے تھے۔ اصغر حسین اسلام پورے ہفتوں قبل بہار تشریف آ گئے تھے۔ بین ہاؤس کے اس حصہ میں، جس میں الطاف حسین کا قیام رہتا تھا اور جس کی دیواروں نے بڑے بڑے کانگریسی لیڈروں کو دیکھا تھا۔ مسلم لیگ کا الکشن آفس کھل گیا اور وہاں دن رات چہل پہل رہنے لگی۔ کارکنوں کے کھانے پینے کے وسیع انتظامات کیے گئے۔ نانبائی کے ہاں روٹیاں پکوائی جاتیں اور سالن کی دیگیں گھر ہی میں چڑھتیں۔ کانگریس کا الیکشن آفس تو اس کے دفتر میں قائم تھا لیکن ایک متقدر لیڈر ہونے کے باعث اختر حسین کے ہاں کانگریسی کارکنوں کی ہر وقت بھیڑ رہا کرتی۔ ایک ہی مقام پر دونوں جماعتوں کے کارکنوں کی ہر وقت موجودگی سے آپس میں جھگڑا ہونے کا خطرہ رہنے لگا۔ مسلم لیگ کے لوگ تعداد میں زیادہ ہوتے اور کانگریس کے خلاف طرح طرح کی باتیں بلند آواز سے کرتے۔ کئی بار تو اختر حسین غصہ کے عالم میں اپنے کمرے سے نکلے لیکن کانگریس کے لوگ انہیں سمجھا بجھا کر اندر لے گئے۔ الیکشن کی مصروفیت کی وجہ سے اُن کے ہاں کانگریس کے ہندو لیڈر کم ہی نظر آتے، آنے والے زیادہ تر مسلمان ہوتے جنھیں دیکھ کے مسلم لیگیوں کو اور بھی غصہ آتا۔ کانگریس کے مسلمانوں کی حالت عجیب ہو گئی تھی۔ کانگریس کا امیدوار مسلمان تھا لیکن اُس کا کام

سب سے زیادہ ہندو علاقوں میں اور ہندوؤں کے ذریعہ ہو رہا تھا۔ نہ صرف صوبائی بلکہ مرکزی لیڈر علاقے کا دورہ کر چکے تھے۔ نہرو کی اپیل چھاپ کر بانٹی جا چکی تھی۔ لطف کی بات یہ تھی کہ مسلمان لیڈر اور کارکن بھی صرف ہندو علاقے میں ہی جا سکتے تھے کیوں کہ جب کبھی اُنہوں نے مسلمان علاقوں میں جانے کی کوشش کی، اُن کا استقبال لاٹھیوں اور بھالوں سے کیا گیا، کئی بار مار پیٹ کی نوبت بھی آ گئی اور درجنوں افراد زخمی ہو کر اسپتال پہنچ گئے۔ کانگریس کے پاس کوئی بڑا مسلم لیڈر تھا بھی نہیں سب تو مسلم لیگ میں شامل ہو چکے تھے، لے دے کے ایک مولانا آزاد رہ گئے تھے، لیکن جب سے جناح نے اُنہیں 'شو بوائے' کہا تھا، اُن کی بڑی درگت بن چکی تھی۔ صوبائی لیڈر آتے، بند کمرے میں مسلمان کارکنوں اور لیڈروں سے صلاح مشورہ کرتے اور چلے جاتے۔ اختر حسین نے اپنی جماعت کے اُمیدوار کی کامیابی کے لیے دن رات محنت کی۔ کچہری کھلی ہوئی تھی لیکن وہ وہاں جانا بھول چکے تھے۔ اُن کے مؤکل آتے اور وکیل صاحب پر دوسرا جنون دیکھ کے لوٹ جاتے۔ اُن کی جمی جمائی پریکٹس اثر انداز ہونے لگی تھی اور مسلمان مؤکل اُن کے ہاں اب کم آنے لگے تھے۔ دوسری طرف مسلم لیگی وکیلوں کی وکالت خوب چمک رہی تھی۔ اصغر حسین کو یہ دیکھ کے بڑی کوفت ہوتی کہ اختر حسین گھر بار، پریکٹس کو لات مار کر ہندو جماعت کے امیدوار کی کامیابی کے لیے دن رات ایک کیے ہوئے ہیں۔ لیکن اختر حسین بڑے تھے، اُن کے سامنے زبان کھولنے کی ہمت بھی اُن میں نہیں تھی۔ اُنہیں جو کچھ بھی کہنا ہوتا، وہ ماں اور بہنوں سے کہتے، وہ خاموشی سے اُن کی باتیں سُنا کرتیں۔ اُنہیں لگتا کہ اصغر حسین ٹھیک ہی تو کہہ رہے ہیں، بھلا غیر قوم اپنی ہو سکتی ہے۔ اختر حسین اُن سے تو کچھ نہیں کہتے تھے لیکن وہ لوگ انہیں کبھی غلط نہیں سمجھتے تھے۔ ایک دن مسلم لیگی کارکنوں نے اختر حسین کے دو قریبی کانگریسی دوستوں کو پیٹ ڈالا تو اختر حسین زخمی حالت میں اُنہیں اپنے ہاں لائے۔ انہیں ڈاکٹر سے دکھایا، اُن کے لیے دُودھ اور کھانے کا انتظام کیا۔ اندر سے اُن کے لیے مخصوص غذائیں تیار ہو کر آتیں۔ گھر کی عورتیں ایک طرف مسلم لیگی کارکنوں کے لیے دیگیں چڑھاتیں تو دوسری طرف کانگریسی کارکنوں کے لیے پرہیزی غذائیں تیار کراتیں۔

الیکشن کے دن خاصہ ہنگامہ تھا۔ کئی روز کی سرگرمیوں اور ہماہمی کے عروج کا دن تھا۔ رات بھر خوب چہل پہل رہی۔ گاڑیاں دوڑتی رہیں۔ پورے علاقہ میں ایک میلے کی کیفیت تھی۔ حلقہ بہت بڑا تھا لیکن صرف ایک ہی ممبر چُنا جانا تھا۔ آزادی کے بعد اسی علاقے سے ڈیڑھ درجن اُمیدوار

منتخب کیے جانے لگے۔

اختر حسین کے بنگلے پر خاموشی طاری تھی۔ وہ صبح اپنا ووٹ دے کر باہر بیٹھے تھے۔ کانگریسی کارکن تھوڑی تھوڑی دیر کے بعد آتے اور اُنھیں تازہ خبر دیتے۔ دوسری طرف اصغر حسین کی حویلی سرگرمیوں کا مرکز بنی ہوئی تھی۔ مسلم لیگی کارکن جتھوں میں آتے اور خوب نعرہ بازی کرتے۔ الیکشن کے روز نعرہ بازی پر پابندی تھی لیکن اس پابندی کو دیکھنے والی آنکھیں بیدار نہیں تھیں۔ اختر حسین نے اپنی بیوی کو ہدایت کردی تھی کہ اُنھیں کانگریس کے نشان پر ووٹ دینا ہے۔ گھر میں اور کسی سے اُنھوں نے یہ بات نہیں کہی تھی۔ اُن کی بیوی ایک فرماں بردار خاتون کی طرح برقع پہن کر ووٹ دے آئی تھیں۔ اُن کے لیے رکشا آیا تھا۔ لیکن گھر کی سبھی عورتیں اصغر حسین کی موٹر پر ووٹ دینے گئی تھیں۔ اسی وقت اختر حسین نے پتہ نہیں کیا سوچ کر اپنی بیوی کا برقع منگوا بھیجا۔ اتفاق سے وہ برقع کسی دوسری عورت کو پہنا کر ووٹ دینے لے جایا گیا تھا۔ برقع نہیں آنے پر اُنھوں نے بہت واویلا مچایا۔ اپنی بیوی کو بُلا کر خوب ڈانٹا۔ وہ بیچاری چپ چاپ کھڑی آنسو بہاتی رہیں۔ جب برقع واپس آگیا تو اُنھوں نے اُسے شوہر کو فوراً بھیج دیا۔ شام چار بجے تک شہر میں خوب گہما گہمی رہی۔ شام میں خبر آئی کہ ووٹنگ غیر معمولی طور پر زیادہ ہوئی ہے۔ یعنی چالیس فی صد سے زیادہ۔ اصل مقابلہ کانگریس اور مسلم لیگ ہی کے درمیان تھا، یوں ایک آزاد اُمیدوار بھی تھے لیکن اُن کا کوئی نام ہی نہ لیتا تھا۔ رات بھر جوش و خروش اس قدر رہا کہ دونوں جماعتوں کے کیمپ میں کوئی سو ہی نہیں سکا۔ صبح کو گنتی شروع ہوئی۔ کانگریس کے کچھ مولوی نما لیڈر ایک موٹر پر جا رہے تھے کہ ایک محلے کی نکڑ پر چند نوجوانوں نے اُنھیں گھیر کر اچھی طرح مرمت کر دی، داڑھی مونڈ دی، مُنھ پر کالک مل دی اور پاجامہ کھول کھول کر اُن کے چاروں طرف خوب ناچے۔ وہ لوگ پولیس میں رپورٹ درج کرانے گئے تو پولیس کے پاس اُن کے خلاف پہلے سے کیس موجود تھا۔ سب وہیں گرفتار کر لیے گئے۔

الیکشن کے نتیجے کا اعلان ہوا۔ مسلم لیگی امیدوار مولوی عبدالغنی بھاری اکثریت سے کامیاب ہوئے۔ ہندو مہا سبھا کا امیدوار دوسرے نمبر پر رہا اور کانگریسی اُمیدوار خواجہ عبدالحمید تیسرے نمبر پر۔ مسلم لیگی اس کامیابی سے پاگل ہو اُٹھے۔ اسی وقت شہر میں ایک بڑا جلوس نکالا گیا جس نے پورے شہر کا طواف کیا۔ گاندھی، نہرو اور آزاد کو گندی گالیاں دی گئیں اور قائدِ اعظم محمد علی جناح زندہ باد کے فلک شگاف نعرے بلند کیے گئے۔ ٹاؤن ہال کے بڑے میدان میں سب جمع ہوئے، وہاں اصغر حسین کو پھولوں کے ہار سے لاد دیا گیا۔ کامیاب امیدوار مولوی عبدالغنی خود موجود نہیں تھے، وہ پٹنہ میں تھے۔ لیکن اصغر حسین کی موجودگی سے اُن کی غیر موجودگی

محسوس ہی نہیں ہو رہی تھی۔ اصغر حسین ہی اپنے امیدوار کی طرف سے مبارک باد اور تہنیت وصول کر رہے تھے۔ اصغر حسین اور دوسرے لیڈروں نے مسلم لیگ کی اہمیت، تقسیم ہند کی افادیت اور کانگریس کی مسلم دشمنی پر روشنی ڈالی۔ رات گئے تک یہ سلسلہ جاری رہا۔ اختر حسین کا بنگلہ خاموش اور تاریک تھا۔ اختر حسین اپنی جماعت کے گرفتار لیڈروں کی رہائی کے دوڑ دھوپ میں لگے تھے۔ انہیں اس کی فکر بھی تھی کہ پولیس ان لوگوں کے ساتھ کوئی ناروا سلوک نہ کرے، انہیں کھانے پینے کی مناسب سہولت دستیاب ہوں۔ بہار کے بڑے کانگریسی لیڈروں کو اُن کی گرفتاری کی خبر مل چکی تھی۔ پروفیسر عبدالباری اُن سے ملنے کو آگئے تھے لیکن حکومت نے ملنے کی اجازت نہیں دی۔ اس لیے وہ اختر حسین اور دوسرے لیڈروں سے صلاح مشورہ کے بعد پٹنہ لوٹ گئے۔

اس الیکشن کا صوبائی سیاست پر جو اثر بھی مرتب ہوا ہو، بین ہاؤس میں اس نے اپنا سایہ یقینی ڈال دیا تھا۔ اختر حسین یوں بھی بہت کم گو تھے، الیکشن کی سرگرمیوں سے فارغ ہو کر وہ اپنی وکالت کی طرف دل جمعی کے ساتھ لگ گئے تھے۔ انگلینڈ میں لیبر پارٹی برسرِاقتدار آگئی تھی۔ اُس کے لیڈر اقتدار حاصل کرنے سے قبل ہندوستان کی آزادی کی تحریک کی حمایت کر چکے تھے۔ گاندھی جی سے اُن کی خط و کتابت رہ چکی تھی۔ اقتدار حاصل کرنے کے بعد انہیں اپنا وعدہ یاد رہا۔ اور انہوں نے ہندوستان کی تحریک آزادی کے تئیں مثبت بیانات دیے۔ اس سے کانگریس کے جارحانہ رویّے میں خاصی کمی آئی، اور ملک کے کانگریس کارکن گھروں میں بیٹھ کر اپنا خمار دور کرنے لگے۔

الیکشن کے بعد مسلم لیگ کے حوصلوں میں اضافہ ہوا تھا۔ وہ لوگ ایک منزل کو فتح کرنے کے بعد دوسری منزل کی طرف رواں دواں تھے۔ کانگریس کے لیے اگرچہ عوامی میدان خالی تھا لیکن وہ لوگ آزادی حاصل کرنے میں اتنی شدت سے لگے تھے کہ عوامی رابطے اور سیاسی تعلیم کی طرف اُن کا دھیان ہی نہیں تھا۔

اصغر حسین، اسلام پور واپس چلے گئے تھے۔ الیکشن کے بعد انہیں ضلع مسلم لیگ کا نائب صدر بنا دیا گیا۔ انہوں نے پٹنہ میں ایک کوٹھی خرید لی اور اکثر پٹنہ میں رہنا شروع کر دیا۔ انہوں نے بڑے بھائی سرور حسین کو بھی اُسی کوٹھی میں اُٹھ آنے کو کہا لیکن وہ تیار نہیں ہوئے۔ ویسے دونوں بھائیوں میں اتنی محبت اور اپنائیت تھی کہ اس کی مثال دی جانے لگی تھی۔ سرور حسین بال بچوں سے محروم تھے لیکن وہ اصغر حسین کے بچوں کو اس قدر چاہتے تھے کہ انہیں خود بھی محسوس ہی نہیں ہوتا تھا کہ وہ اُن کے اپنے بچے نہیں ہیں۔ وہ اصغر حسین کے دو بچوں کو اپنے ہاں لے آئے تھے، کانونٹ میں ان کا نام لکھا دیا تھا، اُن کے گھر پر

دو دو ٹیچر مقرر کر دیے تھے۔ اگرچہ اصغر حسین کی بیوی نے اس پر اعتراض بھی کیا تھا کہ بچّے دوسرے ٹکڑے پر کیوں پلیں لیکن اصغر حسین اپنے ذاتی معاملات میں بیوی تک کی مداخلت پسند نہ کرتے تھے۔ اُن کی بیوی بڑے دادا کی پوتی تھیں۔ اصغر حسین اُن سے صاف کہہ دیتے کہ سنبھالیے اپنا کاروبار، میں کوئی آپ کا پٹواری گماشتہ نہیں ہوں، اللہ نے میرے بازوؤں میں طاقت دی ہے، میں خود کھا کما لوں گا۔ اُن کی بیوی یہ دھمکی سن کر ایک دم خاموش ہو جاتیں۔ وہ جانتی تھیں کہ یہ محض دھمکی نہیں۔ اصغر حسین زبان کے پکّے تھے، جو کہتے، وہ کر گزرتے۔

سرور حسین کو پٹنہ میں تنہا رہتے رہتے بہت تکلیف ہونے لگی۔ منشی جی کے ہاتھوں میں سارا روپیہ اور خانہ داری تھی۔ اول جلول سے سارا کاروبار چل رہا تھا۔ سرور حسین بواسیر کے دائمی مریض تھے۔ ولایت تک میں اس کا علاج کرایا تھا لیکن فائدہ کچھ نہ ہوا تھا۔ اکثر بیروں خون آجاتا۔ کبھی کبھی تو یوں ہوتا کہ کپڑے وغیرہ پہن کر کورٹ جانے کو تیار ہوئے کہ خون آنا شروع ہو گیا، پھر کہاں کا جانا، بستر پر جا کر لیٹ جاتے۔ ایسے موقع پر انہیں ایک غم خوار کی سخت ضرورت محسوس ہوتی۔ اُن کو تنہا دیکھ کر کئی گھرانوں نے پیش قدمی بھی کی تھی، لیکن جب انہیں معلوم ہوا کہ سرور حسین شادی شدہ ہیں تو وہ خود پیچھے ہٹ گئے۔ یوں اُن میں ایک دو اس کے بعد بھی کوشش سے باز نہیں آئے تھے۔ اُن کے نزدیک ایک اعلیٰ خاندان کے ایسے ہونہار جوان کے لیے دو کیا، چار شادیاں بھی جائز تھیں۔

سرور حسین نے ایک بار پھر بیوی کو پٹنہ لانے کی کوشش کی۔ لیکن اب کی بار اُن کا کچھ اور ہی رنگ ڈھنگ تھا۔ اُنہوں نے شوہر سے پردہ کر لیا تھا۔ اُن کا الزام یہ تھا کہ پچھلی بار جب وہ آئے تھے تب وہ اُن کا بال کاٹ کر لے گئے، جس پر اُنہوں نے کیا جادو کروایا کہ اُس دن سے وہ بیمار رہنے لگیں۔ اکثر بیٹھے بٹھائے اُن پر دورہ پڑ جاتا۔ وہ چیخنے لگتیں، منہ سے کف نکلنے لگتا، دانت پر دانت جم جاتے، بیہوش ہو جاتیں اور گھنٹوں یہی کیفیت طاری رہتی۔ ہوش میں آتیں تو شوہر کو کو گالی کوسنے دینے لگتیں۔ کبھی کبھی نیند میں بھی اُن کی یہی حالت ہو جاتی۔ اُن کے پاس کوئی تھا نہیں سوائے ایک بوڑھی ماما کے، جو اُن کی کھلائی بھی تھی اور رازدار بھی۔ دورے کے وقت وہ سوائے رونے اور اُن کے منہ پر پانی کے چھینٹے مارنے کے اور کچھ نہیں کر پاتی تھی۔ سسرال میں ساس تھیں، نندیں تھیں لیکن وہاں آنا جانا بند کر رکھا تھا۔ بوا کے مشورے پر کئی درگاہوں پر چلّے کے لیے گئیں، بہت سے پیروں اور فقیروں سے تعویذ گنڈے کر باندھا۔ کسی ایک نے چینی کی پلیٹ پر زعفران سے تعویذ لکھ کر دیے کہ دھو کر پی لیں، لیکن دورہ اُٹھتا ہی رہا،

اس کے ساتھ ساتھ شوہر سے نفرت بھی بڑھتی رہی۔ ایسی حالت میں جب وہ اُنہیں لینے آئے تو اُنہوں نے پردہ ہی کے پیچھے سے وہ ہنگامہ کیا، وہ ہنگامہ کیا کہ سرور حسین کو کچھ بولنے کا موقع ہی نہ مل سکا۔ ماں سے اس بات کا ذکر کیا تو انہوں نے شام کے ناشتہ کے وقت اختر حسین کو بلا کر ساری باتیں بتائیں ــــــ

اختر حسین سر جھکا کے تھوڑی دیر سوچتے رہے، پھر بولے۔

"اُس کی طبیعت ٹھیک نہیں ہے، ابھی اُسے یہیں چھوڑ دیا جائے تو بہتر ہے۔"

سرور حسین نے کہا ــــــ

"بھائی جان، پٹنہ میں ایک سے بڑھ کر ایک ڈاکٹر ہیں۔ وہاں ان کا چیک اپ اور علاج بہتر طور پر ہو جائے گا۔"

"لیکن وہ یہاں حکیم عاصم کے علاج میں ہے اور اس سے افاقہ بھی ہو رہا ہے۔"

حکیم عاصم، شہر کے بہت مشہور کانگریسی تھے۔ مولانا آزاد کے بڑے معتقد، مولانا حسین احمد مدنی کے مُرید، دیوبند کے فارغ، اختر حسین کے دوست، رازدار اور ہم مشرب ــــــ اختر حسین کی بات سن کر سب چپ ہو گئے۔ شاید وہ جانتے تھے کہ اس سے آگے کچھ کہنے سننے کا فائدہ نہیں۔

سرور حسین پٹنہ واپس چلے گئے۔ اگلے ماہ خبر آئی کہ اُنہوں نے اپنے ایک وکیل دوست کی پڑھی لکھی بہن سے عقد کر لیا۔ یہ سن کر اُن کی اہلیہ نے اپنے ہاتھوں کی چوڑیاں توڑ ڈالیں اور سفید دوپٹہ اوڑھ لیا۔ ایک عجیب بات یہ ہوئی کہ اُن کا دورہ بھی ختم ہو گیا۔ اب وہ اپنا زیادہ وقت نماز، روزہ اور عبادت میں صرف کرنے لگیں۔ بی بی صاحبہ پر اس خبر کا بہت ہی منفی اثر پڑا۔ وہ غم و غصہ کی ایک جیتی جاگتی تصویر بن گئیں۔ اب اُن کی سمجھ میں آیا کہ یہ سب ولایت جانے کی خرابی ہے، لوگ اس وقت صحیح کہتے تھے، بیٹا فرنگن نہیں لایا تو کیا ہوا، حرکت تو ویسی ہی کر ڈالی۔ شریف گھرانوں اور وہ بھی سگوں میں آج تک ایسا ہوا ہے کہ بیاہتا کو چھوڑ کر مرد نے دوسرا کر لیا ہو۔ بلا سے بیوی بد مزاج ہے، شوہر اور اُس کے رشتہ داروں سے نہیں ملتی، اس کی سزا یہ تو نہیں۔ پھر یہ رشتہ خود شیخ صاحب کا لگایا ہوا ہے، بڑی دلہن اُس کی سگی بھانجی ہیں، ان کی روح کو کتنی تکلیف پہنچے گی۔ انہوں نے بیٹے کو صاف صاف لکھ دیا کہ اب آئندہ یہاں آنے کی کوئی ضرورت نہیں، تم سے اس گھر کا کوئی رشتہ باقی نہیں رہا ــــــ ہر ہفتہ وہ جو کھانے پینے کے سامان بھیجتی رہتی تھیں، اُس کا سلسلہ بھی ختم ہو گیا۔ سرور حسین اپنے جن بھائی بہنوں کو پڑھانے لے گئے تھے، بی بی صاحبہ نے اُنہیں بھی واپس بلا لیا۔ البتہ اصغر حسین کے بچے

بدستور اُن کے ساتھ رہے۔ اصغر حسین اور دوسرے بھائی بہن، بڑے بھائی کی اس حرکت سے اندر اندر بہت خوش تھے، لیکن بی بی صاحبہ کے ڈر سے سب خاموش تھے۔ اگرچہ بی بی صاحبہ کسی سے کچھ کہتی نہیں تھیں لیکن بال بچوں پر اُن کا خاصا رعب تھا۔ وہ جب کسی مسئلے پر خاموش ہو جاتیں تو اُن کی خاموشی سے سب خاموش ہو جاتے اور گھر میں اُس وقت تک خاموشی طاری رہتی جب تک اُن کے ہونٹ سلے ہوتے۔

اصغر حسین تو اپنی پھیلی ہوئی زمین داری، کاشتکاری و باغبانی میں مصروف رہتے، اُنہیں بین جانے کی فرصت ہی نہ ملتی۔ سرور حسین ولایت سے آنے کے بعد کئی بار بین جا چکے تھے، اُنہیں وہاں کے بارے میں کافی اندازہ ہو گیا تھا۔ اختر حسین کے مشورہ سے اُنہوں نے جائداد کے سلسلے میں دو ایک قدم بھی اُٹھائے تھے۔ اختر حسین زمین داری، کاشت کاری اور بین کے بارے میں جتنا کچھ جانتے تھے، اتنا اس خاندان میں اور کوئی نہیں جانتا تھا۔ اُن کی اپنی بھی تھوڑی سی زمین بین میں تھی جس کے بندوبست کے لیے وہ اکثر وہاں جایا کرتے۔ ماموں کے معاملات میں اُنہوں نے کبھی بے جا مداخلت نہیں کی، البتہ جو کچھ اُن سے کہا جاتا، وہ اپنا فرض سمجھ کر ضرور کر گذرتے۔ سرور حسین سے قطع تعلق کرنے کے بعد بی بی صاحبہ نے اُنہیں خاص طور پر بین اور زمین داری کے سارے معاملات دیکھنے کو کہا۔ اُنہیں اس میں پس و پیش تو بہت ہوا لیکن بی بی صاحبہ کے حکم کے آگے وہ انکار بھی نہیں کر سکتے تھے، سو وہ ہر اتوار اور چھٹی کے دن بین جانے لگے۔ سواری کی سخت دقّت کے باعث انہوں نے ایک گھوڑا خرید لیا۔ شیخ صاحب کے سبھی گھوڑے مر چکے تھے۔ وہ دو تین گھنٹوں میں بہار شریف سے بین پہنچ جاتے۔ کام نمٹا کر وہ دوسرے روز علی الصبح لوٹ آتے۔ جائداد، پیداوار اور آمدنی کے سلسلے میں وہ پائی پائی کا حساب رکھتے اور گماشتہ جی کے حوالے کر کے اُنہیں بی بی صاحبہ کی خدمت میں بھیج دیتے۔ خود وہ اُن کے پاس حساب لے کر کبھی نہیں جاتے تھے۔ البتہ بی بی صاحبہ اگر ان سے کوئی وضاحت چاہتیں یا کچھ دریافت کرنا چاہتیں تو وہ اُن کی خدمت میں حاضر ہو کر بہت تفصیل اور باریکی کے ساتھ اُنہیں اس طرح سمجھا دیتے کہ بی بی صاحبہ پوری طرح مطمئن ہو جاتیں۔

اختر حسین کے بار بار بین آنے سے شیخ الطاف حسین کی ویران حویلی میں زندگی کے آثار پیدا ہو گئے تھے۔ مکان صاف ستھرا رہنے لگا تھا، دو تین ملازم وہاں مستقل طور پر رہتے تھے۔ اختر حسین اب بڑی چھٹیوں میں لمبے عرصے کے لیے وہاں جانے لگے تھے۔ اُن کی آمد سے مقامی لوگوں میں بڑا اعتماد

پیدا ہو گیا تھا ۔ شیخ صاحب کے گاؤں سے ہجرت کر جانے کے سبب وہاں کے لوگ اپنے آپ کو بڑا بے سہارا محسوس کرنے لگے تھے ۔ شیخ صاحب جب کبھی بین آتے تو جیسے وہاں کے لوگوں کی عید ہو جاتی ۔ اب اختر حسین کے آنے سے وہی عید پھر واپس آگئی تھی ۔ وہ دو چار روز کے لیے بھی جاتے تو گاؤں کے پچاسوں مسئلے ان کے سامنے آجاتے ۔ حویلی کے سامنے شیخ صاحب نے ایک پختہ چبوترہ بنوایا تھا، شام کو اس پر دری اور چاندنی بچھا دی جاتی ۔ اختر حسین کو لوگ چاروں طرف سے گئی رات تک گھیرے رہتے ، لالٹینیں جلتی رہتیں ۔ گاؤں کی آبادی مشترکہ تھی، ہندو، مسلمان اور ہریجن ۔ اونچی نیچی جاتی کے مختلف فرقے ۔ گاؤں کے بڑے زمین دار مسلمان تھے لیکن آبادی میں اکثریت ہندوؤں کی تھی ۔ آس پاس کے گاؤں کے زمین دار راجپوت اور بھومیہار تھے لیکن اُن کی زمینوں میں کام کرنے والوں میں مسلمانوں کی تعداد خاصی تھی ۔ زمین داروں کے ظلم کے قصے اس وقت تک بین میں عام نہیں ہوئے تھے ۔ شیخ صاحب سے اُن کی رعیت خوش رہتی تھی ۔ یوں مزدوری کے نام پر اُنہیں بہت کم اُجرت ملتی لیکن اُن کی ساری ضرورتیں حویلی سے پوری ہو جاتی تھیں اور سال بھر کا حساب کیا جاتا تو وہ لوگ کچھ زیادہ ہی پا لیتے تھے ۔ آس پاس کے زمین دار، زمین داروں جیسے رہتے تھے ۔ اُن کے ہاں مار پیٹ ، جھونپڑی اکھڑوا کر اُس پر کولہو کے بیل چلوا دینا، خوب صورت لڑکیوں کو اُٹھوا لینا جیسے قصے چوری چھپے سُننے جاتے ۔ یہ قصے آہستہ آہستہ چٹخارے دار بنتے جا رہے تھے ۔ لوگ زمین داروں میں شیخ صاحب کی مثال دیا کرتے ۔ شیخ صاحب کے بعد جب اختر حسین نے کاروبار سنبھالا تو انہوں نے شیخ صاحب کی ساری روایات کو نہ صرف برقرار رکھا بلکہ ان میں توسیع کرنے کی کوشش بھی کی ۔ وہ ایک عوامی آدمی تھے اور عوام سے دور نہیں رہ سکتے تھے ۔ اُس زمانے میں عوام کا آدمی وہ ہوا کرتا جو اُن کے دکھ درد کو اس قدر اپنا لیتا تھا کہ وہ اُسی کے ہو کے رہ جاتے ۔ اختر حسین سارے علاقہ کے دکھ درد سے آگاہ رہتے اور اپنی حد تک اُنہیں حل کرنے کی کوشش بھی کرتے ۔ شہر میں ان لوگوں کے جو بھی مسئلے اٹکتے وہ اختر حسین ہی کی کوششوں سے حل ہوتے ۔ وہ اُن کے مقدموں میں بہت کم اور کبھی کبھی نہیں کے برابر فیس پر کام کرتے ۔ اختر حسین ہی کے اثر کے تحت سارا گاؤں اور علاقہ ذہنی اور جسمانی طور پر آزادی کی تحریک میں لگا تھا ۔ بین وہ واحد گاؤں تھا جہاں کے مسلمانوں نے مسلم لیگی لیڈروں کی گاڑی کو راستہ ہی میں روک لیا تھا اور انہیں گاؤں میں داخل نہیں ہونے دیا تھا ۔ اصغر حسین نے جب وہاں آنے کی کوشش کی تھی تو لوگ اُن کے پیروں میں چمٹ گئے تھے اور کسی نہ کسی طرح اُنہیں روک ہی لیا تھا ۔ اس کے

جواب میں ہندوؤں نے ہندو مہا سبھا کے لیڈروں کو بھی وہاں نہیں آنے دیا تھا۔ اگرچہ اس کے باوجود یہ امر تعجب خیز ہے کہ وہاں ہندو مہا سبھا کے اُمیدوار کو کافی ووٹ مل گئے تھے۔ یہ عقدہ عرصہ تک حل نہیں ہو سکا۔ کانگریس کے لیڈروں کا چاہے وہ ہندو ہو یا مسلمان، گاؤں میں ہمیشہ شاندار استقبال ہوتا تھا۔ گاؤں والوں کو اس کا بڑا فخر تھا کہ انہوں نے علی برادران، گاندھی جی، مالویہ جی، شری بابو، انو گرہ بابو، پروفیسر عبدالباری اور مولانا مظہر الحق وغیرہ کی آنکھیں دیکھی ہیں۔

الیکشن کے بعد سارے علاقہ کی فضا بہت مسموم ہو گئی تھی۔ کانگریس اور مسلم لیگ کی بنیادوں پر گھر گھر تقسیم ہو گئے تھے، ہندو اور مسلمان کا امتیاز لوگوں کے درمیان جگہ جگہ اپنا اَن دیکھا ہیولیٰ کھڑا کرتا پھر رہا تھا۔ پنجاب اور بنگال کے بہت سے علاقوں میں کئی ہندو مسلم فسادات ہو چکے تھے جن کا یہاں خوب ذکر ہوا تھا۔ مسلم لیگ والے تو پاکستان کا خواب دکھا کر جا چکے تھے۔ اُن کے جانے کے بعد ہندو مہا سبھا نے اُن کے اِس خواب کی ایک بھیانک تعبیر کو ہر ہندو گھر میں پہنچانے کا ذمہ لے لیا تھا۔

اختر حسین بین گئے تو لوگوں کو انہوں نے بہت ہراساں دیکھا۔ قابلِ ذکر بات یہ تھی کہ اب کے ہندو اُن سے ملنے بہت کم آئے اور جو مسلمان آئے، وہ پریشان و حیران تھے۔ اختر حسین اس صورتِ حال کو عرصہ سے دیکھ رہے تھے اور خود پریشان تھے۔ گاندھی جی سے اُن کی اس مسئلے پر خط و کتابت بھی ہو چکی تھی۔ لیکن کوئی کچھ نہ کرتا۔ سب اندر اندر چپ تھے۔ اس وقت تک کانگریس نے بھی قومی یک جہتی کو اپنا نصب العین قرار نہیں دیا تھا، البتہ اُس کے ہر جلسہ میں داڑھی اور ٹوپی والوں کو ڈائس پر ضرور بٹھایا جاتا۔

۵

نواکھالی میں ایک بڑا فساد ہو گیا۔ سارے ملک میں ہلچل مچ گئی۔ دیوالی آنے والی تھی لیکن نواکھالی کے مرنے والوں کے سوگ میں گاندھی جی نے اپیل کی کہ لوگ دیوالی نہ منائیں۔ چنانچہ دیوالی نہیں منائی گئی اور جو تہوار گزرا، اُسے کالی دیوالی کا نام دیا گیا۔ گاندھی جی نے خود بھی نواکھالی کا دورہ کیا۔ اس سے فضا بڑی حد تک نرم ہوئی۔ گاندھی جی لاٹھی ٹیکتے گاؤں گاؤں پیدل ہی گھومتے۔ لوگ اپنی آنکھوں اور کانوں سے اُنہیں دیکھتے اور سنتے۔

نواکھالی ابھی سنبھلا بھی نہیں تھا کہ کلکتہ میں فساد ہو گیا۔ جسے انگریزی اخباروں نے عظیم قتل عام کا

نام دیا۔ اس وقت وہاں مسلم لیگی وزیرِ اعلیٰ سہروردی برسرِ اقتدار تھے۔
اختر حسین کو گاؤں کے چند مسلمانوں نے کاغذ کے کچھ پُرزے دکھائے جو گاؤں کے حجام کو تاڑی پلا کے انہوں نے اُس کی جیب سے نکال لیے تھے۔ انہیں 'پتیا' کہا جاتا تھا۔ ان پُرزوں میں کچھ مقررہ دن اور تاریخوں کا ذکر تھا، کچھ لوگوں کے نام تھے، کچھ گاؤں کے نام تھے، اشارہ اشارہ میں کچھ اور باتیں بھی تھیں۔ جنھیں اختر حسین نہیں سمجھ سکے۔ لوگوں کا کہنا تھا کہ یہ پُرزے فساد کے سلسلے میں تقسیم کیے گئے ہیں۔ اُن کا تو یہ بھی کہنا تھا کہ کانگریس ہی کے کچھ لیڈروں نے یہ پُرزے تقسیم کرائے ہیں۔ اختر حسین کو ان باتوں پر یقین نہیں آیا اور انہوں نے ان پُرزوں کو کوئی اہمیت نہ دی۔
وہ تو بیس پچیس سال سے اس قسم کی باتیں سُنتے اور دیکھتے آ رہے تھے۔ جس وقت مسلم لیگ کا وجود بھی نہیں تھا اور یہاں سے وہاں تک صرف کانگریس ہی کانگریس تھی، اس وقت بھی کبھی کبھی ہندو مسلمان دو گروہوں میں منقسم ہو کے ایک دوسرے کے خلاف اُٹھ کھڑے ہوتے، بولنے اور کہنے سننے والے اس وقت بھی کم نہیں تھے۔ پھر بھی اُنہوں نے پٹنہ جا کر انگریز کلکٹر اور ایس پی سے باتیں کیں۔ کلکٹر نے بہار شریف کے ہندوستانی ایس ڈی او کو فون پر کچھ ہدایتیں دیں۔ پٹنہ ہی میں اُنہوں نے پروفیسر عبدالباری اور انوگرہ بابو سے بھی صلاح و مشورہ کیا۔ صوبائی کانگریس کے کچھ ایسے کارکنوں کا جو گاندھی جی کے زبردست پیرو اور چار گھنٹے روزانہ چرخا کاتنے والے تھے، وفد تیار کیا گیا تاکہ وہ گھوم گھوم کر لوگوں کو مل جل کے رہنے کا پیغام دیں۔ وہ لوگ گئے بھی۔ ہفتوں گھومنے کے بعد وہ بہار شریف پہنچے۔ بین ہاؤس کے میدان میں ایک جلسہ بلایا گیا جس میں گاندھی جی کی پرارتھنا سبھا کی طرح قرآن اور وید کے آیات اور پاٹھ کیے گئے۔ بڑی ہی پُر اثر تقریریں ہوئیں۔ مجمع سے قومی یک جہتی کا حلف لیا گیا اور وفد کے لوگ مطمئن ہو کر پٹنہ لوٹے۔
لیکن فساد پھوٹ ہی پڑا۔ بہار شریف کے آس پاس سیکڑوں دیہاتوں سے آگ لگنے کی خبریں آنے لگیں۔ ہر لحظہ یہ آگ پھیلتی اور بڑھتی رہی۔ سیکڑوں افراد قتل کر دیے گئے۔ ہزاروں زخمی اور بے گھر بار ہو گئے۔ لوگ بھاگ کر بہار شریف آئے۔ ریلوے اسٹیشن، مسجدیں، مدرسے اور درگاہ رفیوجیوں سے بھر گئے۔ اختر حسین رات بھر بے چینی سے ٹہلتے تھے۔ اُن کے ساتھی پریشان پریشان سے اُن کے پاس آتے۔ اختر حسین نے کچہری جانا بھی چھوڑ دیا تھا۔ اُن کو فساد زدہ علاقے کی ذرا ذرا خبریں مل رہی تھیں۔ جو صورتِ حال پیدا ہو گئی تھی، اس کے بارے میں انہوں نے کبھی

سوچا بھی نہیں تھا۔ اگرچہ باخبر لوگوں نے ان کے سامنے بہت قبل اس قسم کا نقشہ کھینچ دیا تھا لیکن ان کو یقین نہیں آیا تھا اور وہ اس نقشہ کو بھولنے کی کوشش کرتے رہے تھے۔ وقت اپنا کام کر گیا تھا اور وہ سب کچھ سامنے آگیا تھا، جو وہ ہمیشہ سنتے رہے تھے۔ وہ اپنے ساتھیوں کے ساتھ گھنٹوں سر جوڑے بیٹھے رہتے اور اس کی فکر کرتے کہ کیا کرنا چاہئے۔ نتیجہ کچھ ہاتھ نہ آتا۔ وہ کانگریسی کارکنوں کا ایک وفد لے کر فساد زدہ علاقوں میں جانا چاہتے تھے، لیکن مقامی انتظامیہ اس کے لیے تیار نہیں ہوئی۔ مولانا ایوب انصاری، ایک مشہور کانگریسی لیڈر تھے، مولانا آزاد کے مرید اور گاندھی نہرو کے پیرو۔ کانگریسی ہونے کی وجہ سے اپنوں پرایوں سے بُرا بھلا سنتے رہتے۔ لیکن ایک کان سے سن کر دوسرے سے اڑانے کا فن بھی جانتے تھے۔ آدمی ہنس مکھ اور نیک تھے۔ جب سے علاقہ میں فساد پھوٹ پڑا تھا، مولانا چپ چپ رہنے لگے۔ وہ اختر حسین کے گہرے دوستوں میں تھے۔ صورت حال کے بارے میں سوچ سوچ کر جب ان کو نیند نہ آتی تو اکثر کئی راتوں کو اختر حسین کے پاس آجاتے تو انہیں بھی جاگتا پاتے، پھر دونوں سر جوڑ کر صبح کر دیتے اچانک ایک دن خبر آئی کہ مولانا سلکھی میں قتل کر دیے گئے۔ کانگریسی حلقوں میں تو صف ماتم بچھ گئی۔ اختر حسین تو غصہ کے عالم میں اس ڈی او کو سخت سست کہہ کر چلے آئے۔ صوبائی کانگریس کے لیڈر بھی مولانا کی تعزیت کو بہار شریف آگئے۔ گاندھی جی نے بھی ان کے قتل پر اظہار افسوس کیا۔ المناک بات یہ تھی کہ ان کی لاش بھی نہیں مل سکی تھی۔ وہ تو ان کے کچھ ہندو ساتھیوں نے شہر میں آکر چشم دید واقعہ بیان کیا کہ جب مقامی حکام نے کانگریس کے وفد کو فساد زدہ علاقوں میں جانے کی اجازت نہیں دی تو مولانا نے خاموشی کے ساتھ تنہا وہاں جانے کا فیصلہ کر لیا۔ وہ بڑے پکے کانگریسی تھے ان کی شخصیت علاقہ بھر میں جانی مانی تھی۔ جب گاندھی جی نے کئی برس قبل علاقے کا دورہ کیا تھا تو وہ ان کے ساتھ ہر جگہ گئے تھے۔ انہیں یقین تھا کہ کوئی ان کا بال بیکا نہیں کر سکتا۔ گھر کے لوگوں اور کچھ دوستوں نے انہیں بہت منع کیا لیکن وہ نہیں مانے۔ فسادیوں نے جب انہیں سلکھی میں گھیر لیا تو خلاف معمول انہوں نے ان سے کافی دیر تک مناظرہ کیا۔ سلکھی کے کچھ ہندو کانگریسی کارکن بھی ان کی مدد کو آگئے اور فسادیوں کو مولانا کے سیکولر کردار کی دہائی دی۔ لیکن سب دلیلیں دھری رہ گئیں اور فسادیوں نے چشم زدن میں ان کا کام تمام کر ڈالا۔ مولانا کے قتل کے وحشیانہ قدم سے کانگریسیوں کے حوصلے بہت پست ہو گئے۔ اس صورت حال سے نمٹنے کیلئے اختر حسین اور

دوسرے کانگریسی لیڈروں نے شہر کے اندر کانگریس کی طرف سے ایک رلیف کیمپ قائم کیا، پارٹی کارکنوں کو نئے سرے سے منظم کیا، کئی کمیٹیوں کی تشکیل کی اور تقریباً سبھی کو رلیف کے کاموں میں مصروف رکھنے کی کوشش کی۔

اصغر حسین بھی اسلام پور سے بال بچوں سمیت بہار شریف آگئے تھے۔ اُن کا علاقہ اگرچہ ابھی تک محفوظ تھا لیکن کوئی کچھ نہیں کہہ سکتا تھا کہ کب کیا ہو جائے۔ مسلم لیگ نے بھی پٹنہ میں رلیف کیمپ کھول دیا تھا، ایک دفتر بہار شریف میں بھی کام کرنے لگا تھا۔ پٹنہ سے لوگ گاڑیوں میں بھر کر روز بہار شریف آتے اور رات ہی میں واپس ہو جاتے، شکر تھا کہ شہر اس مصیبت سے بچا ہوا تھا ورنہ شہر کے لوگ شہر میں اور دیہات کے دیہات ہی میں رہ جاتے۔ انگریز ٹامی فوجیں خصوصی طور پر فساد کو روکنے کے لیے بھیجی گئی تھیں۔ اونچے اونچے گھوڑوں پر سوار یہ گورے جب دیہاتوں میں پہنچے تو اپنے روایتی جنگلی رویہ سے اُنہوں نے ہندوستانیوں پر خاصا رعب ڈالا اور فساد میں کمی آئی۔

حالات کچھ درست ہو جانے پر مقامی حکام نے سیاسی جماعتوں کے وفود کو کچھ محدود شرائط کے ساتھ فساد زدہ علاقوں میں جانے کی اجازت دے دی۔ اختر حسین اپنے چند قریبی ساتھیوں کے ساتھ فوراً اُن علاقوں کے دورے پر روانہ ہو گئے۔ وہاں انہوں نے جو کچھ بھی دیکھا، وہ اس سے مختلف ثابت ہوا، جو وہ اب تک سنتے آرہے تھے۔ بستی کی بستی اُجاڑ دی گئی تھی اور ویرانے اپنی خاموش زبانوں سے اپنی زبوں حالی کی داستان سُنا رہے تھے۔ بہت سے زخمی ایسے تھے جنھیں اب تک کوئی طبّی امداد نہیں مل سکی تھی۔ طبّی امداد کی عدم فراہمی سے بے شمار مر چکے تھے۔ بہت سے گاؤں میں خاندان کے خاندان صاف کر دیے گئے تھے اور کوئی نام لیوا چھوڑا نہیں گیا تھا۔ لاشیں اِدھر اُدھر بکھری پڑی تھیں اور تعفن سے فضا سوگوار ہو رہی تھی۔ ٹرکوں سے بھر بھر کے شہر لے جانے کے بعد بھی ابھی ہفتوں کا کام باقی پڑا تھا۔ بدبو اس قدر تھی کہ مضبوط دل و دماغ والے ہی وہاں پر جا سکتے تھے۔ جو لوگ کسی نہ کسی طرح بچ گئے تھے اور وہ بھی یوں کہ مارنے والے نے تو اپنے طور پر اُنہیں مار ہی ڈالا تھا لیکن محض بچانے والے کی مرضی سے وہ بچ نکلے تھے، اُن کے پاس کہنے اور سُننے کو بے شمار داستانیں تھیں، جنھیں دیکھنے والا کوئی نہ تھا۔

دیہاتوں میں رہنے والوں نے بتایا کہ وہ بہت دنوں سے راتوں میں جھنکار کی آواز اور بجرنگ بلی کی جے کے نعرے سنتے آرہے تھے۔ جب انہوں نے ان کی بابت اپنے ہندو پڑوسیوں سے دریافت کیا تو پتہ چلا کہ دراصل مندروں میں راتوں کے وقت پوجا ہوتی ہے۔ پچھلے سال سوکھا

پڑ گیا تھا جس سے اکال کی کیفیت پیدا ہو گئی تھی، اس سال ایسا نہیں ہو، اسی لیے بھگوان سے پرارتھنا کی جا رہی ہے۔ آتے جاتے وہ کچھ نئے لوگوں کو بھی دیکھتے۔ اُن کے دل و دماغ میں یہ بات آتی کہ چونکہ گاؤں میں بہت، لڑکیاں جوان ہو گئی ہیں اس لیے اُن کے رشتے آتے ہوں گے۔ اچانک بے خبری میں اُن کے گاؤں گھیر لیے گئے۔ بجرنگ بلی کی جے کے نعروں سے فضا گونج اٹھی۔ وہ اپنی گہری نیند سے جاگے تو اس شور اور ہنگامے کو دیکھ کر انہوں نے سمجھا کہ شاید ڈاکو آ گئے ہیں اور سارے گاؤں کو لوٹنا چاہتے ہیں۔ انہوں نے جلدی جلدی اپنے ہتھیار نکالے۔ تلوار، بھالے، گنڈاسے، تیل پلائی ہوئی لاٹھیاں ـــــ لیکن جب بہت دیر تک انہیں کوئی لوٹنے نہیں آیا، نعرے بلند ہوتے رہے اور شور و ہنگامہ بڑھتا رہا تب کہیں جا کے اُن کی سمجھ میں آیا کہ وہ تو گھرے ہوئے ہیں اور کوئی دم میں مار لیے جائیں گے۔ اس کے بعد تو وہ چیخ و پکار مچی کہ بس۔ سبھی مرد ایک اونچے کوٹھے پر جمع ہو گئے۔ ایک دوسرے کے گلے لگ کر اور رو رو کر گناہ قصور معاف کروانے لگے۔ جو قبل سے مرید ہو چکے تھے، انہوں نے اپنے شجرے نکال کر اپنے سینوں پر باندھ لیے۔ جو حج کر آئے تھے، انہوں نے اپنے کفن کے کپڑے نکالے جنھیں وہ خانہ کعبہ سے چھلا کر لائے تھے۔ عورتوں سے اجتماعی طور پر کنوؤں میں کود جانے کو کہا گیا کہ موت عزت کا صدقہ ہے۔ چھوٹی بچیوں اور بچوں کو رحل کھول کر قرآن شریف کی تلاوت پر بیٹھا دیا گیا کہ جب ساری اُمیدیں ختم ہو جائیں گی تب انہیں تلواروں کے پل صراط کے سہارے خدا کے حضور میں روانہ کر دیا جائے گا۔ گاؤں کے لوگوں پر ابھی اُن کا بھروسا برقرار تھا کہ وہ اُن کے ساتھ برسہا برس سے رہتے سہتے، کھاتے پیتے آئے ہیں، اُن سے خون کا رشتہ نہیں ہے تو کیا ہوا، وہ تو اپنوں سے بڑھ کر ہیں۔ خود اُن کے گھروں میں دوسادھ، چمار اور بھوئیاں لڑکے بچپن سے کھیلتے جوان ہوئے تھے۔ وہ لڑکے اُن کے گھروں میں سگوں کی طرح رہتے تھے۔ انہوں نے اُن کے ہاتھوں میں بھی ہتھیار تھما دیے۔

حملہ آوروں نے جب دیکھا کہ اُن کے للکارنے پر کوئی بھی سامنے نہیں آ رہا تو اُن کے حوصلے بلند ہوئے اور وہ دندناتے ہوئے گھروں میں گھسنے کی کوشش کرنے لگے ـــــ دروازے اور پھاٹک گرنے لگے، چھپے ہوئے لوگ تو اپنا گناہ قصور معاف کروا ہی چکے تھے، انہوں نے موت کو قبول کرتے ہوئے اپنے ہتھیاروں اور وہ بھی نہیں رہے تو چھری اور پنکھے سے مقابلہ شروع کیا، عورتیں کنوؤں میں کود گئیں، بچوں اور بچیوں کو قتل کر دیا گیا ـــــ جن گھروں کے دروازے

نہیں گرے، وہاں کے مکینوں نے اپنی آنکھوں سے دیکھا کہ ان کے گھروں کے پلے ہوئے لڑکوں نے نہ صرف حملہ آوروں کے لیے گھروں کے دروازے کھول دیے بلکہ پوشیدہ عورتوں اور بچوں کی نشان دہی بھی کی ـــــ لگ بھگ ایک ہی قصّہ ہر گاؤں میں دہرایا گیا تھا۔ کہیں کہیں گاؤں والے بلا امتیاز ذات و مذہب سینہ سپر ضرور ہوئے تھے لیکن ایسے گاؤں کتنے تھے ـــ ؟ بین ایسے ہی گاؤں میں شامل تھا۔

فساد کے سلسلے میں یہ بات سننے میں آئی تھی کہ فساد کے موقع پر گاؤں کے ہندو غائب ضرور ہو گئے تھے اور انھوں نے مقامی طور پر فساد میں حصّہ نہیں لیا تھا۔ 'بیتیا' کے کارنامے ہر جگہ سنے گئے، لیکن اب جو لوگ 'بیتیا' ڈھونڈنے نکلے تو وہ اپنا کام کرکے حیرت انگیز طور پر غائب ہو چکے تھے۔ اختر حسین نے صوبائی کانگریس کے لیڈروں سے "بیتیا" کا ذکر کیا اور بڑے خفیف بھی ہوئے کیونکہ ہر آدمی ثبوت مانگتا تھا اور وہ ثبوت فراہم کرنے سے قاصر تھے۔ گاندھی جی جب فساد زدہ علاقوں کے دورے پر آئے تو اختر حسین نے ان سے بھی 'بیتیا' کے بارے میں کہا۔ گاندھی جی نے ان کو بہت ہی مخلصانہ مشورہ دیا کہ وہ کسی طرح بھی اُن پُرزوں کو حاصل کریں تاکہ دودھ کا دودھ اور پانی کا پانی کیا جا سکے۔ اختر حسین نے اس کے لیے بڑی تگ و دو کی کہ کم از کم ایک ہی پُرزہ انہیں مل جائے تاکہ وہ اپنی بات کی صداقت ثابت کرسکیں لیکن لاکھ کوشش کے باوجود وہ پُرزے انہیں کہیں نہ مل سکے۔ پتہ نہیں انہیں آسمان کھا گیا تھا یا زمین نگل گئی تھی۔ انہیں افسوس اس بات کا تھا کہ انھوں نے شروع میں ان پُرزوں کی اہمیت نہیں سمجھی تھی۔ شرم کے مارے وہ دوبارہ گاندھی جی سے نہیں ملے پروفیسر عبدالباری صوبائی کانگریس کے ایک بہت ہی ایماندار، صاف گو اور پرجوش لیڈر تھے۔ بہار میں مزدوروں کو منظم کرنے میں انھوں نے نمایاں کردار ادا کیا تھا۔ گاندھی جی جب فساد زدہ علاقوں کے دورے کے بعد صداقت آشرم میں مقتدر لیڈروں اور معزز شہریوں سے بات چیت کر رہے تھے تو پروفیسر عبدالباری نے بے دھڑک ان سے کہہ دیا کہ اس فساد میں صوبائی کانگریس کے چند بڑے لیڈروں کا ہاتھ ہے۔ گاندھی جی نے ان سے ثبوت مانگا۔ انہوں نے وعدہ کیا کہ وہ تین روز کے اندر انہیں ثبوت کی پوری فائل دے دیں گے۔ وہ اپنے صدر مقام جمشید پور سے آ ہی رہے تھے کہ بختیار پور ریلوے کراسنگ پر ما سور گورکھا نوجوان نے انہیں چیلنج کیا۔ وہ طیش میں آکر گاڑی سے اتر کر آگے بڑھے ہی تھے کہ اس نے انہیں گولی مار دی۔ رات بھر ان کی لاش وہیں پڑی رہی۔ صبح جب کچھ لوگوں نے انہیں

پہچان لیا تو ہر جگہ خبر ہوئی۔ اُن کی موت کے بعد لوگوں نے نام تو بہت سے لوگوں کا لیا لیکن ثبوت کسی کے پاس نہیں تھا جس کی عدم موجودگی میں کہنے والے خود ہی جھوٹے بن جاتے تھے۔

فساد کے بعد سب سے بڑا مسئلہ یہ اُٹھ کھڑا ہوا کہ جو پناہ گزیں کیمپوں میں تھے، وہ واپس جانے کو تیار ہی نہیں تھے۔ اگرچہ اُن کے کھیت، باغ اور مکانات وہاں موجود تھے۔ کانگریسی کارکنوں نے بہت کوشش کی کہ ان کے اندر اعتماد بحال ہو اور وہ واپس جا سکیں۔ اختر حسین اور اُن کے دوستوں نے علاقہ کے بہت سے لوگوں کے دستخط حاصل کیے کہ آئندہ وہ مسلمانوں کی حفاظت کے لیے تن من دھن لگا دیں گے۔ کچھ لوگ تو شہر آکر کیمپوں میں بھی گئے، لیکن پناہ گزیں اپنی ضد پر اڑے رہے۔ مسلم لیگی لیڈروں نے بار بار آکر انہیں دلاسا دیا تھا کہ ان کی قربانی رائگاں نہیں جائے گی۔ اب پاکستان کے قیام کو دنیا کی کوئی طاقت روک نہیں سکتی۔ وہ ہرگز اپنے گھروں کو واپس نہ جائیں۔ کچھ ہی دنوں کے بعد وہ ایک نئے ملک کے شہری بن کر انشاء اللہ پاکستان جائیں گے۔ اس سے پناہ گزیں تذبذب میں پڑ گئے۔ ان کے اندر جو بھی اعتماد بحال ہوا تھا، وہ بھی متزلزل ہو گیا۔ جن کیمپوں کو مسلم لیگ والے چلا رہے تھے، ان کا انتظام بہت اچھا تھا، کھانے پینے کا آرام بھی تھا، جب کہ دوسرے کیمپوں میں یہ بات نہیں تھی۔ گاندھی جی، نہرو، خان عبدالغفار خاں اور دوسرے کانگریسی لیڈروں کے دورے اور ہمدردانہ رویے اور بیانات سے فضا سازگار ہوتی جا رہی تھی۔ گاندھی جی نے جن جن دیہاتوں میں اپنی پرارتھنا سبھائیں کیں، ان میں شرکت کرنے والوں کی تعداد بڑھتی۔ لیکن ہوتا یہ تھا کہ کبھی مسلم لیگ والے پاکستان کا خواب دکھا دکھا کے پناہ گزینوں کو تھپک تھپک کے سلا دیتے۔ کبھی پنجاب اور بہار کے دوسرے علاقوں سے آنے والی قتل و خون کی بھیانک داستانیں انہیں عدم تحفظ کے احساس سے گھیر لیتیں اور وہ اپنے گھروں کو جانے سے رک جاتے۔

کانگریس نے اختر حسین کی سربراہی میں ایک انکوائری کمیٹی کی تشکیل کی۔ کانگریس کے ساتھ ایک خاص بات یہ تھی کہ اس کا معمولی سے معمولی کارکن بھی اپنے علاقہ کے لوگوں اور اس کے چپے چپے سے واقف تھا اس لیے ان لوگوں کو کوئی لائحہ عمل تیار کرنے میں بڑی آسانی ہوتی۔ اختر حسین کی کمیٹی میں کل ملا کے گیارہ افراد تھے۔ ان میں چھ ہندو اور پانچ مسلمان تھے۔ اختر حسین نے بہت ایمانداری کے ساتھ اپنا کام شروع کر دیا۔ کمیٹی کے ممبران پکے کانگریسی اور گاندھی بھگت تھے ان میں تین تو گاندھی جی کے ساتھ سابرمتی آشرم میں بھی رہ چکے تھے اور گاندھی جی کے تزکیہ نفس کے تجربے میں

شامل رہے تھے۔ کمیٹی کے افراد نے گاؤں گاؤں گھوم کر اعداد و شمار جمع کیے، نقصانات کا اندازہ لگایا۔ اپنی آنکھوں سے سب کچھ دیکھا، سچے واقعات اور کہانیوں کو اپنے اندر اُتارا۔ محنت کے ساتھ رپورٹ تیار کی گئی۔ اِس رپورٹ میں بہت سی نئی معلومات بھی تھیں۔ مثلاً یہ کہ اونچی ذات والوں نے جن میں اکثر زمین دار تھے، چاہے اُن کا تعلق کانگریس سے ہو یا مہا سبھا سے، فسادات کی منصوبہ بندی میں نمایاں کردار ادا کیا تھا۔ مسلمان گھروں میں پلے ہوئے لڑکوں کو روپیہ، سامان اور کھیت کی لالچ دے کر مخبری پر آمادہ کیا گیا۔ گاؤں کے لوگوں نے بے شک اپنے ہی گاؤں میں فساد میں حصّہ نہیں لیا لیکن ایک گاؤں کے لوگ، دوسرے گاؤں میں جا کر اس کارِ خیر میں شریک ہوئے۔ ہری جنوں کو خوب شراب پلائی گئی تھی اور اُن کے درمیان پیسے بانٹے گئے تھے۔ 'بنیوں' کا استعمال پیغام رسانی کے لیے ہوا تھا۔ دوسری طرف ایسے واقعات بھی بے شمار تھے کہ انفرادی طور پر ہندوؤں نے اپنی جان پر کھیل کر مسلمانوں کی جانیں بچائی تھیں، اُنھیں اپنے گھروں میں پناہ دی تھی۔ یہی وہ واقعات تھے جنھوں نے اختر حسین جیسے لوگوں کو ٹوٹنے سے بچا لیا تھا۔ اور اُن کا یہ یقین مزید مستحکم ہوا کہ وہ جس راستے پر جا رہے ہیں، وہی صحیح ہے۔

انکوائری کمیٹی کی جب آخری میٹنگ بلائی گئی تو پتہ نہیں کیوں ان میں سے چار ممبر اس میں شریک نہیں ہوئے۔ بعد میں اُن کی طرف سے یہ پیغام ملا کہ چونکہ وہ کمیٹی کی رپورٹ سے متفق نہیں ہیں، اس لیے اس سے استعفیٰ دے رہے ہیں۔ اختر حسین اور دوسرے ممبروں کو بہت تعجب ہوا کہ رپورٹ تو متفقہ طور پر تیار ہوئی تھی، کسی نے کبھی کوئی شکایت نہیں کی تھی۔ اگر کوئی شکایت ہوتی تو اُسے قبل ہی سامنے آجانا چاہیے تھا۔ اُن لوگوں کی سمجھ میں نہ آیا کہ آخر ایسا کیوں ہوا۔ بہت سوچ بچار کے بعد اُنھوں نے یہ فیصلہ کیا کہ ابھی کمیٹی کی میٹنگ ملتوی کر دی جائے اور اُن لوگوں سے ملاقاتیں کرکے اختلافات دور کر لیے جائیں۔ اتفاق یوں ہوا کہ اُن چاروں سے اختر حسین کی ملاقات ہی نہ ہو سکی۔ وہ جب بھی کوشش کرتے تو پتہ چلتا کہ وہ لوگ شہر سے باہر ہیں۔ اِدھر رپورٹ جمع کرنے میں تاخیر ہو رہی تھی۔ اختر حسین کے ایک گہرے دوست اجودھیا پرشاد سے اُن میں ایک کی ملاقات اچانک منی رام اکھاڑے میں ہو گئی تو اُس نے انھیں بتایا کہ اُسے اسی سماج میں رہنا ہے، مسلمانوں کی طرح پاکستان نہیں چلے جانا، اِس لیے وہ ایسی رپورٹ پر اپنا دستخط نہیں کر سکتا جس سے وہ اپنی ہی قوم میں معتوب ہو جائے۔ اجودھیا بابو نے اُسے بہت سمجھایا، لعن طعن بھی کیا لیکن وہ راضی نہ ہوا۔ مجبور ہو کر اختر حسین نے باقی ممبروں کے دستخط سے رپورٹ، صوبائی کانگریس کے صدر کے پاس جمع کر دی جنھوں نے وعدہ کیا کہ وہ اِس

رپورٹ کو مرکزی کانگریس کے اجلاس میں رکھیں گے۔

مسلم لیگ نے کوئی کمیٹی وغیرہ تو نہیں بنائی البتہ اُن کے اخبارات کے کالم بے پناہ قسم کی خبروں سے بھرے رہتے۔ کم سن لڑکے چیخ چیخ کر، گلی کوچوں میں یہ اخبارات بیچتے رہتے اور اُن کی خوب بکری ہوتی۔ کئی معمولی اخبارات کے مالک تو راتوں رات لکھ پتی بن گئے، اُن کے اپنے پریس ہو گئے اور اُن کے اخبارات کی اشاعت کئی گنا بڑھ گئی۔

۶

اصغر حسین، وقتی طور پر ضرور بہار شریف آ گئے تھے لیکن وہ مستقل طور پر اسلام پور کو نہیں چھوڑ سکتے تھے۔ وہاں زمین جائداد کے علاوہ اُن کی ایک حیثیت تھی۔ یوں تو اسلام پور فساد سے محفوظ رہا تھا، لیکن چاروں طرف تناؤ کی وجہ کر عدم تحفظ کا احساس روز بہ روز توانا ہو رہا تھا۔

اصغر حسین کے بہار شریف چلے جانے کے بعد تو لوگوں نے اپنی آنکھوں سے نظر نہ آنے والے احساس کو دیکھا۔ اصغر حسین، حالات درست ہو جانے کے بعد جب واپس لوٹے تو گاؤں کے لوگوں نے اُنہیں گھیر لیا۔ اُن کی واپسی سے جہاں لوگ خوش تھے تو وہاں کچھ ناراض بھی کہ وہ عین موقع پر ان کا ساتھ چھوڑ گئے۔ اصغر حسین جذباتی آدمی تھے۔ وہ گاؤں والوں کی محبّت سے متاثر ہوئے۔ سچی بات تو یہ ہے کہ وہ خود اس وقت گاؤں چھوڑ کر جانا نہیں چاہتے تھے جب وہاں اُن کی سخت ضرورت تھی۔ لیکن وہ بال بچوں والے آدمی تھے، پھر بی بی صاحبہ نے اُنہیں بلانے کے لیے خاص طور پر بہار شریف سے آدمی بھیجا تھا۔

اس سے قبل اصغر حسین ہر گھڑی میں گاؤں والوں کے ساتھ رہے تھے۔ ایک بار وہاں زبردست سیلاب آ گیا تھا تو اُنہوں نے نشیبی علاقوں کے لوگوں کو اپنی کوٹھی میں پناہ دی تھی۔ اُن کے کھانے پینے اور دوسری ضروریات کا انتظام کیا تھا۔ گاؤں میں جب بھی کچھ ہوتا یا ہونے والا ہوتا تو لوگ اصغر حسین ہی کے پاس دوڑتے۔ ایک بار زلزلے کی خبر اُڑ جانے سے وہاں خاصا ہراس پھیل گیا تو اصغر حسین نے اپنی وسیع و عریض کوٹھی کے پھیلے ہوئے لان میں ایک بڑا شامیانہ لگوا کر اُنہیں وہاں پناہ دی۔ اور گاؤں والوں کے ساتھ رات بھر جاگتے رہے۔ زلزلہ تو نہیں آیا، کیونکہ یہ لوگوں کی

عادت سی ہو گئی تھی کہ وہ ۱۹۳۴ء کے بعد تقریباً ہر سال زلزلے کا انتظار کرتے۔ البتہ اصغر حسین نے ان کے دلوں میں گھر کر لیا تھا۔

گاؤں چھوڑنے کے فیصلے سے قبل وہ بڑے تذبذب کا شکار رہے تھے۔ فسادات کی آگ اسلام پور کے آس پاس سلگتی رہی تھی اور کسی وقت بھی کوئی چنگاری وہاں پہنچ کر سارے گاؤں کو خس و خاشاک میں بدل سکتی تھی۔ سرور حسین نے بھی پٹنہ سے کئی خط لکھ کر ان پر زور ڈالا تھا کہ ایسی کشیدہ فضا میں بچوں کے ساتھ وہاں رہنا ہرگز مناسب نہیں خود بہار شریف کے فساد زدہ علاقوں میں انہوں نے اپنی آنکھوں سے دیکھا تھا کہ بعض افراد محض اپنی مرغیوں، بطخوں اور بکریوں کے خیال سے گھر بار چھوڑ کر نہیں گئے اور مارے گئے۔ بعض کو مٹی کی کوٹھیوں میں رکھے ہوئے چند من غلہ کی محبت نے مروا دیا۔ بی بی صاحبہ اور گھر کے بھی لوگوں کو انڈا والی بوا کی بے بس موت کا بہت افسوس تھا۔ وہ ہر ہفتہ دیہاتوں سے ان کیلئے ٹوکری میں انڈے بھر کے لاتی تھیں اور گھنٹوں بیٹھ کر دنیا جہان کی باتیں کرتیں۔ جب گاؤں کے لوگ جان بچا کر بھاگنے لگے تو بوا محض اپنی مرغیوں اور اپنی جمع پونجی انڈوں کی وجہ سے نہیں بھاگ سکیں اور انہیں کے ساتھ مکان کے اندر جلا کر راکھ کر دی گئیں۔ بی بی صاحبہ رہ رہ کے ان کی موت پر آنسو بہاتی تھیں۔ پٹنہ میں جس محلہ میں اصغر حسین نے مکان خریدا تھا وہاں مسلمانوں کی آبادی نہیں کے برابر تھی ایک نوکر وہاں مکان کی رکھوالی کرتا تھا۔ اصغر حسین جب پٹنہ جاتے، تب ہی اس مکان میں رونق آتی۔ لیکن ان کی کوششوں کے باوجود سرور حسین کرایہ کا مکان چھوڑ کر اس میں آنے کو تیار نہیں ہوئے تھے۔ وہ کرایہ کے مکان میں خوش تھے اور مکان کی خوش قسمتی پر بھی انہیں کچھ یقین سا ہو چلا تھا۔ ان کا شمار پٹنہ کے مشہور اور ممتاز وکیلوں میں ہونے لگا تھا اور اس بات کا چرچا تھا کہ آزادی ملنے کے بعد وہ ہائیکورٹ کے جج بنا دیے جائیں گے۔

اصغر حسین نے فی الحال بچوں کو بہار شریف ہی میں چھوڑ دیا۔ وہاں مسلمانوں کی تعداد خاصی تھی، شہر کے اندر فساد کا کوئی خطرہ بھی نہیں تھا۔ اصغر حسین نے اپنے مستقبل کیلئے کیا پروگرام بنایا تھا، اس کے بارے میں کسی کو خبر نہیں تھی وہ اپنا منصوبہ کسی پر ظاہر نہیں کرتے تھے اور جب اس پر عمل کر گزرتے تب لوگوں کو پتہ چلتا۔ انہوں نے مسلم لیگ کے ریلیف کیمپ کا کام سنبھال لیا جو پٹنہ میں کھلا ہوا تھا۔ کانگریسی کارکنوں کی کوششوں سے بہت سے افراد واپس اپنے گھروں کو

چلے گئے تھے کیوں کہ رلیف کیمپ میں کھانے کو اب کچھ بچا نہیں تھا اگرچہ حالات اب پُرسکون تھے پھر بھی ڈر، خوف اور عدم اعتماد کی فضا بدستور قائم تھی۔ کچھ لوگوں نے دیہاتوں میں اپنی زمینیں بیچ کر شہر میں مکان اور زمین خریدنے کا پروگرام بنایا۔ ان کے زمینوں کی جو قیمت خریدار نے طے کردی، اسے انہوں نے بے چوں چرا تسلیم کرلیا یہ جاننے کے باوجود کہ قیمت بہت کم مل رہی ہے لیکن اس کے سوا کوئی چارہ ہی نہ تھا۔ شہر میں انہیں ہر حال میں زمینیں خریدنی تھیں۔ شہر میں زمینوں کی قیمت روز بروز چڑھتی جارہی تھیں۔ زمینیں کم تھیں اور خریدار بہت تھے ایک مقابلہ کی کیفیت پیدا ہوگئی تھی۔

اختر حسین اور ان کے دوستوں کو اس صورت حال سے بہت تشویش تھی۔ وہ جانتے تھے کہ دیہات کے سارے مسلمان شہر میں آکر نہیں بس سکتے۔ اور پھر اس سے معیشت کے تباہ ہونے کا بھی اندیشہ تھا، اس پر بھی ان کی نگاہ تھی۔ مسلمانوں کی بنیادیں اکھڑ رہی تھیں۔ ایک ہندوستانی، شہر میں کتنا ہی آسودہ حال کیوں نہ ہو جائے، وہ دیہات سے اپنا گہرا تعلق بنائے رکھتا ہے۔ اس کے بغیر وہ اپنے آپ کو اکھڑا اکھڑا سا محسوس کرتا ہے بہت غور و فکر کے بعد ان لوگوں نے یہ طے کیا کہ وہ دیہاتوں میں جاکر دونوں فرقوں کے لوگوں سے ذاتی طور پر ملیں گے اور انہیں قائل کریں گے کہ اعتماد کی فضا قائم کرکے وہ خود بھی وہاں رہیں اور دوسروں کو بھی رہنے دیں اگرچہ اس مہم میں زیادہ کانگریسیوں نے دلچسپی نہیں لی، پھر بھی اس کا نتیجہ خاطر خواہ نکلا۔ زمینوں کا بکنا کم ہوا اور لوگ دیہاتوں میں رہنے لگے۔

۷

ملک میں کرپس مشن آیا، کیبنٹ مشن پلان آیا۔ عام لوگوں کو بس ان سے اتنی ہی واقفیت ہوئی جتنی کچھ ان کے مسلک کے لیڈروں نے انہیں بتایا۔ البتہ پڑھے لکھے لوگوں نے ان سے خوب خوب لطف اٹھایا۔ اختر حسین کے بنگلے پر روز شام کے وقت ان کے ساتھی جمع ہوتے اور خوب زوردار لمبی لمبی بحثیں ہوتیں۔

شہر میں نئی نئی بجلی آئی تھی۔ اختر حسین نے ایک سو پاور کا بلب باہر لگوا دیا تھا جس کے جل اٹھنے سے ساری فضا روشن ہو اٹھتی۔ لالٹین کی پیلی بیمار روشنی میں باتیں کرنے میں وہ لطف ہرگز نہیں تھا

جو بجلی کی روشنی میں آتا ـــــــ لوگوں کا خیال تھا کہ یہ مشن پاکستان بنوانے کے لیے یہاں آ رہے ہیں کیوں کہ اب انگریز کی سمجھ میں آ گیا ہے کہ پاکستان بنوانے ہی میں اُن کا فائدہ ہے۔ لیکن اختر حسین اور اُن کے ساتھیوں کا یہ یقین تھا کہ پاکستان کبھی نہیں بن سکتا۔ آزادی کی لڑائی ملک کی تقسیم کے لیے نہیں بلکہ ایک مشترکہ قومیت کی بنیاد رکھنے کے لیے لڑی گئی ہے۔ گاندھی جی کہہ چکے تھے کہ پاکستان اُن کی لاش پر ہی بن سکتا ہے۔ جب کہ گاندھی جی نے اپنا یہ بیان واپس نہیں لیا تھا تو پھر پاکستان کا قیام کیوں کر ممکن تھا۔ کانگریسیوں کا اب تک کا یہ تجربہ تھا کہ گاندھی جی نے کبھی جھوٹ نہیں بولتے، وہ اپنی بات سے کبھی مکرے نہیں تھے۔ اگر کبھی وہ نہیں بولنا چاہتے تو خاموشی کا برت رکھ لیتے۔ مولانا آزاد نے محض کانگریس دوستی اور دو قومی نظریے پر انکار سے ہی اپنوں سے گالیاں سُنی تھیں۔ اُنھیں گاندھی جی، نہرو اور کانگریس پر پورا اعتماد تھا۔

اصغر حسین جب بھی بہار شریف آتے تو اپنی جماعت کی سیاسی سرگرمیوں کا مرکز بن جاتے۔ اُن کی حویلی میں مسلم لیگی جمع ہوتے اور ملک کی سیاسی صورت حال پر زور شور سے تبادلہ خیال ہوتا۔ وہ لوگ بڑے خوش تھے کہ پاکستان بننے سے اب کوئی طاقت روک نہیں سکتی۔ مسلمانوں نے یہاں سات سو سال تک حکومت کی ہے، وہ ہندوؤں کی حکومت میں نہیں رہ سکتے۔ عبوری حکومت میں رہ کے مسلمانوں نے دیکھ لیا کہ ہندو اُن کے کتنے دوست ہیں۔ پھر ہندو، دوست بھی کیسے ہو سکتے ہیں، خود اللہ تعالیٰ نے فرمایا ہے کہ کافر تمہارے دوست نہیں ہو سکتے۔ پاکستان تو اب بن کے رہے گا۔ پنجاب، یوپی اور بہار کے مسلمانوں کا خون رائگاں نہیں جائے گا۔ مولانا آزاد نے ہندوؤں کی دوستی میں اپنی عاقبت خراب کر لی۔ ابھی تو مسلمان اُن کو گالیاں دے رہے ہیں۔ کل ہندو، اُن کی داڑھی نوچیں گے، تب اُنہیں پتہ چلے گا۔

محفل برخاست ہونے کے بعد کھانے اور نماز سے فارغ ہو کے اصغر حسین اندر عورتوں میں جا بیٹھتے۔ پان کا بٹّہ سامنے رکھ کے وہ پاکستان کا یوں نقشہ کھینچتے کہ عورتوں کو یقین ہو جاتا کہ جب وہ صبح اُٹھیں گی تو پاکستان دیکھیں گی۔ اصغر حسین کی چھوٹی بہن کو ایک بار صبح کے ابھرتے ہوئے سورج میں پاکستان کا سبز جھنڈا نظر آیا تو سبھی لوگ عش عش کر اُٹھے اور کلمہ کا ورد کرنے لگے۔

اصغر حسین کو بہت افسوس ہوتا کہ بھائی جان، کافروں کی دوستی میں اپنی دین و دُنیا دونوں برباد کر رہے ہیں۔ پاکستان کوئی انسان تھوڑی ہی بنوا رہا ہے، وہ تو خدائے بزرگ و برتر کی

ہستی ہے، جس نے یہ عظیم فیصلہ کیا ہے۔ گاندھی اور نہرو کیا، مولانا آزاد تک کی اس کے سامنے کوئی ہستی نہیں ہے تو یہ بچارے بھائی جان کیا ہیں ۔۔۔ رات گئے تک ان کی تقریر کا سلسلہ جاری رہتا۔

اختر حسین تو یوں بھی بلا ضرورت اندر نہیں جاتے تھے۔ کسی مقصد کے لیے انہیں بلایا جاتا تب ہی جاتے اور پھر عورتوں سے وہ سیاسی گفتگو کبھی نہیں کرتے تھے۔ ان کی بیوی جانتی تھیں کہ وہ کانگریس کے خلاف نہیں سن سکتے۔ ان کو افسوس بھی ہوتا کہ ہندوؤں کی دوستی میں انہوں نے خواہ مخواہ سب کی دشمنی مول لے رکھی ہے۔ لیکن وہ شوہر کو غلط ماننے پر بالکل تیار نہیں تھیں بی بی صاحبہ اصغر حسین کی باتوں کو تو سچ مانتیں لیکن اصغر حسین کے خلاف بھی کوئی بات انہیں بہت بُری لگتی۔ وہ ان میں اپنے شوہر کا دل و دماغ پاتی تھیں۔ گھر کا کوئی فرد اختر حسین کے سامنے زبان کھولنے کی ہمت نہ کرتا تھا، البتہ اصغر حسین سے ان کی بات چیت لگ بھگ بند تھی، کبھی سامنا ہو جاتا تو سلام کلام سے آگے بات نہ بڑھتی۔ یوں بھی ان کی کسی سے بے تکلفی نہیں تھی۔ سرور حسین سے تھی تو ان سے قطع تعلق ہی ہو چکا تھا۔

۸

وہ خبر آ ہی گئی جس کا بہت بہت انتظار تھا۔ ہندوستان آزاد ہوا، اس سے ایک دن قبل پاکستان بن گیا۔ کانگریس نے تقسیم ملک کی تجویز کو منظوری دے دی۔ بہار شریف میں اس خبر سے ایک عجیب سی فضا طاری ہو گئی۔ سارے مسلم لیگی دوڑ دوڑ کر ایک جگہ جمع ہوئے ایک دوسرے کو مبارکباد دی گئی مٹھائیاں تقسیم ہوئیں، مولانا آزاد پر خوب پھبتیاں کسی گئیں۔ اصغر حسین اس روز پٹنہ میں تھے، مگر شام ہوتے ہوتے وہ لوٹ آئے۔ ایک جم غفیر انکے یہاں جمع ہو گیا اور مبارک سلامت سے ساری فضا گونجنے لگی۔ کانگریس کے وہ کارکن جو گاندھی جی کو سچا اور مولانا آزاد کو پکا سمجھتے تھے، سخت مایوسی کے عالم میں تھے۔ گاندھی جی نے کہا تھا کہ پاکستان ان کی لاش پر ہی بن سکتا ہے، لیکن وہ زندہ تھے اور پاکستان کو ناگزیر کہہ رہے تھے۔ سب سے زیادہ مولانا آزاد کی مٹی پلید ہوئی تھی۔ وہ اپنی لڑائی ہار چکے تھے لیکن کانگریس اُنکی ایک

متبرک قبر کی طرح پوجا کروانے کا ارادہ کیے ہوئے تھی۔ اختر حسین اس روز اپنے کمرے سے باہر نہیں نکلے۔ اُن کے دوست بھی ان کے یہاں نہیں آئے۔ حالانکہ ملک کی آزادی کا بگل بھی بج اتھا۔ کانگریس کے ہندو کارکن تو خوش تھے لیکن مسلمان کارکن سخت مایوس اور شکست خوردہ۔ انہوں نے پاکستان کی مخالفت کر کے اپنوں سے گالیاں سنی تھیں اور اب پاکستان بن گیا تھا۔ رہی بات ہندوستان کے آزاد ہونے کی، تو اسے تو آزاد ہونا ہی تھا۔ یہ یقین تو وہ اپنے اندر کئی برس قبل ہی بٹھا چکے تھے اور اسی لیے وہ کسی دوسرے یقین کو اپنے اندر جگہ دینے کو ہرگز تیار نہیں تھے۔ لیکن ان کے یقین پر بے یقینی حاوی ہو گئی تھی اور ایک ایسی حقیقت سامنے آگئی تھی جس سے انکار ممکن ہی نہیں تھا۔

۹

اصغر حسین نے پاکستان بنتے ہی یہ محسوس کر لیا تھا کہ اب ان کا ہندوستان میں رہنا ممکن نہیں۔ مسلم لیگ کا پرجوش اور کھلے انداز میں ساتھ دے کر اگر انہوں نے پاکستان میں اپنی جڑیں بنا لی ہیں تو ساتھ ہی ہندوستان میں اپنی جڑیں کمزور بھی کر لی ہیں۔ وہ پاکستان جانے کی تیاریوں میں لگ گئے۔ دیہاتوں کے بے شمار افراد پاکستان جانے کے لیے پر تول رہے تھے کانگریسی کارکنوں کی محنت کے صلے میں جن لوگوں کے اندر اعتماد مضبوط ہوا تھا، وہ پاکستان کی خبر آتے ہی ایک ہی جھٹکے میں ٹوٹ گئے۔ ان کی زمینوں اور جائداد کے دام مل رہے تھے اور اگرچہ کم مل رہے تھے لیکن انہیں تو ہر حال میں پاکستان جانا تھا۔

اصغر حسین نے اپنے تقریباً سبھی کھیت بیچ دیئے، باغات بیچ دیے، پٹنہ کی کوٹھی بیچ ڈالی۔ ان کے ہاتھوں میں کئی لاکھ روپے آگئے۔ زمینداری ابھی باقی تھی۔ انہوں نے اپنے بیٹے کو، جو گونگا تھا، اپنا وارث بنایا۔ وہ تو اسلام پور کی حویلی بھی بیچ ڈالتے لیکن کوئی دام ہی دینے کو تیار نہیں ہوا۔ "وھائٹ ہاؤس" کا علاقہ بھر میں چرچا رہا تھا اور لوگوں کے دل میں یہ بات بیٹھ گئی تھی کہ وہ کوٹھی نہیں خرید سکتے۔

اصغر حسین نے اپنی جائداد کے سلسلے میں اپنے گھر والوں سے کوئی مشورہ نہیں کیا تھا۔

جب بی بی صاحبہ کو پتہ چلا تو وہ ششدر رہ گئیں۔ جب وہ ان کے سامنے پاکستان کا نقشہ کھینچتے تھے تو وہ خوش ضرور ہوتی تھیں لیکن یہ بات ان کے تصوّر میں بھی نہیں آئی تھی کہ خود ان کے بچے بھی پاکستان جا سکتے ہیں۔ انہوں نے اصغر حسین کو روکنے کی ہر ممکن کوشش کی، لیکن وہ تو اپنی کشتیاں جلا چکے تھے۔ جانے کے سوا ان کے پاس کوئی چارہ ہی نہ تھا اور پھر تو وہ اپنے خوابوں کی وادی میں جا رہے تھے۔ انہوں نے بی بی صاحبہ کو بھی سب کچھ بیچ باچ کر پاکستان چلنے کا مشورہ دیا جسے سن کر بی بی صاحبہ کو لگا جیسے کوئی انہیں اپنے شوہر سے الگ کر رہا ہو۔ یہ بات ان کی برداشت سے باہر تھی۔ غم و غصّہ کے مارے وہ ایک لفظ نہیں بول سکیں اور بے بسی سے رونے لگیں۔ تب اصغر حسین نے سمجھایا کہ بے شک پاکستان دور ضرور ہے لیکن اب سفر بیل گاڑی سے نہیں ہوتا۔ وہ اگر نہیں جانا چاہتیں تو نہ جائیں، وہ برابر یہاں آتے رہیں گے۔ اس لیے اب گھبرانے کی ضرورت نہیں۔

اصغر حسین کے جانے کی خبر جب سرور حسین کو ملی تو وہ سخت پریشان ہوئے۔ وہ بھائی سے محبت ہی نہیں کرتے بلکہ ان پر جان چھڑکتے تھے۔ بھائی کے بچے انہیں بہت عزیز تھے اور اگرچہ اب وہ بھی ایک بیٹی کے باپ بن گئے تھے لیکن بھتیجوں، بھتیجیوں سے ان کی محبت میں کمی نہ آئی تھی۔ یہ تصور بھی ان کے لیے سوہانِ روح تھا کہ سب ان سے چھوٹ جائیں گے وہ تو چند روز کی جدائی بھی برداشت نہیں کر سکتے تھے۔ انہوں نے جب اصغر حسین کا ارادہ اٹل دیکھا، ان کی تیّاریاں دیکھیں تو انہوں نے بھی وہاں جانے کا مستحکم ارادہ کر لیا۔ یوں بھی بی بی صاحبہ کی ناراضگی انہیں ذہنی طور پر اپنے گھر بار سے اکھاڑ چکی تھی۔ سرور حسین کے جانے کے بارے میں اصغر حسین کو معلوم ہوا تو انہوں نے بھائی کو سمجھایا۔

بھیّا آپ کی پریکٹس یہاں جمی ہوئی ہے کسی دن بھی آپ جج ہو سکتے ہیں آپ کا یوں سب کچھ چھوڑ چھاڑ کے جانا مناسب نہیں۔

لیکن میں تمہاری اور بچّوں کی جدائی برداشت نہیں کر سکتا۔

"نثار میاں تو یہیں رہیں گے۔"

"نثار میاں سب کا بدل تو نہیں ہو سکتے۔"

"بچّے برابر وہاں سے آتے رہیں گے۔"

"بس چھ مہینہ پر ہی نا ــــــــ اتنے دن میں کیسے برداشت کروں گا۔"

"آپ بھی چلے جائیں گے تو پھر سب بھائی بہن، اماں ــــ جائداد کا کیا ہوگا۔؟"

"اماں تو یوں بھی مجھ سے ناراض ہیں، شکل تک دیکھنے کی روادار نہیں' بھائی۔ بہن بھی مجھ سے دُور ہیں۔ جائداد بھائی جان دیکھتے ہی ہیں۔ اس میں کون دخل دے سکتا ہے۔"

اصغر حسین نے جب بھائی کا ارادہ بھی اٹل دیکھا تو خاموش ہو گئے۔ مشکل دراصل یہ تھی کہ وہ لاکھوں لے کر پاکستان جا رہے تھے جب کہ سرور حسین کے پاس ایک پیسہ بھی نہیں تھا.. وہ جو کچھ بھی کماتے' خرچ کر دیتے۔ ہاتھ کھلا ہوا تھا اور جمع کرنے کی بات ذہن میں آتی ہی نہ تھی۔ پٹنہ میں رئیسوں جیسے ٹھاٹ باٹ سے رہتے۔ رات دن دعوتیں ہوتی رہتیں ــــــ وکالت اُن کے ہاتھ کا ہنر بن گئی۔ اُنہوں نے سوچ رکھا تھا کہ پاکستان جا کر وہاں بھی اپنی پریکٹس جمالیں گے۔

اصغر حسین' سرور حسین کو جانے سے تو نہ روک سکے لیکن انہیں اس پر راضی کر لیا کہ وہ چند ماہ کے بعد وہاں جائیں تاکہ پہلے وہ وہاں جا کر اپنے قدم جما سکیں۔ اس پر سرور حسین نے فوراً یہ تجویز رکھ دی کہ پھر وہ بیوی، بچّوں کو چھوڑ کر جائیں' بعد میں سب کو لے کر وہ آئیں گے۔ اصغر حسین کے پاس اسے مان لینے کے سوا اور کوئی چارہ نہیں تھا ـــــــ

جانے سے قبل وہ سبھی رشتہ داروں سے مل رہے تھے لیکن اختر حسین سے ملنے میں اُنہیں خاص جھجک محسوس ہوئی۔ وہ اچھی طرح جانتے تھے کہ بغیر کسی تبصرہ کے وہ انہیں بالکل نارمل طریقے سے رخصت کریں گے، پھر بھی وہ کئی روز تک اُن سے ملنے کے لیے سوچتے رہے۔ ملنا بھی ضروری تھا۔ آخر دل کڑا کر کے وہ اُن کے پاس چلے ہی گئے۔ اختر حسین نے جب اُن کے بارے میں سُنا تو اُن کے چہرے پر کوئی تاثر نہیں آیا جیسے وہ اس کے متوقع ہوں۔ اصغر حسین سے اُن کی زیادہ باتیں نہیں ہوئیں۔ رخصت ہو۔ تب تک اُنہوں نے بس اتنا ہی۔ "جہاں رہیے خوش رہیے، بس یہی میری دعا ہے۔"

اُن کی آنکھوں کے سامنے ایک اصغر حسین ہی نہیں، بے شمار مسلمان گھوم رہے تھے جو اپنی جائداد مال واسباب بیچ کر پاکستان بھاگ رہے تھے۔ انہوں نے اپنی حد تک بہت کوشش بھی کی کہ یہ سلسلہ کسی طرح بند ہو لیکن اب کوئی بھی اُن کی سُننے کو تیار نہیں تھا۔ لاکھ کی جائداد ہزار میں بک رہی تھی اور بیچنے والا ہنس کر بیچ رہا تھا۔

لوگ بتاتے کہ پاکستان جانا بہت آسان ہے، ٹرین کا سیدھا راستہ ہے۔ وہ تو چند دنوں کے بعد یہ راز کھُلا کہ دراصل ایک آگ کا دریا ہے جسے پار کرکے پاکستان ملتا ہے۔ اس راستہ کو پُل صراط سمجھ کر اختیار کر لیا گیا تھا۔ کچھ لوگ رشتہ داروں کے ساتھ دور تک گئے تھے اور واپس آکر انہوں نے جو رپورٹ دی وہ بہار شریف کے علاقہ سے بہت مختلف نہیں تھی۔ وہ لوگ اپنے رشتہ داروں کو خدا کے سپرد کر آئے تھے۔ فسادات کے بعد جو فضا تیار ہوئی تھی، وہ اب مفقود ہو چکی تھی۔ جانے والوں کی جائداد اور مال واسباب کی سوچی سمجھی قیمت لگائی جا رہی تھی۔

اختر حسین اور اُن کے ساتھیوں کے لیے یہ صورت حال ایسی تھی جس سے سمجھوتہ کرنا اُن کے لیے ممکن نہیں تھا۔ اختر حسین نے صورت حال کی ایک تفصیلی رپورٹ تیار کی اور اس کی کاپیاں گاندھی، نہرو اور مولانا آزاد کو بھیج دیں۔ وصولیابی کی رسید تو انہیں نہیں ملی، لیکن چند ہفتوں کے بعد جواہر لال نہرو کا بہار کے دورے کا پروگرام بن گیا۔ اُن کے جلسے کے خوب اعلانات ہوئے۔ کانگریس کارکنوں نے اس کی بھرپور کوشش کی کہ دیہاتوں سے زیادہ سے زیادہ افراد اس میں شریک ہوں۔ اس وقت تک جلسوں میں ٹرکوں سے، آدمی خرید کر لانے کا رواج پیدا نہیں ہوا تھا۔ نہرو جی جب جلسے میں پہنچے تو وہاں آدمیوں کا ایک ٹھاٹھیں مارتا ہوا سمندر تھا۔ ایک میلے کی کیفیت تھی۔ ضلع کانگریس کے صدر کی حیثیت سے اختر حسین اس کی صدارت کر رہے تھے۔ نہرو نے صاف صاف کہا کہ جو ہونا تھا، وہ ہو گیا۔ ملک کی تقسیم کی ذمہ داری نہ ہندوؤں کی ہے اور نہ مسلمانوں کی، یہ کام تو انگریز نے کیا، اس نے ہندو مسلمان دونوں کو اپنا آلہ کار بنایا۔ جن کو جانا تھا وہ جا چکے، جو لوگ رہ گئے ہیں، وہ بھارت کے شہری ہیں، انھیں یہیں رہنا ہے، ہمارے ساتھ جینا اور مرنا ہے، اگر کوئی انہیں غدار اور غیر ملکی سمجھتا ہے تو وہ ملک کا دشمن ہے۔ انہوں نے کانگریسیوں کے گھر بیٹھ

جانے پر بہت ڈانٹ پھٹکار کی۔ ان کی تقریر کے دوران کئی بار نعرہ تحسین بلند ہوئے اور جب آخر میں انہوں نے 'جے ہند' کہا تو بلاامتیاز سارے مجمع نے ان کا ساتھ دیا۔

نہرو کے دورے سے کانگریسیوں میں ایک نئی زندگی شروع ہوئی۔ کانگریس کے لیے اب میدان کھلا تھا۔ مسلم لیگ کے دفتروں پر ایسے جناتی تالے لگ گئے تھے جن کی قسمت میں کھلنا نہیں لکھا تھا۔ اختر حسین کی سربراہی میں ایک بار پھر کانگریسیوں کی جماعت دیہاتوں کا دورہ کرنے کو تیار ہوئی۔ یہ دیکھ کر انہیں بہت خوشی ہوئی کہ اب بھی وہاں کافی مسلمان بسے ہوئے تھے اور ان کا ارادہ یہیں رہنے کا تھا۔ اگرچہ وہ حفاظتی جتھے بنا کر رہ رہے تھے جو راتوں کو جاگ کر پہرے دیتے۔ دراصل جانے والوں نے جاتے جاتے ان کے اندر عدم تحفظ کا احساس اس طرح کوٹ کوٹ کر بھر دیا تھا کہ وہ چلتے پھرتے، کھاتے پیتے، ہنستے کھیلتے ہوئے بھی زندہ نہیں لگتے تھے۔ اختر حسین کا پہلے بھی یہی خیال تھا اور اب تو انہوں نے اپنی آنکھوں سے جا کر دیکھ لیا تھا کہ گئے وہی تھے جن کی جیبوں میں نئے ملک کی زندگی کے کھرے دام تھے۔

وہ لوگ جو کھیتوں، ملوں میں کام کرتے، بیڑیاں بناتے اور آج کما کھا کر کل کی فکر کل ہی پر چھوڑ دیتے ان لوگوں نے مسلم لیگ کی حمایت بھلے ہی کی ہو لیکن دوسرے ملک کا خواب دیکھنے کی سکت ان میں ہرگز نہیں تھی۔ وہ وہیں پر رہ گئے تھے جہاں کل تھے، البتہ یہ ضرور ہوا کہ ان کو اپنے مقصد کے لیے استعمال کرنے والے دماغ ان کو چھوڑ کر جا چکے تھے پوری کی پوری گاڑی پٹری پر کھڑی تھی، لیکن انجن اس سے الگ ہو کر کہیں گم ہو چکا تھا۔

کانگریس کے لیے یہ ایک سنہرا موقع تھا۔ جو لوگ گمراہ کیے گئے تھے، انہیں راہ راست پر لایا جا سکتا تھا اور پھر اب ان کی گمراہی کا کوئی خطرہ بھی نہیں تھا۔ اختر حسین نے ان کے سامنے ایک آزاد اور سیکولر ہندوستان کا اتنا خوب صورت نقشہ کھینچا کہ وہ مملکت خداداد کے تصور کو لگ بھگ بھلا بیٹھے۔ فسادات ہوئے تھے اور وہ ان میں برباد بھی ہوئے تھے، لیکن پنجاب اور لاہور کے علاقوں میں دوسرے لوگ بھی تو برباد اور تباہ ہوئے تھے۔ اختر حسین نے ان سے وعدہ کیا تھا کہ سرکار ان کی بھلائی کے لیے بہتر سے بہتر قدم اٹھائے گی۔ وہ لوگ بھی نئی صورت حال سے سمجھوتہ کرنے کو تیار تھے لیکن جب کبھی انہیں یہ طعنہ سننے کو ملتا کہ جب پاکستان بن گیا تب پھر مسلمان یہاں کیا کر رہے ہیں اور یہ کہ مسلمان غدار ہیں،

انہوں نے ملک کو تقسیم کرا دیا، اپنا ملک بنالیا، پھر بھی بھارت کے سینہ پر مونگ دلنے کو بیٹھے ہیں، تو وہ پھر زندگی سے دور ہو جاتے۔

اُن کے ڈر اور خوف کا علاج کانگریس کے پاس نہیں تھا۔ یہ امراض ان کے اندر جڑیں نہیں پکڑ رہے تھے بلکہ دن بہ دن مضبوط ہوتے جا رہے تھے۔ کچھ لوگ ان کے آئینے سامنے دائیں بائیں رہ گئے تھے، وہ گاندھی اور نہرو کا نام لینے کے باوجود بہت مختلف تھے۔ اختر حسین کو صورتِ حال کی واقفیت تھی لیکن اب وہ کر بھی کیا سکتے تھے گاڑی پٹری سے ایک بار اتر چکی تھی اور اسے پھر اپنی جگہ پر لانا اتنا آسان نہیں تھا۔

۱۰

اصغر حسین تنہا ہی پاکستان کو روانہ ہو گئے، کراچی پہنچ کر انہوں نے بی بی صاحبہ اور سرور حسین کو جو خط لکھا اس سے پتہ چلا کہ کراچی سے سندھی بڑی تعداد میں اپنی جائداد، مکانات زمین اور دوسرا مال و اسباب چھوڑ کر بھاگے ہیں، ان سب پر کسٹوڈین نے قبضہ کر لیا ہے اور مہاجرین کے الاٹمنٹ میں دل کھول کر من مانی ہو رہی ہے۔ اصغر حسین کی تھیلی بھری ہوئی تھی جب کہ دوسرے مہاجرین کے پاس جان کے سوا کچھ بھی باقی نہ بچا تھا۔

اصغر حسین نے دوڑ دھوپ کر کے ایک سینما گھر، ایک تین منزلہ بلڈنگ اور زمین کا ایک پلاٹ الاٹ کروا لیا۔ پیسہ کے علاوہ مسلم لیگ سے ان کی قربت بھی یہاں بہت کام آئی۔ ان کے پاس محمد علی جناح، لیاقت علی خاں اور دوسرے مسلم لیگی لیڈروں کے ساتھ تصویروں کا ایک البم تھا۔

الاٹمنٹ ملتے ہی انہوں نے ان جگہوں پر قبضہ کر لیا۔ بلڈنگ کسی سندھی تاجر کی تھی، جو عجلت میں اپنا کچھ اسباب بھی وہیں چھوڑ گیا تھا۔ اس کی ہر منزل پر تین تین فلیٹ تھے اور ہر فلیٹ میں چار چار کمرے۔ کمروں میں چھوٹے چھوٹے طاق بنے ہوئے تھے۔ کچھ تو خالی تھے اور کچھ میں لکشمی کی چھوٹی چھوٹی مورتیاں تھیں۔ اوپر سیندور سے سواستک بنا ہوا تھا۔ نشانات کو تو انہوں نے صاف کروا دیا۔ مورتیاں خوبصورت تھیں، انہیں پھینکنے کو جی نہ چاہا۔ انہوں نے

مورتیوں کو تزئین کے لیے الگ رکھ دیا۔ اصل مسئلہ یہ تھا کہ ساری بلڈنگ میں مندر مندری فضا تھی جسے ان کو مسجد مسجد میں بدلنا تھا اور یہ کام کوئی اتنا آسان نہیں تھا۔ انہوں نے مہاجر کیمپ سے چند ایسے لڑکوں کو بلوایا جو ہندوستان میں دینی تعلیم لے کر آئے تھے اور داڑھی رکھے ہوئے تھے۔ ان سے قرآن خوانی کرائی، فاتحہ کرایا اور پانچ وقت اذان دلوائی۔ یہ لڑکے اور ان کے گھر والے کیمپوں میں پڑے تھے اور ان کے رہنے سہنے کا کوئی ٹھکانا طے نہیں ہوا تھا۔ اصغر حسین کی خالی بلڈنگ کو دیکھ کر اُن کے منہ میں پانی بھر آیا۔ اپنے رشتہ داروں سے جا کر انہوں نے تذکرہ کیا تو وہ سبھی اٹھ کر اصغر حسین کے پاس آ گئے۔

اصغر حسین کے لیے یہ ایک نئی مصیبت آ گئی۔ وہ آدمی جہاں دیدہ تھے۔ ہندوستان میں زمینداری کے انتظامات کو سنبھال چکے تھے، وہ گھبرائے نہیں۔ مہاجرین سے انھوں نے صاف صاف کہہ دیا کہ یہ بلڈنگ تو انہوں نے باقاعدہ خریدی ہے اور یہ کہ ان کی بیوی، بچے، جو ہندوستان میں ہندوؤں کے جنگل میں پھنس گئے ہیں، اب جلد ہی آنے والے ہیں۔ اس پر ان لوگوں نے اس وقت تک بلڈنگ میں رہنے کی درخواست کی جب تک ان کی بیوی، بچے ہندوستان سے نہیں آ جاتے۔ اصغر حسین جانتے تھے کہ ایک بار یہاں آ جانے کے بعد ان مہاجروں کا یہاں سے نکلنا بہت مشکل ہو جائے گا۔ وہ کسی قیمت پر اس کے لیے تیار نہیں ہوئے۔ البتہ وہ ان کے ساتھ الاٹمنٹ کے دفتر تک ضرور گئے اور ان کی پر زور سفارش کی۔ آفیسر نے الاٹمنٹ کا وعدہ کیا تب کہیں جا کر ان کی جان چھوٹی۔

بلڈنگ کی پیشانی پر انہوں نے ایک بہت بڑا بورڈ ٹنگوا دیا جس پر بڑے بڑے حروف میں "اصغر حسین منیشن" لکھا تھا۔ مال واسباب میں لکڑی کا بہت سے فرنیچر تھا جسے مرمت اور روغن کی ضرورت تھی، وہ سب انہوں نے ایک کمرے میں بند کر دیا۔ ایک زنگ خوردہ آئرن سیف رکھا تھا، اسے کھولنے کی انہوں نے بہت کوشش کی، لیکن کامیاب نہیں ہوئے چند دنوں بعد ان کا ارادہ ہوا کہ ہندوستان جائیں اور بال بچوں کو لے آئیں۔ اُن کے ارادے کی خبر جب الاٹمنٹ میں کام کرنے والے ان کے ایک افسر دوست کو ملی تو اس نے ان کو فی الحال ہندوستان جانے سے منع کیا کہ مہاجر جس سکان کو خالی دیکھتے ہیں، تالہ، دروازہ توڑ کر اس میں گھس جاتے ہیں اس لیے اگر ان کی

غیر موجودگی میں کوئی مہاجر گھس گیا تو پھر اسے نکالنا بہت مشکل ہو جائے گا۔ یوں بھی ان لوگوں کے پاس شکایتوں کے سوا کچھ رہ نہیں گیا ہے ایک لوٹ مار مچی ہوئی ہے۔ اصغر حسین تذبذب میں پڑ گئے۔ راستہ خاصا مخدوش تھا اور وہ راستے کے سارے نشیب و فراز سے واقف بھی تھے وہ بچوں کو آسانی سے لا سکتے تھے، لیکن سرور حسین کے ساتھ کسی قسم کی کوئی مشکل پیش آسکتی تھی۔ اسی ادھیڑ بن میں کئی روز گزر گئے۔

اسی درمیان ان کو ایک تلخ تجربہ بھی ہوا۔ وہ تنہا اپنے قائم کردہ مینشن میں رہ رہے تھے۔ کچھ مسلم لیگی لیڈروں کو وہاں بہت اچھے بنگلے مل گئے تھے۔ نئی مملکت کو مضبوط بنانے کے لیے جناح صاحب اور لیاقت علی خاں دن رات محنت کر رہے تھے۔ ہندوستان نے پانی کے پچپن کروڑ روپے دینے سے جو انکار کیا تھا وہ گاندھی جی کے برت اور ہڑتال سے مل گئے تھے۔ ایک لیڈر کے یہاں رات کے کھانے کی دعوت تھی، وہاں کچھ دیر ہو گئی جب اصغر حسین واپس آئے تو انہوں نے دور ہی سے بلڈنگ میں روشنی دیکھی تو وہیں ٹھٹک گئے۔ قریب آنے پر تو ان کے ہوش ہی اُڑ گئے۔ مہاجر تالہ توڑ کر وہاں گھس آئے تھے۔ پہلے تو اصغر حسین نے گھسنا چاہا لیکن پھر یہ سوچ کر کہ ان کا اس طرح تنہا اندر جانا مناسب نہیں، وہ الٹے پیر واپس لوٹے اور سیدھے وزیر اعظم کے پاس گئے۔ اتفاق سے وزیر اعظم ابھی ابھی کہیں باہر سے آئے تھے اور گاڑی سے اتر ہی رہے تھے۔ اصغر حسین کو پورٹیکو میں دیکھ کر انہوں نے ان کو قریب بلا لیا۔ اصغر حسین نے قریب آکر ساری بات انہیں بتائی۔ وزیر اعظم نے اسی وقت فوج کے اعلیٰ کمان کو حکم دیا کہ وہ فوراً بلڈنگ خالی کرائیں۔ اصغر حسین کو انہوں نے کمانڈر کے پاس اپنی گاڑی سے بھجوا دیا۔ فوجی ہیڈ کوارٹر میں ضروری کارروائی میں کچھ دیر لگی۔ تقریباً دو بجے رات میں کئی فوجی گاڑیاں اصغر حسین مینشن پہنچیں اور مکینوں کو دو گھنٹے کے اندر اندر مکان خالی کرنے کا حکم دیا۔ وہ لوگ شاید یہ سمجھ بیٹھے تھے کہ اپنے ملک میں بھلا ان کا کوئی کیا بگاڑے گا، وہ ٹس سے مس نہ ہوئے۔ ادھر اصغر حسین نے کمانڈر سے درخواست کی کہ بلڈنگ یوں خالی نہیں ہونے والی، اس کے لیے کچھ کرنا پڑے گا۔ چنانچہ گھنٹہ بھر کے بعد کمانڈر نے فوجیوں کو بلڈنگ خالی کرنے کا حکم دے دیا۔ فوجیوں نے حکم ملتے ہی کارروائی شروع کر دی ہاتھ پکڑ کر، دھکے دے کر، ٹھوکریں مار کر انہوں نے سب لوگوں کو نکال باہر کیا اور ان کے

سامان کو اٹھا اٹھا کر نیچے پھینک دیا۔ جاڑے کی ٹھٹھرتی رات میں مرد، بچے اور عورتیں نیچے سڑک پر کھڑے روتے رہے۔ اور مملکت خداداد کی دہائی دیتے رہے۔ اصغر حسین کو ان کی حالت پر افسوس تھا اور ان کا ارادہ تھا کہ وہ ان کے لیے کچھ کریں گے ضرور، لیکن جو کچھ انہوں نے کیا تھا، اس کی اجازت بھی وہ کیسے دے سکتے تھے۔ اپنے مکان پر قبضہ کرنے کی اجازت کوئی کیسے دے سکتا ہے۔

اس واقعہ کے بعد وہ بہت ہوشیار ہو گئے۔ اتنی بڑی بلڈنگ تھی اور اس میں وہ تنہا رہتے تھے۔ زمین کے پلاٹ اور سینما ہال پر قبضہ کا فی الحال کوئی خطرہ نہیں تھا۔ اصغر حسین کو راتوں میں بہت کم نیند آنے لگی۔ دن بھر وہ رات کی ادھ کچی نیند کے خمار میں اونگھتے رہتے۔ حالات کچھ سدھرنے کے بعد انہوں نے سرور حسین کو خط لکھا کہ وہ سب کو لے کر کراچی آجائیں، اگر ان کا ارادہ بدل گیا ہے تو ان کی بیوی بچوں کو بھیج دیں۔

سرور حسین پٹنہ میں یہ خط ملتے ہی جانے کے لیے فوراً تیار ہو گئے۔ اصغر حسین کے بیوی بچے تو عرصہ سے بوریا بستر باندھے تیار بیٹھے تھے۔ سرور حسین کے جانے کی خبر جب ان کے دوستوں کو ملی تو وہ انہیں روکنے کے لیے دوڑ پڑے۔

سرور حسین ایک نامور وکیل بن چکے تھے، روپیہ ان کے آنگن میں برس رہا تھا۔ ان کے جج ہونے کا چرچا عام تھا۔ لیکن سرور حسین جانے کا قطعی فیصلہ کر چکے تھے۔ ان کو سوچنے سمجھنے کا بھی کافی موقع مل چکا تھا۔ بھائی کے بچوں پر وہ جان چھڑکتے تھے گھر سے اُن کا رشتہ لگ بھگ منقطع ہو چکا تھا۔ ان کی سابقہ ازدواجی زندگی ان کے لیے ایک مسلسل رستا ہوا ناسور بن چکی تھی۔ ان کی موجودہ بیوی کو اب تک وہ مقام نہیں مل سکا تھا جس کی وہ حق دار تھیں۔ یوں بھی ان کا خیال تھا کہ کراچی میں ان کی وکالت زیادہ اچھی طرح چل سکے گی وہاں کے سندھی بیرسٹر اور وکیل بھاگ چکے تھے، ان کے جج بننے کے وہاں زیادہ مواقع ہو سکتے تھے، ممکن ہے کہ اس سے بھی آگے جانے کا موقع ملے۔

جانے سے قبل وہ بہار شریف آئے تاکہ سب سے ملاقات کر سکیں۔ بی بی صاحبہ نے ان سے ملنے سے انکار کر دیا۔ وہ خاندانی روایات کو توڑنے کے مرتکب ہوئے تھے اور یہ ایک ناقابل معافی جرم تھا۔ اختر حسین بہن کی وجہ سے ان سے ناخوش تھے اور شوہر کی وجہ سے بہن بھی بھائی سے دور رہیں۔ ان کی پہلی بیوی کو ان کی آمد کا پتہ چلا تو انہوں نے دروازے پر

اگر انہیں اس قدر کوسا اور گالیاں دیں کہ بس مارنے ہی کی کسر رہ گئی اور شاید وہ یہ حسرت بھی پوری کرلیتیں اگر وہ ان کے ہاتھ لگ جاتے۔ دونوں چھوٹے بھائی علی گڑھ میں پڑھ رہے تھے اور سرور حسین نے انہیں دلّی آنے کو لکھ دیا تھا۔ چھوٹی بہنیں جوان تھیں۔ بی بی صاحبہ کا ان پر بہت رعب تھا۔ پھر بھی چوری چھپے وہ بھائی سے مل آئیں اور گلے لگ کر خوب روئیں۔ بہنوں نے چوری چھپے ان کے لیے کئی قسم کے حلوے بنائے اور پیکیٹ بنا کر ساتھ کر دیے۔

سرور حسین سب کو ساتھ لے کر کراچی پہنچے۔ ان کے ساتھ اصغر حسین کی بیوی، بچوں کے علاوہ ان کی دوسری بیوی اور بچی بھی تھیں۔ اس وقت ہند و پاک کے راستے میں روپیہ لیا کا ٹائپ بنا ہوا تھا۔ سرور حسین کی جیب میں کچھ روپے بھی تھے۔ اصغر حسین نے اپنی بلڈنگ میں دو فلیٹ اپنے لیے رکھ لیے، ایک سرور حسین کو دے دیا، بقیہ کو کرایہ پر اٹھا دیا۔ اس میں اس بات کا خاص خیال رکھا کہ مہاجرین ان فلیٹوں میں نہ آنے پائیں کیونکہ پھر ان سے فلیٹ خالی کرانا بہت مشکل ہو جائے گا۔ ایک مہاجر خاندان آیا بھی تو وہ کیرالا کے علاقہ کا تھا۔ اس سے بہت زیادہ خطرہ نہ تھا۔ سرور حسین کے آنے سے اصغر حسین کو ایک طاقت مل گئی۔ ان کے اندر اعتماد بیدار ہوا تھا۔

سرور حسین نے کچھ دن آرام کرنے کے بعد بار جوائن کرلیا۔ پریکٹس کرنے والوں میں زیادہ تر مقامی تھے۔ کچھ ہندو وکیل بھی تھے جو ڈرے ڈرے سے تھے۔ مقدموں کی نوعیت ذرا مختلف تھی۔ بہار زیادہ تر خاندانی اور گھریلو جھگڑوں کی آماج گاہ تھا، یہاں زمین، جائداد کے جھگڑوں کے ساتھ قتل و خون کے مقدموں کی تعداد زیادہ تھی۔ سرور حسین نے ان مقدموں کی گہری اسٹڈی شروع کی۔ وہ ایک محنتی آدمی تھے اور کراچی وہ ایک حوصلہ کے ساتھ آئے تھے۔ وہ محنت اور مشکل کے بارے میں بہت کچھ سوچ کر آئے تھے۔

۱۱

ادھر ہندوستان میں ایک نیا سلسلہ شروع ہوا تھا کسٹوڈین کا، حکومت نے ان جائدادوں کو جنھیں چھوڑ کر لوگ پاکستان بھاگ گئے تھے، دشمن کی جائدادیں قرار دیدیں جن لوگوں نے پہلے سے کوئی بندوبست نہیں کیا تھا، ان کی جائدادیں تو ضبط ہوگئیں مشکل میں وہ تھے جنہوں نے جانے سے پہلے نہ کوئی بندوبست کیا تھا اور نہ کوئی وارث بنا کر گئے تھے ان میں بعض وارث اصلی تھے اور بعض نقلی۔ جھوٹی سچی خبریں بھی خوب فروخت ہورہی

تھیں۔ ایک افراتفری کی کیفیت تھی۔ کسٹوڈین کے لوگ آتے اور پولیس کی مدد سے جائدادوں پر سیل لگا کر چلے جاتے۔ اس میں بہت سے بے قصور بھی پھنس گئے۔ بات دراصل یہ تھی کہ ایسے مسلمان بہت کم تھے جن کے خاندان ایک نہ ایک فرد پاکستان نہ چلا گیا ہو۔ یہ ان کی ایک مستقل کمزوری تھی جس کا خوب فائدہ اٹھایا گیا۔ کچھ لوگوں نے ان سے بہت رقمیں اینٹھیں اور انہیں باقاعدہ بلیک میل کیا۔ کانگریس ہی کے کچھ لوگوں نے مین ہاؤس کے بارے میں جا کے بات لگائی۔ وہ اس زمانے سے خار کھائے بیٹھے تھے جب اصغر حسین نے مین ہاؤس میں کانگریس کا جھنڈا اکھاڑ کر مسلم لیگ کا جھنڈا گاڑا تھا۔ ان کی جائداد کی ضبطی کا حکم آگیا۔ ان کے گونگے بیٹے کو وارث کے طور پر پیش کیا گیا جسے حکومت ہند نے تسلیم نہیں کیا۔ مقدمہ کرنے کے کے سوا کوئی چارہ نہ تھا۔ چنانچہ مقدمہ دائر ہوا۔ شروع میں اختر حسین نے اس مقدمے سے دل چسپی نہیں لی۔ ان کا خیال تھا کہ یہ سب کچھ تو بالکل توقع کے مطابق ہی ہو رہا ہے اور یوں بھی اصغر حسین کوئی گھاٹے میں تو رہے نہیں تھے۔ ہندوستانی جائداد کی قیمت پر پاکستان میں انھوں نے اچھی خاصی حیثیت بنا لی تھی۔ مقدمے کی خبر سن کر وسیم اور نسیم علی گڑھ سے بھاگے بھاگے آئے وہ یونی ورسٹی کی دوسری ہی دنیا کے لوگ تھے، یہ صورت حال ان کے لیے نئی تھی۔ وہ تو مقدمہ کا سن کر ہی گھبرا گئے تھے۔ اصغر حسین کے منشی مکند لال نے ان کے لڑکے کی طرف سے مقدمہ دائر کیا تھا۔ اگر گھر کے افراد اس میں دل چسپی نہیں لیتے تو پھر جائداد تو ضبط ہوتی ہی، پورا گھرانہ حکومت کی نظروں میں مشکوک ہو جاتا۔ دو نوجوان لڑکے کر بھی کیا سکتے تھے۔ ایک اختر حسین ہی تھے جو سماج میں بھی اپنا ایک اثر رکھتے تھے لیکن وہ اس معاملے سے الگ تھلگ تھے۔ ادھر وہ اپنی وکالت کی طرف بھی توجہ دینے لگے تھے۔ وہ ضلع کانگریس کے صدر تھے۔ اس لیے انہیں تنظیمی کاموں کی طرف بھی توجہ کرنی پڑتی۔

کانگریس اب کوئی تحریک نہیں، بلکہ برسر اقتدار جماعت تھی اور ہر وہ شخص جو دو روٹی کمانا چاہتا تھا، کانگریس کا چونیا ممبر ہونے کے لیے کوشاں تھا۔ پارٹی کے بعض لیڈر اس صورت حال سے خوش فہمی میں مبتلا ہو گئے تھے۔ وہ اس بھاگ دوڑ کو پارٹی کی مقبولیت سمجھ بیٹھے تھے۔ لیکن اختر حسین اصل بات کو خوب سمجھ رہے تھے۔ وہ جانتے تھے

کہ اب پارٹی پر زیادہ ذمّہ داریاں آگئی ہیں۔ اسے قوم کی نئی تعمیر کرنی ہے اس لیے اُسے اصولوں پر سمجھوتہ نہیں کرنا چاہیے۔ اس فکر میں ان کا ایک خاصا وقت صرف ہو رہا تھا۔ ان کی نگاہیں اپنے گھر پر ضرور تھیں لیکن وہ یہ بھی سمجھتے تھے کہ گھر میں ابھی ان کی زیادہ ضرورت نہیں

وسیم اور شمیم نے بی بی صاحبہ کو سمجھایا کہ وہ خود بھائی جان کو بلا کر سمجھائیں بی بی صاحبہ نے انہیں شام کی چائے پر بلا بھیجا۔ وہ آئے تو چائے کے بعد ان سے کہا کہ بیٹا گھر کی عزّت کا سوال ہے، بڑے ہونے کی حیثیت سے یہ اُن کا فرض ہے کہ گھر کی عزّت کو بچائیں۔ چھوٹے غلطی ضرور کرتے ہیں لیکن اگر بڑے انہیں معاف نہ کریں تو پھر یہی غلطیاں آگے چل کر حقیقت بن جاتی ہیں۔ اختر حسین چپ چاپ ان کی بات سنتے رہے انہوں نے کبھی بی بی صاحبہ کے سامنے زبان نہیں ہلائی تھی۔ وہ واپس اپنے بنگلے پر چلے گئے۔

اختر حسین مشکل میں پڑ گئے تھے۔ ایک طرف ان کے اصول تھے، قربانیاں تھیں، اور وہ عزّت تھی جس سے وہ مطمئن تھے۔ دوسری طرف بی بی صاحبہ کا حکم تھا۔ گھر کے اندر ان کی آنکھوں کے سامنے ان کے سیاسی مسلک کا مذاق اڑایا گیا تھا، گھر کے بزرگ ہونے کے باوجود ان کو نظر انداز کیا گیا تھا۔ اُن کے لیے دبی دبی گالیاں تھیں، ایمان فروش اور کافر کا لقب تھا۔ ان کا انصاف پسند سیکولر اور قوم پرست مزاج تھا اور ان سب کے آگے بی بی صاحبہ کا حکم ایک بہت بڑا سوالیہ نشان بن کر ان کے سامنے کھڑا تھا۔ وہ سوچتے رہے، سوچتے رہے۔ رات کے سبھی پہر گزر گئے۔ رات بھر وہ کتّوں اور سیاروں کی آوازیں سنتے رہے۔ یہ آوازیں انہیں اجنبی لگ رہی تھیں۔ وہ ہمیشہ یوں تھک کر سوتے تھے کہ صبح سے قبل ان کی آنکھ ہی نہ کھلتی تھی۔ لیکن آج نیند ان کی آنکھوں سے روٹھ چکی تھی۔

صبح انہوں نے منشی مکند لال کو بلایا جو صلاح و مشیرہ کے لیے اسلام پور سے بہار شریف آئے ہوئے تھے۔ ان سے مقدمے کی تفصیل معلوم کی، کچھ ضروری مشورے دیے اور وسیم نے اندر سے بی بی صاحبہ کو پیغام بھیج دیا کہ ان کے حکم کے مطابق انہوں نے منشی جی سے بات کر لی ہے گھر بھر میں خوشی اور اطمینان کی ایک لہر سی دوڑ گئی۔

اختر حسین نے منشی جی کی گفتگو سے اچھی طرح سمجھ گئے تھے کہ مقدمہ میں زیادہ جان

نہیں ہے۔ ایسے ایسے بے شمار مقدمے عدالتوں میں چل رہے تھے۔ اختر حسین، کمشو ڈین کے مقدموں کو اپنے ہاتھوں میں نہیں لیتے تھے، البتہ اخبارات کو ان مقدموں سے بڑی دلچسپی تھی۔ انہوں نے ان کی روداد چھاپنے کے لیے کالم مخصوص کیے تھے۔ یہ کالم بہت دلچسپی سے پڑھے جاتے۔ اُدھر پاکستان اور اس سے وابستہ ہر چیز کو بہت ہی شک و شبہ کی نظروں سے دیکھا جانے لگا تھا اور جہاں بھی پاکستان کا نام آتا، لوگوں کے کان فوراً کھڑے ہو جاتے۔ مسلمانوں کو پاکستانی کہہ دینا ایک عام سی بات تھی۔ مسلمان، پاکستانی کی گالی سن کر یا تو مرنے مارنے پر تل جاتے یا پھر ہفتوں گھر میں گھسے رہتے۔ دونوں کیفیتوں سے گالی دینے والوں کا حوصلہ بڑھتا گیا اور یہ گالی عام ہو گئی۔

شروع شروع میں تو لوگ معمولی باتوں سے گھبرا کر پاکستان چلے جایا کرتے۔ پاکستان جانا آسان تھا بس گاڑی پر بیٹھو، راستہ میں کسی طرح جان بچائے رکھو اور جان بچ گئی تو پاکستان پہنچ جانا یقینی۔ پھر پاسپورٹ بننے لگا۔ ویزا کا سلسلہ شروع ہوا۔ پاسپورٹ بننے کے لیے جو درخواست دی جاتی، اس کے مطابق درخواست دہندہ کی پولیس کے ذریعہ انکوائری ہوتی۔ اس انکوائری سے خوف و ہراس پھیل جاتا مسلمان نوجوان جب نوکری کے لیے جاتے تو انہیں معنی خیز نظروں سے ٹٹولا جاتا۔ دوسرے سوالوں کے جواب تو وہ دے دیتے لیکن کبھی کبھی ایک سوال ان سے ایسا کیا جاتا جس کے جواب میں ان کے سر جھک جاتے۔

"آپ پاکستان کیوں نہیں چلے جاتے۔"

جب کچھ عرصہ یوں ہی گزر گیا تو وہ خود ہی انٹرویو وغیرہ میں جانے سے گھبرانے لگے۔ ان کے ذہن میں تجارت کا خیال آتا۔ اسلام میں تجارت کا حکم ہے، نوکریوں کے چکر میں پڑ کر ہی مسلمانوں کی معیشت تباہ ہوئی ہے۔ جس قوم نے تجارت کو اختیار کیا وہ معاشی اعتبار سے خوش حال و کامیاب ہوئی۔ خود ہمارے حضور نے تجارت کی، سامان لے کر ملک شام کو جاتے اور کامیاب ہو کر واپس آتے۔ جس پڑھے لکھے نوجوان سے پوچھا جاتا کہ میاں کیا کر رہے ہو، تو وہ بڑے فخر سے کہتا، بزنس کرنے کا ارادہ ہے۔

کچھ لوگوں نے کپڑے اور جوتوں کی دکانیں کھولیں بھی۔ لیکن سیلس ٹیکس کے چکر میں پڑکر وہ دوکھاتے رکھنے لگے۔ اس سے دو مخالف مرکزوں پر انہیں جنگ کرنی پڑتی۔ تجارت میں مذہب کے حکم کے مطابق وہ ایمان داری برتنے کی کوشش کرتے اور اس پر ضرب لگی تو ان کے اندر کا مسلمان کراہ اٹھتا اس کو تھپک تھپک کر سلانے میں ان کی ساری محنت صرف ہوجاتی اور وہ نڈھال ہوجاتے۔ جب کبھی ان کے دوہرے کھاتے پکڑے جاتے تو انہیں یقین ہوجاتا کہ مسلمان ہونے کی وجہ سے اب انہیں پھانسی ہی ہوجائیگی کھاتے پکڑے جانے کا ڈر ہر وقت ان کے دلوں میں بیٹھا رہتا اور وہ محکمہ کے افیسروں سے نپٹنے میں سخت بداعتمادی کا شکار رہتے۔ اس کے علاوہ بازار میں مقابلے کی جو فضا تھی وہ ان کے لیے بہت ناسازگار تھی۔ ان کے پاس پونجی کی بھی بڑی کمی تھی کیوں کہ عام طور پر بچی کھچی جائداد اور بیوی کے زیورات بیچ کر ہی وہ تجارت شروع کرتے تھے جب کہ مقابلہ میں ڈٹے رہنے کے لیے بڑی پونجی کی ضرورت ہوتی۔ نتیجہ یہ ہوتا کہ عید بقر عید کے بہانے وہ دکان بند کرتے تو وہ کھلنے کا نام ہی نہ لیتی۔ بندھے ہوئے گاہک آتے ضرور لیکن دکان پر تالا دیکھ کر لوٹ جاتے۔ دکان بند کر کے وہ اندر اندر پاکستان جانے کا پروگرام بناتے رہتے "گرونیا پاسپورٹ" بہتی گنگا کی طرح جاری تھا جس میں چند ہزار روپیوں کا خرچ تھا اور بس۔ یہ ترکیب مشرقی پاکستان جانے کے لیے بہت ہی کارگر اور آسان تھی۔ مشرقی پاکستان میں نوکری آسانی سے مل جاتی۔ وہاں بنگالیوں کی روایتی سست روی اور کاہل پنے سے دفتر، فیکٹری اور گودیوں میں کام دھیمے دھیمے ہوتا۔ بہاری جب اپنے کاہل پنے کو ہندوستان میں چھوڑ کر آئے تو بڑے کام کے ثابت ہوئے۔ ان کی محنت اور لگن سے مقامی حضرات بھی خوش تھے۔ بہاری جب اپنے رشتہ داروں کو ہندوستان خط لکھتے تو اتنے خوش و خرم اور مطمئن دکھائی دیتے کہ ان کے رشتہ داروں کو رشک ہوتا۔

کسٹوڈین کے مقدمے مسلمان ہارنے لگے تو ایک بار پھر وہ اسی کیفیت میں مبتلا ہوگئے جس سے وہ حالیہ برسوں میں دوچار رہے تھے۔ ان کے لیے یہ ثابت کرنا بہت مشکل ہوگیا تھا کہ جس جائداد پر وہ قابض ہیں، وہ انہیں کی ہے، جن لوگوں کا پاکستان

جانے کا ریکارڈ موجود تھا، اُن کی تو بات ہی الگ تھی، جو لوگ ۰ گرد نیا یا پسپورٹ ۰ کے سہارے وہاں گئے تھے، ان کی موجودگی اور غیر موجودگی کیسے ثابت ہو سکتی تھی حالانکہ لوگوں نے اس کی کوشش بھی کر ڈالی اور نقلی کو اصلی بنا کر پیش بھی کیا، دو چار اس میں کامیاب بھی ہوئے۔ جو لوگ مقدمے ہارنے کے بعد بھی ہمّت اور حوصلہ پر قابض رہے وہ ہائی کورٹ گئے، بعض سپریم کورٹ تک جا پہنچے۔

اصغر حسین کی جائداد مقدمہ میں پھنسی تھی، وہ لاکھوں کی تھی۔ بی بی صاحبہ کو یہ یقین تھا کہ وہ ضرور لوٹ کر آئیں گے، یہی زمین، جائداد انہیں واپس لائے گی۔ وہ مصلیٰ بچھا کر مقدمہ کی کامیابی کے لیے دل و جان سے دعائیں مانگتیں۔ جانتی تھیں کہ اگر یہ مقدمہ ہار گئے تو پھر بیٹے کا ہندوستان آنا ایک خواب بن جائے گا۔ گھر بھر مقدمہ کی کامیابی کے لیے دعائیں کرتا صرف اختر حسین اس سلسلے میں پرسکون نظر آتے وہ روز منشی جی سے مقدمہ کا احوال سنتے، اگر کوئی ایسی بات ہوتی تو مشورہ دے دیتے ورنہ چُپ چاپ اُٹھ جاتے۔

مقدمہ کا فیصلہ ہوا اور اصغر حسین کے خلاف گیا۔ جس روز مقدمہ ہارنے کی خبر آئی، اُس روز وہ بہار شریف میں موجود نہیں تھے۔ کانگریس کی صوبائی میٹنگ کے سلسلے میں پٹنہ گئے ہوئے تھے۔ خاندان کے لیے یہ ہار بالکل انوکھی سی چیز تھی بن ہاؤس میں صفِ ماتم بچھ گئی۔ عورتیں رو رہی تھیں، بی بی صاحبہ پچھاڑیں کھا رہی تھیں۔ وسیم اور شمیم سوگوار سے باہر بیٹھے تھے۔ منشی جی بار بار اپنے انگوچھے سے آنسو پونچھ رہے تھے۔ اگر کوئی دیکھتا تو یہی سمجھتا کہ اس گھر میں کسی کڑیل جوان کی موت ہوئی ہے۔ وہ تو خیریت گزری کہ گھر کے در و دیوار بہت وسیع و عریض تھے اور نزدیک پڑوسیوں کا کوئی جھنجھٹ نہیں تھا۔

پاکستان ایک گول مول سا ٹیلیگرام کر دیا گیا تھا اور سبھوں کو اختر حسین کا انتظار تھا جب بھی کوئی رکشا دروازے کے پاس سے گزرتا، بے چین نگاہیں فوراً اٹھ جاتیں ایک نوکر کو ریلوے اسٹیشن بھیج دیا گیا تھا۔ دس بجے رات میں اختر حسین پٹنہ سے واپس آئے۔ وسیم اور شمیم تو ان سے لحاظ کرتے ہوئے براہ راست مخاطب ہی نہیں ہوتے تھے۔ بی بی صاحبہ نے انہیں اندر بلا بھیجا۔ جب اختر حسین اندر پہنچے تو عورتیں انھیں

دیکھ کر رونے لگیں۔ اختر حسین نے سب کو دلاسا دیا اور بی بی صاحبہ کو سمجھاتے ہوئے کہا کہ اس قسم کے مقدموں کو دیکھتے اور سنتے ہوئے ان کی عمر بیتی ہے۔ یہ تو محض نچلی عدالت کا فیصلہ ہے، اس کے اوپر ہائی کورٹ ہے، اس کے اوپر سپریم کورٹ ہم لوگ آخر تک لڑیں گے۔

ان کی بات سے سب کو ڈھارس ہوئی۔ اس رات اختر حسین نے دیر تک منشی جی سے مشورہ کیا اور یہی طے پایا کہ مقدمہ ہائی کورٹ میں لے جایا جائے گا۔ یوں اختر حسین جان رہے تھے کہ مقدمہ میں کوئی دم نہیں لیکن جب تک بی بی صاحبہ بقید حیات تھیں، اس وقت تک ان میں یہ حوصلہ نہیں تھا کہ وہ سچی اور کھری بات ان کے سامنے رکھ سکیں۔

■■

دوسرا حصّہ

١٢

۳۰ جنوری کو ملک پر ایک بہت بڑا صدمہ گزرا۔ ایک انتہا پسند کے ہاتھوں گاندھی جی قتل ہوگئے۔ پتہ نہیں کیوں قتل کی خبر آتے ہی اکثریت کے ذہنوں میں مسلمان آگئے۔ ریڈیو نے اعلان کیا کہ ایک پاگل کے ہاتھوں مہاتما گاندھی مارے گئے، اس سے شک کو مزید استحکام حاصل ہوا۔ پنڈت نہرو نے جب باقاعدہ قاتل کا نام لیا تب کہیں جاکر مسلمانوں نے چین کی سانس لی۔ گاندھی جی کے قتل کے بعد مہینوں ملک میں سوگواری کی ایک فضا قائم رہی۔ لوگ کہتے تھے کہ اس کے بعد ملک کی سیاسی اور سماجی فضا میں سدھار اور قوت برداشت میں اضافہ ہوا ہے حقیقت شاید صرف تواریخ کے صفحات میں بند تھی۔ نظر یہ آرہا تھا کہ فرقہ وارانہ طاقتیں نئے سرے سے اپنے آپ کو چپکے چپکے منظم کررہی تھیں اور کانگریس کے سیکولرزم کے بھرم کو اندر سے توڑنے کی کوششوں میں مصروف تھیں۔ پانی کے اندر ایک لہر چل رہی تھی۔ اوپر سے پانی پرسکون تھا اور بھولے بھالے لوگ اس سکون سے بہت خوش تھے۔

مسلم لیگ کے لیڈروں کی ایک بڑی تعداد پاکستان چلی گئی تھی البتہ ان کے پیچھے چلنے والے اب بھی ہندوستان ہی میں تھے جن کے سامنے اب صرف کانگریس اور اس کے لیڈر رہ گئے تھے۔ جو مسلم لیگی لیڈر ذاتی اسباب سے یہاں رہ گئے تھے وہ سیاست اور دنیا جہاں سے یوں لاتعلق ہوگئے تھے جیسے کبھی ان کا اس سے واسطہ ہی نہ رہا ہو۔ گھر میں بند رہتے، اخبار پڑھتے، ریڈیو سنتے۔ اور آپس میں مل بیٹھ کر دل کی بھڑاس نکال لیتے۔ وہ کچھ دنوں تک اس انتظار میں بھی رہے کہ شاید پاکستان بنوانے کے جرم میں انھیں پھانسی ملے گی۔ جب بہت دنوں تک کچھ نہیں ہوا تو انہیں سیاست بھرمانے لگی مسلم لیگ تو اپنی دکان بڑھا چکی تھی۔ یوں تو ایک دو جماعتیں اور تھیں لیکن صرف کانگریس ہی تھی جو قابل قبول ہوسکتی تھی۔ اس نے تقسیم کے بعد مسلم لیگ لیڈروں کو پھانسی نہیں دی تھی، اُن مسلمانوں کو دیش نکالا نہیں دیا تھا جنھوں نے مسلم لیگ اور

کچھ لوگوں کے خیال میں پاکستان کو ووٹ دیا تھا۔ اس نے ملک کے لیے جو آئین بنایا تھا اس میں ہندو مسلمان کا کوئی فرق نہیں رکھا تھا، وہ مسلمانوں کے دشمنوں کو برا کہتی اور سب سے بڑی بات یہ کہ وہ برسرِ اقتدار تھی۔ گاندھی کیپ لگا کر جو آدمی بھی کسی سرکاری دفتر میں پہنچ جاتا، وہ کام کرا کے ہی واپس آتا۔

محمد یونس، مسلم لیگ کے بڑے پرجوش، شعلہ بیان مقرر تھے۔ مسلم لیگ کے پٹنہ اجلاس میں انہوں نے پاکستان کے حق میں ایسی تقریر کی تھی کہ لیاقت علی خاں نے اٹھ کر انہیں گلے لگا لیا تھا اس روز سے وہ صوبائی سطح پر آگئے تھے۔ پاکستان جانے کے لیے وہ بالکل تیار تھے لیکن ان کی جائداد کے پورے پیسے نہ مل سکے اس لیے وہ مجبوراً یہیں رہ گئے، محض اس امید پر کہ جب بھی حالات سازگار ہوئے تو سب کچھ بیچ باچ کر پاکستان نکل بھاگیں گے۔ لیکن جب یہاں کے حالات انہوں نے درست دیکھے تو فی الحال انہوں نے یہیں رہنے کا فیصلہ کیا۔ انہوں نے ایک اخبار میں پڑھا تھا کہ پنڈت جواہر لال نہرو نے لوگوں سے پچھلے سارے اختلافات بھول کر قوم کی نئی تعمیر میں تن من دھن سے لگ جانے کو کہا ہے اس سے ان کی بڑی حوصلہ افزائی ہوئی اور انہوں نے پنڈت نہرو کو ایک تفصیلی خط لکھا جس میں انہوں نے اپنی سابقہ غلطی تسلیم کر کے کانگریس میں شمولیت کی درخواست کی۔ وہاں سے پندرہ روز کے بعد ایک چٹھی آئی کہ اس سلسلے میں ضلع کانگریس سے رجوع کیا جائے محمد یونس خط پاکر خوش تو بہت ہوئے کہ چلو برف تو پگھلی لیکن دوسری طرف یہ ہدایت کہ ضلع کانگریس سے رجوع کیا جائے ان کے لیے ایک ایسے بند دروازے کی طرف اشارہ تھا جو کبھی کھلنے والا نہیں تھا۔ ضلع کانگریس کے صدر اختر حسین تھے جو خود تو بہت بڑے اصول پرست اور قوم پرور تھے ہی ضلع کانگریس کے اندر بھی انہوں نے ایسے ہی لوگوں کو بھر رکھا تھا۔ یہ لوگ مسلم لیگ کے دشمن کہے جاتے تھے، اور مار کھانے، گالیاں کھانے کے باوجود اپنے اصولوں سے نہ ہٹے تھے۔ ادھر کسی تقریب میں اختر حسین اور محمد یونس کا سامنا ہو جاتا تو محمد یونس سلام کرنے میں پہل کرتے اختر حسین جواب ضرور دیتے لیکن پہل کبھی نہ کرتے۔ اس سے چڑھ کر محمد یونس نے سلام کرنا ہی چھوڑ دیا۔

اب وہ کانگریس میں شمولیت کی درخواست لے کر اختر حسین کے پاس کیسے جا سکتے تھے انہوں نے ایک دوسری ترکیب اختیار کی۔ وہ پٹنہ گئے اور صوبائی کانگریس کے صدر سے وزیراعظم کے

دفتر کی چھٹی کے ساتھ ملے اور ان کے سامنے اپنا مسئلہ رکھا۔ اس وقت صوبائی صدر کے پاس ایک ریاستی وزیر دیاشنکر جھا بھی بیٹھے تھے۔ دونوں نے محمد یونس سے وعدہ کیا کہ وہ انہیں کانگریس میں شامل کریں گے۔ ضلع کانگریس کے صدر اگر مخالفت کرتے ہیں تو کریں۔ طے پایا کہ اگلے ماہ بہار شریف میں کانگریس کا جو جلسہ ہونے والا ہے، اس میں وہ لوگ خود محمد یونس کی شمولیت کا اعلان کریں گے، اس طرح عوام پر بھی بہت اچھا اثر پڑے گا۔ محمد یونس نے یہ بھی وعدہ کیا کہ وہ اپنے ساتھ بہت سے مسلم لیگی کارکنوں کو بھی کانگریس میں شامل کرائیں گے۔

محمد یونس خوش خوش پٹنہ سے لوٹے اور چپکے چپکے اپنے ساتھیوں کو کانگریس میں شمولیت کے لیے تیار کرنے لگے وہ لوگ تو پہلے ہی تیار تھے لیکن اختر حسین کے سبب کانگریس کا نام نہیں لیتے تھے۔ صلاح ومشورہ کے بعد انہوں نے کانگریس میں اپنی شمولیت کے مسئلے کو اس وقت تک راز میں رکھا جب تک کہ صوبائی صدر اور وزیر بہار شریف نہیں آ گئے۔

اختر حسین، جلسے کی صدارت کر رہے تھے کہ اچانک صوبائی صدر نے بہت ہی ڈرامائی انداز میں محمد یونس اور ان کے ساتھیوں کی کانگریس میں شمولیت کا اعلان کر دیا اختر حسین تو یہ سن کر ہکا بکا رہ گئے۔ صوبائی صدر، محمد یونس کو ہار پہناتے ہوئے کہہ رہے تھے۔

"ہمیں ہر طرح کے اختلافات کو بھول کر بس ایک ہی بات سوچنی ہے، بھارت کس طرح ترقی کرے ایک نیا بھارت ہم کس طرح بنائیں۔ ہمارے کچھ بھائیوں نے ملک کو تقسیم کرا دیا، ایک نیا ملک بنا لیا۔ ہم جب آزادی کی لڑائی لڑ رہے تھے تو ہم نے ایک ایسے بھارت کا سپنا دیکھا تھا جو اکھنڈ ہو وشال ہو، لیکن بدقسمتی سے ایسا نہیں ہو سکا۔ اب ہمارے کچھ بھائیوں کو اپنے کیے کا بہت افسوس ہے اور وہ اپنے کیے کا پرائشچت کرنا چاہتے ہیں ان کے لیے اس سے بہتر بات اور کیا ہو سکتی ہے کہ وہ کانگریس میں شامل ہو کر تن من دھن سے دیش کی سیوا میں لگ جائیں۔۔۔۔۔"

خوب خوب تالیاں بجیں۔ ان میں ضلع کانگریس کے صدر کی حیثیت سے اختر حسین کی تالیاں بھی تھیں جو اندر اندر پیچ وتاب کھا رہے تھے ان سے یہ بات پوشیدہ رکھی

گئی تھی اور ضلع کانگریس کے صدر کی حیثیت سے مشورہ بھی نہیں کیا گیا تھا۔ ظاہر ہے کہ اتنی اہم شمولیت بغیر کسی منصوبہ بندی کے تو ممکن نہیں تھی۔ بعد میں ڈاک بنگلہ کے ڈرائنگ روم میں ایک میٹنگ ہوئی جس میں صدر صوبائی کانگریس، منسٹر، اختر حسین اور محمد یونس شریک ہوئے۔ صوبائی صدر نے وقت کی اہمیت سمجھائی۔ آنے والے الیکشن پر روشنی ڈالی۔ منسٹر نے پچھلے اختلافات اور تلخیاں بھول جانے کو کہا اور اختر حسین و محمد یونس سے اپیل کی کہ وہ ذاتی معاملات سے بلند تر ہو کر ملک اور قوم کے لیے سوچیں، جنھیں اس وقت دونوں کی ضرورت ہے۔ ان دونوں سے وعدہ لیا کہ وہ اپنے ذاتی اختلافات کو بھلا دیں گے تاکہ کانگریس ایک مضبوط تنظیم کی حیثیت سے اُبھر سکے۔

صوبائی صدر اور منسٹر کی کوششوں سے اختر حسین کا دل کسی حد تک صاف ہوا۔ غلطی دراصل صوبائی لیڈروں کی تھی کہ انہوں نے اُن سے مشورہ نہیں کیا، محمد یونس کا اس میں کیا قصور تھا۔ بہرکیف صوبائی صدر کے اختیارات ضلع صدر کے اختیارات سے زیادہ وسیع تھے۔ اب جب کہ محمد یونس کانگریس میں آ گئے تھے، تو انہیں اُن کے ساتھ تعاون کرنا ہی تھا۔

۱۳

گوناگوں مصروفیات کی وجہ سے اختر حسین کی وکالت پر بہت بُرا اثر پڑ رہا تھا۔ اُن کے مؤکل آتے اور اُنہیں غیر حاضر پا کر دوسرے وکیل کے یہاں چلے جاتے۔ یوں بھی اُن کے پاس وہی لوگ آتے جو اُن کی جان پہچان کے ہوتے یا پھر پارٹی کے ممبر۔ سیاسی مصروفیات کی وجہ سے اُنہیں اپنے پیشے کے لیے بہت کم وقت مل پاتا۔ اُن کی گھریلو زندگی بھی خاصی متاثر ہو رہی تھی۔ شیخ الطاف حسین کی زمینداری اور جائداد کی دیکھ بھال بھی اُنہیں کے ذمہ تھی، یوں گماشتہ اور پٹواری جی موجود تھے جن پر بھروسا کیا جا سکتا تھا۔ اصغر حسین کا مقدمہ ہائی کورٹ میں تھا۔ منشی مکند لال چھوٹی چھوٹی عدالتوں کے پیروی کار تھے، ہائی کورٹ کا انہوں نے منہ بھی نہ دیکھا تھا۔ اختر حسین ہی اُنہیں ہائی کورٹ لے گئے تھے، ایک قابل وکیل کو طے کر دیا تھا لیکن منشی جی کو قدم قدم پر اُن کی ضرورت پڑ جاتی اور نہ

چاہتے ہوئے بھی انہیں وقت نکالنا ہی پڑتا۔ اُن کی بیوی اللہ میاں کی گائے تھیں۔ شوہر یا بچّے بیمار پڑ جاتے تو تندہی سے خدمت کرتیں اور جب اچھے ہوتے تو خدا کا شکر ادا کرتیں، میلاد کراتیں، فاتحہ کراتیں۔ تین بیٹے تھے اور ایک بیٹی، سب سے چھوٹی۔ بڑا بیٹا بچپن میں بڑا ہونہار تھا، تین چار سال کی عمر میں جو سوال اس سے کیا جاتا اُس کا ٹھیک ٹھیک جواب دیتا 'لب پہ آتی ہے دعا بن کے تمنّا میری' اور 'سارے جہاں سے اچھا ہندوستاں ہمارا' اس خوش الحانی سے گاتا کہ سننے والے مسحور ہو جاتے۔ اختر حسین نے اُسے جامعہ ملّیہ بھیج دیا۔ شروع میں وہ بالکل ٹھیک رہا۔ اُس کے اچھے رزلٹ سے نہ صرف گھر والے، بلکہ اُس کے اساتذہ بھی بہت خوش تھے۔ پھر پتہ نہیں کیا ہوا کہ اُس کا دل لکھنے پڑھنے سے اُچاٹ ہونے لگا، کلاس سے بھاگ کر چپ چاپ کمرے میں لیٹا رہتا۔ اگر پڑھائی کی طرف سے دھیان ہٹ کر کہیں اور لگتا، تب تو کوئی بات نہ ہوتی۔ اس کی بہت سی توجیہیں ہو سکتی تھیں۔ لیکن مشکل یہ تھی کہ اُس کا کسی کام میں جی نہ لگتا، دوستوں سے بھی دور بھاگنے لگا۔ کوئی بات سمجھائی جاتی تو اُس کی سمجھ میں نہ آتی، کوئی کام کرنے بیٹھتا تو اسے اس طرح بگاڑ ڈالتا کہ پھر وہ کام خراب ہی ہو جاتا۔ امیر جامعہ نے اختر حسین کو اس سلسلے میں ایک تفصیلی خط لکھا اور اُنہیں فوراً دلّی بلایا۔ اختر حسین نے مختلف مصروفیتوں میں اپنے آپ کو اس طرح اُلجھا رکھا تھا کہ اُن کے لیے فوراً کہیں نکل بھاگنا آسان نہیں رہا تھا۔ اتفاق سے اگلے ماہ وہاں کل ہند کانگریس کمیٹی کا اجلاس ہونا طے ہوا تو وہ اس موقع پر دلّی گئے۔ اجلاس کے بعد وہ امیر جامعہ سے ملے تو بیٹے کے بارے میں مزید تفصیل معلوم ہوئی۔ جامعہ والے اب اسے رکھنے کو تیار نہیں تھے۔ یوں بھی اُسے اب جامعہ میں رکھنے کا کوئی فائدہ نہیں تھا۔

امیر جامعہ نے اختر حسین کو مشورہ دیا کہ وہ دلّی آ گئے ہیں تو بیٹے کو کسی اچھے طبیب کو دکھلا دیں۔ یہاں قابل سے قابل ڈاکٹر اور حکیم کی کوئی کمی نہیں ہے۔

بات معقول تھی۔ دوسرے ہی دن اختر حسین بیٹے کو لے کر ایک ڈاکٹر کے یہاں گئے۔ ڈاکٹر نے لڑکے کا ہر طرح سے معائنہ کیا۔ وہ ہر طرح سے صحت مند تھا، اُس کی حرکتوں کا کوئی جواز نہیں تھا۔ ڈاکٹر نے اُنہیں کسی ماہر نفسیات سے رجوع کرنے کو کہا۔ اختر حسین،

ڈاکٹر کے بتائے ہوئے پتہ پر ایک ماہرِ نفسیات سے ملے۔ اُس نے چوبیس گھنٹہ لڑکے کو اپنی نگرانی میں رکھا، ہر طرح اُس کی جانچ کی۔ آخر اس کی تشخیص یہ ہوئی کہ لڑکے کا ذہنی ارتقا ایک خاص مرحلے پر آ کر رک گیا ہے، یہی وجہ ہے کہ وہ غیر معمولی حرکتوں کا مرتکب ہو رہا ہے۔ اختر حسین یہ سُن کر بہت پریشان ہوئے۔ ماہر نفسیات نے اُنھیں لڑکے کو گھر لے جانے کا مشورہ دیا کہ شاید گھریلو ماحول پاکر، سب کی توجہ اور محبّت سے وہ پھر ذہنی ارتقا کی راہ پر لگ جائے۔

اختر حسین بیٹے کو لے کر گھر آ گئے، صحیح بات کسی کو نہیں بتائی۔ سمجھا یہ گیا کہ دوری کی وجہ سے لڑکا گھبرا کر بیمار ہو گیا تھا، اس لیے گھر آ گیا۔ لیکن گھر میں تھا ہی کون، جو اس پر توجّہ اور محبّت کی بارش کرتا۔

سبھی لوگ اپنے اپنے کاموں سے لگے تھے۔ وسیم کو کلکتہ میں نوکری مِل گئی تھی۔ شمیم نے علی گڑھ ہی میں وکالت میں داخلہ لے لیا تھا۔ اختر حسین اوّل تو گھر پر بہت کم ہی رہتے اور اگر کسی وقت رہتے بھی تو لوگ اُن کو یوں گھیرے رہتے کہ اُنہیں گھر کی طرف توجہ کرنے کی فرصت ہی نہ ملتی۔ فیاض میاں عورتوں کے بس کا روگ نہ تھے۔ جیسے جیسے اُن کی عمر بڑھ رہی تھی، ویسے ویسے وہ بچپنے کی طرف مائل ہو رہے تھے۔ وہ ایک مضحکہ خیز شخصیت کے مالک بن چکے تھے۔ دیکھنے میں وہ خاصے بڑے لگتے۔ یوں بھی اٹھارہ برس کی عمر کوئی اتنی کم نہیں ہوتی لیکن حرکتیں بچّوں جیسی تھیں۔ گھر سے باہر نکلتے تو محلے کے بچّے اُن کے پیچھے لگ جاتے اُن کو طرح طرح سے چڑھاتے، اُن پر آوازے کستے، تالیاں بجاتے۔ اگر فیاض میاں خوش ہوتے تو وہ بھی اُن کے ساتھ وہی حرکتیں کرتے، اگر موڈ خراب ہوا تو پتھر لے کر سب کو دوڑاتے پھرتے۔ گھر میں رہتے تو چپ چاپ، ایک جگہ پر بیٹھے رہتے، اگر کوئی کام کرنے کو کہا جاتا تو اس قدر توڑ پھوڑ کرتے کہ کہنے والا توبہ کر کے بیٹھ جاتا۔ عمر ایسی تھی کہ زیادہ سختی بھی نہیں کی جا سکتی تھی۔ گھر بھر کے لیے ایک ذہنی کوفت کا سلسلہ شروع ہو گیا تھا۔

دوسرا بیٹا حامد پڑھنے میں ذرا جی نہ لگاتا۔ اُس کی توجہ کھیل کود اور بد معاشیوں کی طرف زیادہ تھی۔ اختر حسین نے اس کے لیے گھر ہی پر ایک ماسٹر رکھ دیا تھا جو اُسے سبق یاد نہ کرنے پر اس قدر مارتا کہ اس کے بدن پر چوٹ کے نشانات پڑ جاتے۔ اختر حسین نے ماسٹر کو

اس کی کھلی چھوٹ دے رکھی تھی اور اُن کا یہ سخت حکم تھا کہ ماسٹر کے معاملے میں ہرگز کوئی نہ بولے لیکن ہزار مار پیٹ اور سختی کے باوجود حامد اپنی وضع پر قائم رہا۔ وہ بیچارہ بھی مجبور تھا، اُس کا پڑھنے میں جی ہی نہیں لگتا تھا تو وہ کیا کرتا۔ آخر وہ اسکول جاتا ہی تھا، صبح و شام ماسٹر سے پڑھتا بھی تھا، اس کے باوجود وہ آگے نہیں بڑھ رہا تھا تو اس میں اس کا کیا قصور۔ ماسٹر نے عاجز آ کر اختر حسین سے اُس کی شکایت کی تو اُنہوں نے ایک دن حامد کو اس قدر مارا کہ وہ لہولہان ہو گیا۔ ماسٹر نے سمجھا کہ دوسرے روز سے شاید وہ پڑھنے لگے گا' لیکن اُس کی پُرانی روش برقرار رہی۔ اس کی پڑھائی یوں ہی چلتی رہی۔ امتحان کا نتیجہ نکلا تو وہ فیل ہو گیا۔ نتیجہ لے کر وہ گھر نہیں آیا۔ شام سے رات ہو گئی تو لوگوں کو تشویش ہو گئی۔ اختر حسین کو یہ خبر نو بجے رات میں ملی۔ وہ اسی وقت رکشہ پر بیٹھ کر ڈی ایس پی کے یہاں گئے۔ پولیس رات ہی میں حرکت میں آ گئی۔ شہر کا کونا کونا چھان مارا گیا۔ ریلوے اسٹیشن، بس اسٹینڈ پر ڈھونڈا گیا، شہر کے تالابوں کو دیکھا گیا' رشتہ داروں کے یہاں تلاش کی گئی' دوستوں سے پوچھ تاچھ ہوئی لیکن حامد کا پتہ چلنا تھا، نہ چلا۔ رات بھر گھر میں بے چینی رہی۔ بی بی صاحبہ اور حامد کی ماں چپکے چپکے روتی رہیں۔ اختر حسین رات بھر خاموشی سے ٹہلتے رہے۔ اُس رات گھر میں کسی نے کھانا نہیں کھایا۔

دوسری صبح' سویرے ہی پٹواری جی حامد کا ہاتھ پکڑے پہنچے۔ حامد کو دیکھتے ہی اختر حسین کا جی چاہا کہ دوڑ کر بیٹے کے گلے لگ جائیں' لیکن اُن کو فوراً خیال آیا کہ حامد نے ایک بے حد بے اصولی حرکت کی ہے' اِس لیے وہ پیار نہیں' سزا کا مستحق ہے۔ وہ بنا کچھ بولے اپنے کمرے میں چلے گئے۔ حامد اندر گیا تو ماں اور نانی اس سے لپٹ گئیں اور رونے لگیں۔ پٹواری جی نے دروازے کی اوٹ سے بتایا کہ بابو کل شام ہی کو بین پہنچے۔ صاحب سے بہت ڈرے ہوئے تھے، یہاں آنے کو تیار ہی نہیں تھے۔ مجھے پتہ چلا کہ بنا خبر کیے اور پوچھے ماتے یہاں چلے آئے ہیں تو بہلا پھسلا کر یہاں لے آیا کہ گھر میں بہت پریشانی ہو گئی ہو گی۔ پٹواری جی نے یہ بھی سفارش کی کہ بابو سے کچھ باز پرس نہ کی جائے' اسی وعدے پر وہ اُنہیں یہاں لائے ہیں۔

گھر میں سب اختر حسین سے ڈرے ہوئے تھے کہ اُن کا غصہ بہت خراب تھا۔ نہیں کہا جاتا

تو نہیں آتا لیکن جب آتا تو طوفانوں کے انداز میں۔ پٹواری جی کو دیکھ کر وہ جو اپنے کمرے میں گئے تو پھر دیر تک باہر نہیں نکلے۔ اتفاق سے اس روز انہیں گھر ہی پر رہنا تھا۔ بی بی صاحبہ نے حامد کو اندر ہی روک لیا تھا تاکہ جو کچھ ہونا ہو، اُنہیں کے سامنے ہو جائے۔ یوں اختر حسین اُن کے سامنے کبھی بچوں پر ہاتھ نہیں اُٹھاتے تھے۔ جب وہ بہت دیر تک باہر نہیں آئے، اور ناشتہ کا وقت بھی نکل گیا تو بی بی صاحبہ نے اُنہیں اندر بلا بھیجا۔ اُن کے بلانے پر اختر حسین تھوڑی دیر کے بعد اندر آئے تو ناشتہ چوکی پر چُنا ہوا تھا۔ اُن کی بیوی اور بی بی صاحبہ سامنے پلنگ پر بیٹھی تھیں۔

اختر حسین، بی بی صاحبہ کو سلام عرض کر کے ناشتے پر بیٹھ گئے۔ اسی درمیان بی بی صاحبہ حامد کو لے کر باہر آئیں اور اس کے ہاتھوں میں ایک پنکھا دے دیا۔ حامد پنکھا جھلنے لگا۔ اختر حسین نے تھوڑی دیر کے بعد سر اُٹھا کے دیکھا تو حامد کی آنکھوں سے ٹپ ٹپ آنسو گر رہے تھے۔ اُن کا غصہ کافور ہو گیا۔ انہوں نے بیٹے سے پانی کا ایک گلاس مانگا جسے دوڑ کر وہ لے آیا۔ عورتوں کے چہرے پر اطمینان کی لہریں دوڑ گئیں۔ ناشتہ سے فارغ ہو کر اختر حسین نے بیٹے کو دیر تک سمجھایا، لکھنے پڑھنے کی اہمیت بتائی اور زندگی میں آنے والے مقابلے کے بارے میں بتایا۔ حامد سر جھکائے سنتا رہا۔ آخر میں اُس نے وعدہ کیا کہ وہ جی لگا کر پڑھے گا اور خاندان کا نام روشن کرے گا۔

اختر حسین کا تیسرا بیٹا ساجد پڑھنے لکھنے میں بہت تیز تھا۔ ابھی اُس نے پڑھائی شروع ہی کی تھی، لیکن ہونہار بروا کے چکنے چکنے پات دکھائی دینے لگے تھے۔ اُسے ایک بار جو بات سمجھائی جاتی، وہ اس طرح اس کے دماغ میں جاگزیں ہو جاتی کہ پھر نکلنے کا نام نہ لیتی۔ اس کے گھریلو اساتذہ جن میں ایک مولوی صاحب اور ایک ماسٹر صاحب تھے، اس کی ذہانت دیکھ کر دنگ تھے۔ اختر حسین نے ساجد کو بھی جامعہ ملیہ بھیجنے کا سوچا تھا لیکن فیاض کا حشر دیکھ کر رُک گئے تھے۔

فیاض آہستہ آہستہ خاندان بھر کے لیے ایک بوجھ بن گیا تھا۔ اب وہ دیوانوں جیسی حرکتیں کرنے لگا تھا۔ بی بی صاحبہ اُسے لے کر حضرت مخدوم شرف الدین یحیٰی منیریؒ کی درگاہ پر گئیں اور وہاں اس کی صحت کے لیے پورا ایک چلّہ کھینچا۔ پتہ نہیں یہ حضرت مخدومؒ کا

فیض تھا یا خدا کی قدرت کہ چالیس روز تک درگاہ میں قیام کے دوران فیاض خاصا سنجیدہ رہا۔ وہ جامعہ کے زمانے کی کچھ کتابیں بھی ساتھ ہی لیتا آیا تھا، دن بھر اُنہیں کتابوں میں اُلجھا رہتا۔ اُس کے اس طرح سنبھل جانے پر گھر کے لوگ بہت خوش ہوئے۔ چلّے کے خاتمہ پر گھر میں میلاد شریف منعقد ہوئی۔ لیکن ایک ہفتہ کے بعد فیاض پھر اپنے رنگ پر آ گیا۔ دراصل وہ گھر سے باہر نکل گیا تھا اور بچّے پھر اُس کے پیچھے لگ گئے تھے۔ اس دفعہ اُس نے بڑے بڑے پتھر جمع کر کے ان بچّوں کو مارا جس سے کچھ بچّے زخمی بھی ہو گئے۔ اُن کے رشتہ داروں نے فیاض کو ایک میدان میں گھیر کر اس قدر مارا کہ وہ لہولہان گھر واپس آیا۔ بی بی صاحبہ اور اس کی ماں یہ حالت دیکھ کر رونے لگیں۔ ایک زمانہ تھا جب شیخ صاحب کے سامنے گاؤں کیا، شہر کے لوگ زبان کھولنے میں احتیاط برتتے تھے اور آج اُن کے نواسے کو لوگوں نے اس بے دردی سے مارا تھا۔ اختر حسین گھر میں موجود نہیں تھے، یوں بھی اُن سے کچھ کہنے سننے کا فائدہ نہیں تھا۔ وہ اُلٹا بیٹے ہی کو بُرا بھلا کہتے۔ مشکل یہ تھی کہ فیاض گھر میں رہتا بھی نہیں تھا۔ کھانے ناشتے کے وقت بھی غائب رہتا اور ایک ساتھ بیٹھ کر تینوں وقت کے کھانے کھا جاتا۔ اب وہ خاصا جوان تھا لیکن جوانی کے پنجرے میں جو روح تھی، وہ ابھی تک بچّہ تھی ایک خاص مقام پر رُکی ہوئی۔

اختر حسین کی بیٹی باپ کو بہت محبوب تھی۔ ایک خوب صورت، پیاری سی گڑیا، جس کا نام اختر حسین نے بہادر ترک خاتون، خالدہ ادیب خانم کے نام پر خالدہ رکھا تھا۔ وہ ساجد سے ایک سال چھوٹی تھی اور اُسے بھی ساجد کے ساتھ ہی پڑھنے کے لیے بٹھا دیا گیا تھا لیکن وہ پڑھنے سے زیادہ شرارتوں میں مصروف رہتی۔ مولوی صاحب جاڑے کی دھوپ میں صحن میں بے خبری کی نیند سوئے ہوئے تھے، خالدہ نے اُن کی سفید داڑھی پر سُرخ رنگ ڈال دیا، مولوی صاحب ہڑبڑا کے اُٹھ بیٹھے۔ وہ تو خیریت تھی کہ رنگ کچّا تھا اور تازہ، اِس لیے دھونے سے فوراً صاف ہو گیا ورنہ مولوی صاحب کی داڑھی تو گئی تھی۔

ماسٹر صاحب کی سائکل کی ہوا تو وہ اکثر نکال دیتی۔ ماسٹر صاحب ہر وقت اپنی سائکل کو نظروں کے سامنے تو رکھ نہیں سکتے تھے۔ اختر حسین سے شکایت کی جاتی تو وہ صرف مسکرا دیتے۔ خالدہ کو مارنے کی کسی کو اجازت نہیں تھی۔

حامد پر باپ کے سمجھانے کا خاطر خواہ اثر ہوا تھا اور وہ پڑھنے لکھنے میں جی لگانے کی پوری کوشش کر رہا تھا۔ ماسٹر کے دیے ہوئے ہوم ورک بھی کر لیتا اور اپنا سبق یاد کر کے انہیں سنا بھی دیتا۔ اب یہ امید پیدا ہو گئی تھی کہ شاید وہ امتحان میں پاس ہو جائے گا۔

۱۴

ہندوستان کا نیا آئین ملک میں نافذ ہو چکا تھا۔ اس کے تحت ملک میں پہلی بار عام انتخابات ہونے والے تھے۔ ہر اس ہندوستانی کو، جس کی عمر اکیس برس کی ہو چکی ہو، بلا تفریق ذات و مذہب، علم و عقل و شعور، ووٹ دینے کا حق دیا گیا تھا۔ کانگریس نے آزادی کی لڑائی میں ملک کی قیادت کی تھی، اس کے لیڈر گاؤں گاؤں، قریہ قریہ گھومے تھے، اُن کو ہندوستان کے لوگ خوب پہچانتے تھے۔ کانگریس کا انتخابی نشان خوب مشہور ہو گیا تھا۔ کانگریس نے اپنا جھنڈا کچھ یوں بنایا تھا کہ اچھے خاصے پڑھے لکھے لوگ بھی قومی جھنڈے اور کانگریس کے جھنڈے میں فرق نہیں کر پاتے تھے اور اکثر دونوں کو ایک ہی سمجھتے۔ کانگریس کے ادنیٰ سے ادنیٰ کارکن کو بھی یہ پتہ تھا کہ ابھی کانگریس کے ہاتھوں میں جو حکومت ہے، وہ اُسے انگریز تھما گیا ہے، انتخاب کے بعد جو حکومت اس کے ہاتھوں میں آئے گی، وہ اُس کی اپنی ہوگی۔ جب سے انتخاب ہونے کی خبر عام ہوئی تھی، کانگریس کیمپ کے اندر نیا جوش و ولولہ دکھائی دے رہا تھا۔ کل ہند کانگریس کمیٹی نے صوبائی کانگریس کمیٹیوں سے مرکزی اور صوبائی ایوان قانون ساز کے لیے اُمیدواروں کی فہرست مانگی تھی۔ صوبائی کانگریس نے ضلع کانگریس سے مانگی اور ضلع کانگریس نے نچلی سطح سے امیدواروں کے انتخاب کے سلسلے میں چھان بین اور رائے عامہ جاننے کی کوشش شروع کر دی تھی۔

اختر حسین اگرچہ ضلع کانگریس کے صدر تھے لیکن وہ خود اُمیدوار نہیں ہونا چاہتے تھے۔ اُن کے ساتھی اُن پر بہت زور ڈال رہے تھے کہ وہ بہار شریف کے شہری حلقہ سے اُمیدوار ہوں۔ اس حلقۂ انتخاب میں مسلمانوں کی اچھی خاصی تعداد تھی۔ صوبائی کانگریس کے صدر نے ان لوگوں کو یہ اشارہ دیا تھا کہ اس حلقہ سے پارٹی کسی مسلمان ہی کو اپنا اُمیدوار بنائے گی اور

کانگریس کو اختر حسین سے زیادہ مناسب اُمیدوار مل ہی نہیں سکتا تھا۔ یوں محمد یونس نے بھی اُمیدواری کی درخواست دی تھی۔ لیکن عام خیال یہ تھا کہ مسلم لیگی پس منظر رکھنے کے باعث کانگریس اُنہیں اپنا اُمیدوار نہیں بنائے گی۔ کانگریس نے انتخابی حکمت عملی یہ اپنائی تھی کہ جس حلقے میں جس ذات و مذہب کے لوگ اکثریت میں ہوں، وہاں اسی ذات و مذہب کے افراد کو اُمیدوار بنایا جائے۔

نچلی سطح پر جب سبھی قسم کی چھان بین ہو گئی اور ناموں کی فہرست تیار ہو ئی تو ضلع کانگریس کی میٹنگ میں اس فہرست پر غور و خوض کیا گیا۔ اس کے علاوہ صوبائی اور مرکزی جماعت کو بھی ناموں پر غور کرنا تھا۔ کانگریس پہلی بار عوام کے پاس جارہی تھی، اس میں بہت زیادہ احتیاط نہایت ضروری تھی۔ ضلع کانگریس نے بہار شریف شہری حلقہ سے اختر حسین کے نام کی سفارش اتفاق رائے سے کی۔ فائنل فہرست تیار ہو جانے کے بعد اسے ضلع کانگریس کے جنرل سکریٹری کی معرفت صوبائی کانگریس کے دفتر کو روانہ کر دیا گیا۔ جن لوگوں کے نام فہرست میں تھے اور جن لوگوں کے نہیں تھے، وہ سبھی پٹنہ پہنچ کر دوڑ دھوپ میں لگ گئے۔ صوبائی کانگریس کے دفتر کے پاس تو اتنی بھیڑ لگی رہتی کہ کسی میلے کا گمان ہوتا، اس کے بعد صدر کانگریس اور چیف منسٹر کے مکانوں پر بھیڑ دکھائی پڑتی۔ سبھی لیڈروں کے مکانات اُمیدواروں سے بھرے ہوئے تھے۔ اختر حسین، بہار شریف ہی میں رہے۔ یوں بھی اُنہیں محض اُمیدواری حاصل کرنے کے لیے اس قسم کی بھاگ دوڑ بہت مضحکہ خیز لگ رہی تھی۔ اُن کے خیال میں انتخابات کانگریس کے لیے ایک چیلنج تھے جسے ہر کارکن کو قبول کرنا تھا۔ وہ ضلع کے دور دراز علاقوں کے دورے پر جارہے تھے، کارکنوں سے ملاقات کر رہے تھے اور اُنہیں عوام کے ساتھ گھل مل جانے کی ترغیب دے رہے تھے۔ ہر آدمی یہی سمجھ رہا تھا کہ کانگریس کو عظیم فتح سے کوئی طاقت نہیں روک سکتی۔ کانگریس جس کو بھی اُمیدوار بنائے گی، وہ ضرور کامیاب ہوگا۔ لیکن اختر حسین کو پنڈت نہرو کی یہ بات نہیں بھولتی تھی کہ دوسری جنگ عظیم کے بعد اُسی برطانوی قوم نے چرچل کو شکست کا منہ دکھلایا جس نے رہتی دنیا تک کے لیے اُسے ہیرو بھی بنایا۔

اختر حسین کے قریبی دوست، دست راست اور ضلع کانگریس کے نائب صدر راجو دھیا پرشاد کسی ضروری کام سے پٹنہ گئے ہوئے تھے، وہاں سے لوٹ کر سیدھے اختر حسین کے پاس آگئے۔

اختر حسین اپنی خواب گاہ میں جا چکے تھے، انہیں خبر ہوئی تو فوراً نکل آئے۔ اجودھیا بابو کا اس وقت آنا ضرور کسی اہم بات کا پیش خیمہ تھا۔ وہ سنجیدہ آدمی تھے اور وقت کی پہچان رکھتے۔

اختر حسین نے انہیں دیکھتے ہی پوچھا۔

"کیا بات ہے اجودھیا بابو۔؟"

"کیا بتاؤں بھائی صاحب۔ مجھے تو ایسا لگتا ہے کہ کانگریس کا دماغ خراب ہو گیا ہے۔"

"کیا ہوا۔؟"

"آپ پٹنہ گئے نہیں اور وہاں لوگ اپنی چال چل رہے ہیں۔"

"آپ امیدواری کے بارے میں کہہ رہے ہیں کیا۔؟"

"ہاں ہاں، وہی تو کہہ رہا ہوں۔ آپ کو صوبائی صدر سے ملنا چاہیے تھا۔"

"ارے چھوڑیے بھی۔ آپ تو جانتے ہی ہیں کہ آپ ہی لوگوں کے زور دینے پر میں نے درخواست دی ہے ورنہ مجھے خود دلچسپی نہیں۔ پارٹی جس کو چاہے۔ اپنا امیدوار بنائے ہمیں پارٹی کی ڈسپلن کو قائم رکھنا ہے۔"

"وہ تو ٹھیک ہے۔ مگر آپ جانتے ہیں کہ پارٹی کس کو اپنا امیدوار بنا رہی ہے۔؟"

"میں کہہ سکتا ہوں۔ ضلع سے تو نام میرا ہی گیا تھا۔"

"محمد یونس کو۔"

اختر حسین کو ایک جھٹکا سا لگا۔

"کیا کہہ رہے ہیں آپ۔؟ ان کا تو کہیں پر نام بھی نہیں ہے۔ درخواست تو سیکڑوں نے دی ہے۔"

"اسی کا تو رونا ہے۔ پارٹی اگر کسی معمولی کارکن کو امیدوار بناتی تو ہم لوگوں کو خوشی ہوتی لیکن یہاں تو۔۔۔"

"آپ کو یہ خبر کیسے ملی۔؟"

"صوبائی کانگریس کے صدر رام نرائن شرما نے مجھے خود بتائی ہے اور وہی محمد یونس کے سب سے بڑے وکیل بھی ہیں۔"

یہ اختر حسین کے لیے دوسرا اچنبھا تھا۔ ان کے مقابلے میں کانگریس ایک پرانے مسلم لیگی کو

کھڑا کر رہی ہے ــــــــ انہیں تو اجودھیا بابو کی بات پر یقین ہی نہیں آ رہا تھا۔ کچھ دیر سوچتے رہنے کے بعد وہ بولے۔

" اچھا تو بتائیے، اب کیا کیا جائے۔؟ "

" دیکھیے ابھی فیصلہ نہیں ہوا ہے، آپ فوراً پٹنہ چلیے، ہو سکتا ہے کہ دلّی بھی جانا پڑے ــــــــ "

" تو گویا میں بھی اُمّیدواری کے لیے پیروی کروں ــــــــ؟ "

" سبھی کر رہے ہیں۔ موقع ایسا ہے کہ کرنا ہی پڑے گا، بے انصافی کو روکنے کی کوشش تو ہونی ہی چاہیے۔ "

" لیکن اس طرح کی بھاگ دوڑ میرے مزاج کے بالکل خلاف ہے۔ میرے لیے تو پیروی کا تصوّر بھی محال ہے۔ "

" سُنیے اِس وقت سب کچھ بھول جائیے۔ ہم لوگ سیاست کی دیوی کے پجاری ہیں، کسی مندر کے نہیں اور سیاست کی دیوی رات اور دن مسکراتی رہتی ہے۔ "

اختر حسین، اجودھیا بابو کی بات سن کر سوچ میں پڑ گئے۔ انہیں یہ باتیں انہونی سی لگ رہی تھیں۔ جو باتیں انہوں نے خواب و خیال میں بھی نہ سوچی تھیں، وہ اُن کے سامنے آ رہی تھیں، اُنہیں برداشت کرنی پڑ رہی تھیں۔ اگر کانگریس اُن کے علاوہ کسی کو بھی اپنا اُمیدوار بناتی تو انہیں اس میں کوئی اعتراض نہ ہوتا، لیکن محمد یونس کا اُن کے مقابلے میں نام آنا، انہیں برسرِعام بے عزّت کرنے کے مترادف تھا۔ اُن کی قربانیوں کا یہی صلہ تھا ــــــــ؟

وہ سوچتے رہے۔ تھوڑی دیر کے بعد اُنہوں نے سر اُٹھایا۔

" میں پٹنہ تو جا سکتا ہوں لیکن ایک شرط ہے۔ "

" کیا ــــــــ؟ "

" آپ بھی میرے ساتھ چلیں گے اور بات آپ ہی کریں گے، میں خاموش رہوں گا۔ "

" میں بخوشی تیار ہوں، آپ چلیے تو ــــــــ "

طے ہوا کہ دوسری صبح پٹنہ چل دیا جائے۔ اجودھیا بابو رات میں وہیں رک گئے۔ علی الصبح دونوں پٹنہ روانہ ہو گئے۔ عام لوگوں کے لیے تو مشکل تھی لیکن ضلع کانگریس کا صدر

جس وقت چاہے، صوبائی صدر یا چیف منسٹر سے مل سکتا تھا۔ دس بجے صبح دن میں اُن لوگوں کی ملاقات صوبائی کانگریس کے صدر رام نرائن شرما سے ہوگئی۔ شرما جی کو اس وقت بہت سے لوگ گھیرے ہوئے تھے۔ اختر حسین اور اجودھیا بابو انتظار کرتے رہے کہ وہ فارغ ہوں تو تنہائی میں اُن سے بات کی جاسکے۔ اس کا موقع اُن لوگوں کو دوپہر کے بعد ہی مل سکا۔ شرما جی خود اُن سے مخاطب ہوئے۔

"کہیے کیسے آنا ہوا؟"

اجودھیا بابو نے کہنا شروع کیا۔

"ہم لوگ اس غرض سے آئے ہیں کہ آپ نے بہار شریف شہری حلقہ سے محمد یونس کو امیدوار بنانا چاہا ہے۔ یہ بہت بڑی بے انصافی ہے۔ وہ آج کانگریس میں آئے ہیں جب کہ اختر حسین نے کانگریس کے لیے لاٹھیاں کھائی ہیں، گالیاں سنی ہیں اور بے عزتی برداشت کی ہے۔ ان کے مقابلے میں محمد یونس کو امیدوار بنانا کہاں کا انصاف ہے؟"

شرما جی سکون سے ان کی بات سنتے رہے۔ اجودھیا بابو خاموش ہوئے تو بولے۔

"آپ کو اس سلسلے میں اور بھی کچھ کہنا ہے۔؟"

"اور کچھ نہیں کہنا ہے، بس انصاف کی دہائی دینی ہے۔"

"تو اب میری سُنیے ——" شرما جی نے کہنا شروع کیا۔ "سب سے پہلی بات تو یہ ہے کہ ہمیں یہ نہیں دیکھنا ہے کہ کل کون کیا تھا بلکہ یہ کہ آج کون کیا ہے اور کیا کر رہا ہے۔ محمد یونس کانگریس میں شامل ہو چکے ہیں۔ اس لیے اب وہ ہمارے ہیں۔ وہ بہترین مقرر ہیں، عوام کی نبض کو پہچانتے ہیں۔ دوسری بات یہ ہے کہ ہمیں اگر یہ چناؤ جیتنا ہے تو پھر ذاتی بھاؤنا سے اوپر اُٹھنا ہوگا۔ محمد یونس پارٹی کے لیے ایک سرمایہ بن سکتے ہیں اور اُن کے جیتنے میں تو کوئی شک ہی نہیں۔"

شرما جی کی تقریر ختم ہوئی تو اجودھیا بابو بولے۔

"لیکن پرانے کانگریسیوں کے ساتھ جو سوتیلے پن کا سلوک ہو رہا ہے، اس کا کیا ہوگا؟"

"سب سے پہلے تو اختر حسین صاحب کو یہ بات سوچنی ہی نہیں چاہیے کہ اُن کے ساتھ

بے انصافی ہو رہی ہے اُن کے سامنے اپنے مفاد سے زیادہ پارٹی کا مفاد عزیز ہونا چاہیے۔ کیا آپ اس بات سے انکار کر سکتے ہیں کہ محمد یونس مسلمانوں میں اختر حسین صاحب سے زیادہ اثر رکھتے ہیں۔ یہ ہم لوگوں نے مسلم لیگ کے زمانے میں دیکھ لیا ہے' پھر وہ اختر حسین صاحب سے زیادہ اچھا بولتے ہیں' اُن کے پاس چناؤ میں خرچ کرنے کے لیے کافی پیسے ہیں۔ ایسی صورت میں' ہمیں محمد یونس سے اچھا اُمیدوار کون مل سکتا ہے۔ آپ جانتے ہیں کہ بہار شریف سے بہت سے مسلمان امیدوار کانگریس کی مخالفت میں کھڑے ہوں گے' مقابلہ بہت سخت ہوگا۔ اس لیے ہمارا امیدوار بھی تگڑا ہونا چاہیے۔"

شرما جی کی باتوں سے ایسا لگ رہا تھا جیسے وہ طے کر چکے ہوں کہ کانگریس بہار شریف سے محمد یونس ہی کو اپنا امیدوار بنائے گی۔ وہ جیسے کچھ سننے کو تیار ہی نہیں تھے۔ پھر بھی اجودھیا بابو نے اپنی بات کہہ دی۔

" حضور آپ لوگ مسلمانوں کے بیچ یہ احساس پیدا کرنا چاہتے ہیں کہ لیڈر دراصل مسلمان کانگریسی نہیں بلکہ مسلم تھے۔ اس طرح آپ جناح صاحب کی اس بات کو سچ ثابت کر رہے ہیں کہ کانگریسی مسلمان show boys ہیں۔ بھلا بتائیے تو ایسی صورت حال میں ان مسلمانوں کے کیا احساسات ہوں گے جو کانگریس کے لیے مٹ گئے اور جنھوں نے کانگریس کے لیے اپنے آپ کو برباد کر دیا۔"

شرما جی کو اجودھیا بابو کی تقریر بھی برداشت کرنا پڑی۔ انہوں نے جواب دیا۔

" بھئی میں کیا کر سکتا ہوں۔ یہ فیصلہ تو صوبائی کانگریس نے کیا ہے۔ فہرست دلی بھیجی جا چکی ہے۔ اب تو جو بھی فیصلہ ہوگا' وہ ہائی کمانڈ کرے گا۔"

اختر حسین اور بابو اجودھیا سمجھ گئے کہ اب شرما جی اس مسئلہ پر زیادہ باتیں نہیں کرنا چاہتے وہ دونوں باہر نکل آئے۔ اختر حسین بولے۔

" آپ نے خواہ مخواہ مجھے ذلیل کرایا۔ رہی سہی عزت بھی گئی۔ شرما جی ہمیشہ عزت سے ملتے تھے اب وہ کیا سوچتے ہوں گے کہ میں بھی امیدواری کے لیے اور لوگوں کی طرح پیروی کرتا پھر رہا ہوں۔"

" آپ تو بیکار ہی پبلک لائف میں ہیں۔ غلط لوگوں سے لڑنے میں تو داؤں پیچ

چلتا ہی ہے۔ آپ اس طرح گھبرائیں گے تب پھر ہو چکی سیاست۔"

"بھئی وہ جس کو چاہیں، اپنا اُمیدوار بنائیں۔ ہمیں اس سے کیا لینا دینا۔ ہمیں تو ایک وفادار سپاہی کی طرح اُن کی بات ماننی ہے۔"

"دیکھیے، وہ سب اپنی جگہ پر ٹھیک ہے، لیکن آزادی کی لڑائی ہم نے اس لیے نہیں لڑی کہ اس وقت تماشا دیکھنے والے، اب ہمیں تماشا بنائیں ——— ہم اِس طرح اپنی قربانی کو رائگاں نہیں جانے دیں گے۔"

"خیر، اب بتائیے، کرنا کیا ہے۔؟"

اختر حسین، اُکتا کر بولے۔

"کرنا اب یہ ہے کہ سیدھے دلّی چلنا ہے، پٹنہ میں اب کچھ نہیں ہونا۔"

"بھئی میں تو نہیں جاؤں گا دِلّی۔"

"آپ چنوتی کا سامنا کرنے سے گھبراتے ہیں۔"

"چنوتی کا کیا سوال ہے۔ وہاں ہوگا بھی کیا ——— جو صوبائی لیڈر چاہیں گے وہی ہوگا نا ———؟"

"ہم لوگ آواز تو اُٹھا ہی سکتے ہیں۔ ہم لوگوں نے جب انگریزوں کے ظلم کے خلاف ہتھیار اُٹھایا تو اپنے لوگوں کی غلطیوں کے خلاف احتجاج تو کر ہی سکتے ہیں۔"

اختر حسین نے جب دیکھا کہ اجودھیا بابو کسی طرح ماننے والے نہیں تو خاموش ہو گئے، پھر بولے۔

"لیکن اجودھیا بابو دِلّی جائیں گے کیسے۔ میرے پاس تو اتنے پیسے نہیں ہیں۔"

"پیسوں کا انتظام ہو جائے گا، آپ اس کی فکر نہ کریں، بس صرف چلے چلیں اور آج ہی۔"

اختر حسین پس و پیش میں پڑ گئے۔ وہ صرف ایک روز کے لیے آئے تھے، اس لحاظ سے پیسے بھی کم لائے تھے۔ اگر دلّی جانا ضروری تھا تو وہ ایک بار اپنے گھر ہو آنا چاہتے تھے۔ لیکن اجودھیا بابو مصر تھے کہ بس آج ہی چلنا ہے، اس میں دیر نہیں کرنی ہے۔ وہ لا کالج ہاسٹل میں اپنے داماد کے پاس گئے تاکہ اس سے کچھ روپے

قرض نے سکیں۔ اتفاق سے داماد کے پاس بھی پیسے نہیں تھے، لیکن اُس نے بھاگ دوڑ کر پیسوں کا انتظام کر ڈالا۔ اختر حسین نے دیکھا کہ اب انہیں دلّی جانا ہی ہوگا تو بولے۔

"لیکن دیکھیے اجودھیا بابو، میں وہاں بھی چُپ رہوں گا۔ مجھ سے پیروی نہ ہو سکے گی اور وہ بھی اپنی۔"

"جانتا ہوں جی، جانتا ہوں ــــــ آپ صِرف میرے ساتھ چلیے، کچھ بولیے گا نہیں، صرف ساتھ رہیے گا، بس یا اور کچھ۔؟"

اختر حسین کے ہونٹوں پر بے ساختہ مسکراہٹ آ گئی۔ رات کی گاڑی سے وہ لوگ دلّی روانہ ہو گئے۔

۱۵

دوسرے دن دوپہر کے بعد وہ لوگ دِلّی پہنچے۔ دِلّی میں اس وقت سارے ہندوستان سے کانگریس کے اُمیدوار آئے ہوئے تھے۔ کانگریس کی امیدواری کا پرچہ فتح کا پروانہ تھا۔ اس لیے ہر ایک اُسے حاصل کرنا چاہتا تھا۔ دِلّی میں تِل دھرنے کو جگہ نہ تھی۔ سبھی ہوٹل، آشرم، سرائے اور مہمان خانے بھرے ہوئے تھے۔ انگریزوں کی لوٹ کھسوٹ کے باوجود ہندوستانیوں کے پاس ابھی اتنے روپے تھے کہ وہ اسے اپنی خوشی سے بہا سکتے تھے۔ اختر حسین بیٹے کی طالب علمی کے زمانے میں دلّی آئے تھے تو جامعہ کے مہمان خانہ میں ٹھہرے تھے۔ وہ اجودھیا بابو کو لے کر وہیں پہنچ گئے۔ اتفاق سے مہمان خانہ خالی تھا۔ ٹھہرنے کی اجازت بھی مِل گئی۔ وہاں کچھ دیر آرام کرنے کے بعد دونوں پنڈت نہرو کی کوٹھی پر گئے تاکہ ان سے ملاقات کی کوئی صورت نکال سکیں۔ وہاں پتہ چلا کہ وہ دوسری صبح لائن میں کھڑے ہو کر وزیرِ اعظم سے ایک آدھ منٹ بات کر سکتے ہیں۔

دونوں لوٹ آئے۔ رات میں بیٹھ کر اجودھیا بابو نے بڑی محنت سے ایک تفصیلی رپورٹ لکھی، جسے اختر حسین نے بہت ہی سرسری نگاہوں سے دیکھا۔ اس رپورٹ کو ایک میمورنڈم کی شکل دے کر اجودھیا بابو رات ہی میں اُس کی کئی کاپیاں ٹائپ کرا کر لائے۔

اختر حسین کو یہ باتیں بڑی عجیب لگ رہی تھیں۔ اُمیدواری کے لیے پیروی اُن کے لیے بالکل نئی چیز تھی۔

دوسری صبح کو سویرے ہی وہ لوگ وزیراعظم کی کوٹھی پر لائن میں لگ گئے۔ وزیراعظم لوگوں سے بات چیت کرتے ہوئے اور شکایات سنتے ہوئے اُن کے پاس آئے۔ وہ لوگ پنڈت نہرو کے لیے اجنبی نہیں تھے۔ دونوں نے انہیں جے ہند کہا تو وہ بولے۔

"کیا بات ہے اختر حسین صاحب اور اجودھیا بابو۔۔؟"

"حضور، کانگریس کی اُمیدواری کے سلسلے میں بڑی بے انصافی ہو رہی ہے۔"

اجودھیا بابو جلدی سے بولے۔

"کیسی بے انصافی۔۔؟"

"حضور، اختر حسین صاحب کی جگہ ایک پرانے مسلم لیگی محمد یونس کو اُمیدوار بنایا جا رہا ہے اور ... ..."

"محمد یونس کانگریس کے ممبر ہیں کیا۔۔؟"

"مسلم لیگ میں تھے، اب کانگریس کے ممبر ہیں، اختر حسین صاحب سے اُن کا کیا مقابلہ۔ یہ ٹھہرے پرانے کانگریسی، کانگریس کے لیے مار کھائی، گالیاں سُنیں ..."

"آپ لکھ کر لائے ہیں۔؟"

اجودھیا بابو نے ٹائپ شدہ میمورنڈم اُن کے حوالہ کر دیا۔

"آپ مولانا آزاد سے بھی مِل لیجیے اور پارٹی کے جنرل سکریٹری کو سب باتیں بتا دیجیے، میں اُنہیں فون کر دوں گا۔"

پنڈت جی یہ کہہ کر آگے بڑھ گئے۔

اجودھیا بابو خوش خوش، اختر حسین کو لیے ہوئے مولانا آزاد کی کوٹھی پر پہنچ گئے۔ وہاں بھی بھیڑ کا عالم تھا لیکن بے ترتیب ہوتے ہوئے بھی بھیڑ پر وہاں خاموشی طاری تھی۔ زیادہ تر ملاقاتیوں کے وقت مقرر تھے۔ لوگ کرسیوں پر بیٹھے اور ادھر اُدھر کھڑے تھے سکریٹری ایک ایک کر کے نام پکارتا اور لوگ اندر کمرے میں جا کر منٹ آدھ منٹ کے لیے مولانا سے مِل آتے۔ ان لوگوں نے سکریٹری سے بات کی اور اِسی وقت ملاقات کرا دینے کی

درخواست کی۔

"بہت مشکل ہے۔ سبھی ملاقاتیں پہلے سے طے ہیں اور اب کوئی گنجائش نہیں ہے"۔

"دیکھیے، ہم لوگوں کا ابھی اور اسی وقت ملنا بہت ضروری ہے۔ وزیر اعظم کی ہدایت ہے۔ آپ ہم لوگوں کے نام مولانا تک پہنچا دیجیے۔ شاید وہ بلا لیں"۔

"ہم لوگوں کو سخت حکم ہے کہ کوئی آئے، درمیان میں کسی قسم کی مداخلت نہ کریں۔ ورنہ مجھے آپ لوگوں کے ملوا دینے میں کیا اعتراض ہو سکتا تھا۔"

"ہم لوگ بہت دور سے آئے ہیں۔ مولانا ہم لوگوں سے اچھی طرح واقف ہیں۔ آپ کسی طرح ہم لوگوں کے نام ان کے پاس بھیج دیجیے"۔

"دیکھیے ایسا کیجیے کہ پورٹیکو میں کھڑے ہو جائیے۔ مولانا تھوڑی دیر کے بعد نکلیں گے۔ گاڑی پر چڑھتے ہوئے آپ لوگ اُن سے بات کر لیجیے گا۔"

اس کے سوا کوئی چارہ بھی نہیں تھا۔ وہ لوگ پورٹیکو میں کھڑے ہو گئے۔ کافی دیر کے بعد مولانا دفتر جانے کے لیے باہر نکلے۔ بھیڑ اس وقت تک قائم تھی۔ مولانا کے لیے ان کے اسٹاف نے راستہ بنا دیا اور وہ آہستہ آہستہ قدموں سے سیڑھیوں سے اترنے لگے۔ اتنے میں اُن کی نگاہ ان لوگوں پر پڑ گئی، وہ ٹھٹھک سے گئے۔

"کہیے کیا بات ہے۔؟"

"حضور، ہم لوگوں کو پنڈت جی نے ملنے کو کہا ہے۔ ایک بہت بڑی بے انصافی کی طرف توجہ دلانی ہے۔"

"کیسی بے انصافی۔؟"

"حضور، بہار شریف حلقے سے اختر حسین صاحب کی جگہ محمد یونس کو امیدوار بنایا جا رہا ہے جو پرانے مسلم لیگی تھے۔ اختر حسین صاحب، شیخ الطاف حسین کے داماد ہیں اور۔۔۔۔"

"آپ لکھ کر لائے ہیں۔؟"

اجودھیا بابو نے میمورنڈم مولانا کے ہاتھوں میں دیدیا۔ مولانا نے کاغذ جیب میں رکھ لیا اور اپنی گاڑی پر سوار ہو کر روانہ ہو گئے۔

وہاں سے یہ لوگ کل ہند کانگریس کمیٹی کے دفتر پہنچے ۔ پارٹی کے جنرل سکریٹری کو اپنے ناموں کی چِٹ بھجوائی ۔ جنرل سکریٹری لوگوں سے ملنے میں مصروف تھے ۔ اُن لوگوں کو بیٹھنے کو کہا گیا ۔ تھوڑی دیر کے بعد اندر طلبی ہوئی ۔ شاید وزیر اعظم نے جنرل سکریٹری کو فون پر ملنے کی ہدایت کر دی تھی ۔

" بتائیے ، کیا بات ہے ۔ ؟ " جنرل سکریٹری نے پوچھا ۔

اجودھیا بابو نے اُن کو وہ تمام باتیں تفصیل سے بتائیں جو وہ وزیر اعظم اور مولانا آزاد سے مختصر طور پر کر چکے تھے ۔ جنرل سکریٹری نے اُن کی باتوں کو غور سے سُنا ، اپنی ڈائری میں کچھ نوٹ کیا ، اُن کا میمورنڈم وصول کیا اور اُنہیں یہ یقین دلایا کہ کانگریس پارلیمنٹری بورڈ کی میٹنگ میں اُن کے اُٹھائے ہوئے مسئلے پر غور و خوض کیا جائے گا ۔ پارلیمنٹری بورڈ کی میٹنگ تیسرے روز ہونے والی تھی ۔ اختر حسین نے قیام گاہ واپس آتے ہوئے اجودھیا بابو سے کہا ۔

" ہم لوگ تو سبھی اہم لیڈروں سے مِل چکے ۔ اب واپس چلیں ۔ ؟ "

" دھیرج رکھیے بھائی صاحب ، بورڈ کی میٹنگ ہو جانے دیجیے ۔ اب اُس کا فیصلہ سُن کر ہی ہم لوگ جائیں گے ۔ "

" بھلا بتائیے تو کیا کریں گے اتنے دنوں تک ، جب کہ کسی سے ملنا بھی نہیں ہے ۔ "

" واہ ، دلّی گھومیں گے ، قطب مینار دیکھیں گے ، لال قلعہ دیکھیں گے ، ذرا بازار کا حال چال لیں گے ، اب ملنا جلنا بند ۔ "

" تو کیا ہم لوگ دلّی گھومنے آئے ہیں ۔ ؟ "

" آئے تو گھومنے کے لیے نہیں ہیں ، لیکن اب گھومیں گے ، خوب گھومیں گے ۔ کیا گھومنا کوئی خراب بات ہے ؟ "

اختر حسین ، اجودھیا بابو کے مذاق پر بوکھلا کر چُپ ہو گئے ۔ اجودھیا بابو اُن کی بوکھلاہٹ سے کچھ دیر تک لطف اندوز ہوتے رہے ، پھر بولے ۔

" بھائی صاحب ، اب یہ آپ کی نہیں ، ہم سبھی کی عزت کا سوال ہے ۔ ضلع کانگریس کی عزت کا سوال ہے ۔ جس کام میں ہم نے ہاتھ لگایا ہے ، اُسے یوں ہی چھوڑ کر نہیں ۔ جائیں گے

اجودھیا بابو نے مذاق نہیں کیا تھا ۔ وہ لوگ واقعی تین روز تک دلّی گھومتے رہے ۔

قطب مینار گئے، لال قلعہ گئے، حضرت نظام الدین اولیاء کی درگاہ پر حاضری دی۔ دونوں نے شاید اپنی نوجوانی میں فلم دیکھی ہوگی اب تو بالکل چھوڑ رکھی تھی، سو یہاں فلم بھی دیکھ لی۔ سہراب مودی کی فلم "جیلر" آئی ہوئی تھی۔ "پکار" کے بعد ان لوگوں نے سہراب مودی کی کوئی فلم نہیں دیکھی تھی۔ اب اتنے دنوں کے بعد اپنے پسندیدہ اداکار کو دیکھا تو مزا آگیا۔ چاندنی چوک میں ان لوگوں نے "گول گپے" اور چاٹ کھائی، جامع مسجد کی نہاری چکھی اور صدر بازار کی برفی کھائی۔

تین روز تو یوں گزر گئے، جیسے منٹوں پر سوار تھے اور منٹوں کو بھی پر لگے تھے۔

تیسرے روز کانگریس پارلیمنٹری بورڈ کی میٹنگ ہوئی۔ یوں میٹنگ تو آٹھ بجے رات میں شروع ہوئی لیکن صبح تک اس کا سلسلہ چلتا رہا۔ بہار کے لیے اُمیدواروں کی فہرست کو آخری شکل دے دی گئی۔ صوبائی کانگریس کے صدر اور چیف منسٹر خصوصی مدعوئین کی حیثیت سے شریک تھے۔ اجودھیا بابو نے اختر حسین سے بہت کہا کہ ہم لوگ بھی رات بھر کانگریس کمیٹی کے دفتر میں رہیں۔ وہاں کون سی رات ہونے والی ہے۔ وہاں اتنے لوگ ہوں گے کہ ایک میلہ لگا رہے گا، لیکن اختر حسین اس کے لیے بالکل تیار نہیں ہوئے۔ یوں تو سبھی باتیں اُنہیں خلافِ اصول لگ رہی تھیں لیکن کمبل اوڑھ کر رات بھر کمیٹی کے دفتر میں رہنا تو اُنہیں بالکل ہی ناقابل برداشت محسوس ہوا۔ اجودھیا بابو نے دفتر میں کام کرنے والے ایک کلرک کو اس بات کے لیے راضی کیا کہ وہ فون پر اُنہیں میٹنگ کے بارے میں اطلاع دیتا رہے۔ میٹنگ تو بند کمرے میں ہو رہی تھی اس لیے اُس کا حال تو معلوم کرنا اُس کے بس میں نہیں تھا البتہ وہ جاری رہنے اور خاتمہ کی اطلاع دے سکتا تھا سو وہ ہر دو گھنٹے پر اُنہیں اس کی اطلاع دیتا رہا۔

کوئی چھ بجے صبح میں اُس نے اطلاع دی کہ میٹنگ ختم ہو گئی۔ اجودھیا بابو، اختر حسین کو لیے ہوئے اسی وقت جنرل سکریٹری کے یہاں پہنچے۔ وہ اُسی وقت میٹنگ سے واپس آئے تھے تھکے ہارے سے۔ اُن لوگوں کو اس وقت دیکھ کر وہ کچھ متعجب بھی ہوئے۔ لان میں پھیلی ہوئی دھوپ میں وہ لوگ کرسیوں پر بیٹھ گئے۔

"بھئی آپ کی اُمیدواری کا فیصلہ تو ہو گیا لیکن اس کے لیے بڑی جنگ کرنی پڑی۔"

اختر حسین اور اجودھیا بابو کے چہروں پر سکون اور مسرت کی لہریں دوڑ گئیں۔

" صوبائی صدر کانگریس اور چیف منسٹر بضد تھے کہ محمد یونس کو امیدوار نامزد کیا جائے۔ لیکن مولانا آزاد نے ان لوگوں کو ڈانٹ پلائی۔ اُن لوگوں کی ضد پر پنڈت جی بھی خاموش ہو گئے تھے، لیکن مولانا کے سامنے کوئی کچھ بول ہی نہ سکا۔ اب آپ لوگ جائیے اور الیکشن میں زور شور سے لگ جائیے۔ صوبائی صدر اور چیف منسٹر کا کہنا ہے کہ اُس حلقہ سے آپ کامیاب نہیں ہو سکتے کیوں کہ وہ مسلم لیگ کا گڑھ رہا ہے۔ آپ کو وہاں سے جیتنا ہے، اور مولانا کی لاج بھی رکھنی ہے۔ پارٹی آپ کی ہر طرح مدد کرے گی۔"

۱۶

اختر حسین اور اجودھیا بابو خوش خوش دلّی سے لوٹے۔ اس وقت تک اُمیدواروں کی فہرست اخباروں میں آچکی تھی۔ وہ لوگ بین ہاؤس پہنچے تو وہاں کافی تعداد میں کانگریس کارکن جمع تھے۔ وہاں اختر حسین زندہ باد، اجودھیا بابو زندہ باد، کانگریس زندہ باد کے نعرے لگائے گئے۔ اختر حسین اور اجودھیا بابو کو ہار پہنائے گئے۔ اتنے میں محمد یونس کی موٹر صحن میں داخل ہوئی۔ محمد یونس نے گلے لگ کر اختر حسین کو مبارک باد دی۔ اُنھوں نے یہ بھی وعدہ کیا کہ ایک کانگریسی ہونے کے ناتے وہ اُن کی پوری حمایت کریں گے۔

اختر حسین کا انتخابی کام زور شور کے ساتھ شروع ہوا۔ کانگریسی کارکنوں میں ایک نیا ولولہ تھا ___

آزادی حاصل کرنے کے بعد پہلی بار وہ عوام کے سامنے جا رہے تھے۔ اُنھیں حکومت بنانی تھی۔ اُن کی مخالفت میں قومی سطح پر کوئی بڑی جماعت نہیں اُبھر سکی تھی۔ بہار شریف سے کمیونسٹ پارٹی نے ایک مسلمان اُمیدوار کھڑا کیا تھا۔ چار آزاد اُمیدوار تھے جن میں ایک ایسا بھی تھا جو پہلے مسلم لیگ کا کارکن تھا۔ محمد یونس کے ساتھ کانگریس میں آیا اور اب پارٹی سے بغاوت کر کے آزاد اُمیدوار کی حیثیت سے کھڑا ہو گیا تھا۔

کانگریس اُمیدوار اور پارٹی کے کارکن بہت اعتماد کے ساتھ کام کر رہے تھے، لیکن

محمد یونس کہیں بھی نظر نہ آتے۔ کانگریس کے لوگ جب بھی اُن سے ملنے جاتے تو پتہ چلتا کہ گھر پر نہیں ہیں۔ کچھ دنوں کے بعد دبی دبی خبریں آنے لگیں کہ وہ درپردہ آزاد اُمیدوار ناصر خاں کے لیے کام کر رہے ہیں۔ اُنہیں لوگوں نے اپنی آنکھوں سے راتوں کے وقت گاڑی پر گھومتے دیکھا۔ اختر حسین سے لوگوں نے یہ بات کہی تو اُنہیں یقین نہیں آیا۔ پارٹی کے اندر جو بھی اختلاف رہا ہوں، لیکن پارٹی کے ممبر کبھی اس کے مفاد کے خلاف کام نہیں کرتے تھے۔

وہ ایک روز علی الصبح محمد یونس کے یہاں پہنچ گئے۔

” ارے اختر بھائی، کیسے آنا ہوا۔؟ “

” لوگ کہتے ہیں کہ آپ میری مخالفت میں کام کر رہے ہیں، میں دیکھنے چلا آیا ہوں۔ “

” یہ کہنے والے میرے دشمن تو ہیں ہی، آپ کے بھی دشمن ہیں۔ جب میں نے آپ کی حمایت کا وعدہ کیا ہے تو پھر اس قسم کی دھوکا بازی کیسے کر سکتا ہوں۔ “

” تو پھر آپ الیکشن میں کام کے لیے اپنا وقت دیجیے۔ “

” اس کے لیے معافی چاہوں گا کہ اِس وقت گھریلو مصروفیات میں بُری طرح گِھرا ہوا ہوں، طبیعت بھی اچھی نہیں ہے ورنہ مجھے ہرگز انکار نہ ہوتا۔ “

اختر حسین مطمئن ہو کر محمد یونس کے یہاں سے لوٹے تو اجودھیا بابو چند پُرانے اور نئے کارکنوں کے ساتھ اُن کے انتظار میں بیٹھے تھے۔ وہ محمد یونس کے پارٹی مخالف کاموں کے عینی شاہد کو پکڑ لائے تھے۔ اُن لوگوں نے قسم کھا کر اختر حسین کو بتایا کہ محمد یونس، راتوں میں ناصر خاں کے لیے کام کرتے ہیں۔ وہ مسلمانوں کے سامنے ہندو، مسلمان کا سوال پیدا کر رہے ہیں اور انہیں غلط فہمیوں میں مبتلا کر رہے ہیں۔ اختر حسین پہلے ان افواہوں پر یقین نہیں کرتے تھے لیکن جب عینی شاہدوں نے بیان دیئے تو انہیں یقین کرنا ہی پڑا۔ اُنہیں بہت افسوس ہوا کہ محمد یونس زبان سے اُن کی حمایت کا دعویٰ کرتے ہیں اور اندر اندر مخالفت کرتے ہیں۔ اجودھیا بابو نے اُنہیں مشورہ دیا۔

” آپ ضلع کانگریس کے صدر کی حیثیت سے اُنہیں ایک نوٹس بھیج دیں اور اُن کی حرکتوں کے بارے میں ایک تفصیلی رپورٹ صوبائی اور کل ہند کانگریس کو بھی روانہ کریں۔ “

اختر حسین سوچ میں پڑ گئے۔ کچھ دیر کے بعد بولے۔

"میں چونکہ خود کانگریس کا اُمیدوار ہوں اور محمد یونس میرے سیاسی حریف رہ چکے ہیں، اِس لیے میری رپورٹ کا غلط مطلب بھی لیا جا سکتا ہے۔"

"لیکن ضلع کانگریس کی صدر کی حیثیت سے بھی آپ کی کچھ ذمّہ داریاں ہیں۔ پارٹی ڈسپلن کو توڑنا ایک بہت ہی گمبھیر بات ہے اور اس قسم کی حرکتوں کو رُکنا چاہیے، ورنہ دوسرے بھی یہی کرنے لگیں گے۔"

اجودھیا بابو کی بات معقول تھی، لیکن اختر حسین کو اس سلسلے میں پہل کرنے میں ہچکچاہٹ تھی۔ اُنہوں نے اجودھیا بابو سے کہا۔

"آپ بھی تو نائب صدر ہیں۔ آپ ہی ایک رپورٹ تیار کر کے بھیج دیجیے۔ مجھے ایسا کرتے ہوئے کچھ اچھا نہیں لگتا۔"

اجودھیا بابو سمجھ گئے، کہ اختر حسین ایسا کبھی نہیں کریں گے۔ انہوں نے ابھی تک سیاست کی دیوی کے چرنوں میں بیٹھنا نہیں سیکھا۔ نائب صدر کی حیثیت سے پارٹی مخالف کے سلسلے میں وہ خود ہی رپورٹ بھیجنے کو تیار ہو گئے۔

کانگریس کا کام بہت اچھا چل رہا تھا۔ اختر حسین کے جلسوں میں بھیڑ روز بہ روز بڑھتی جا رہی تھی۔ اُن کا ہر جگہ شاندار استقبال ہو رہا تھا۔ مرکزی اور صوبائی لیڈر پارٹی کے کام کے لیے نکلے ہوئے تھے، لیکن اختر حسین نے اُن سے کہہ دیا تھا کہ وہ دوسری جگہوں پر توجہ دیں، بہار شریف آکر اپنا وقت ضائع نہ کریں۔ دیہاتوں میں بھی اُن کی بڑی مقبولیت تھی۔ وہ ہمیشہ عوام کے ساتھ رہے تھے، آج عوام کی باری تھی۔ بین، شہری حلقہ میں نہیں آتا تھا لیکن وہاں کے بہت سے نوجوان اپنے خرچ پر اختر حسین کے کام کے لیے نکل کھڑے ہوئے۔ اختر حسین کو پتہ چلا تو اُنہوں نے اُنہیں سمجھا بجھا کر مقامی امیدوار کے کام پر لگا دیا۔

اجودھیا بابو محمد یونس کے بارے میں اپنی رپورٹ بھیج چکے تھے۔ اُن کے بارے میں پارٹی مخالف حرکتوں کے سلسلے میں اور بھی خبریں آئی تھیں۔ اختر حسین کو یقین تھا کہ محمد یونس اُن کا کچھ نہیں بگاڑ سکتے۔ کبھی وہ شیر ضرور تھے، لیکن اب اس شیر کے پنجے اور دانت جھڑ چکے تھے۔ اس کے علاوہ ہندوستان کے عوام پر اُنہیں بہت بھروسا تھا۔ اگر ہندوستانیوں کی قسمت اچھی تھی تو اُنہیں صحیح اور غلط میں تمیز کرنا ہی تھا۔

الیکشن ہوا۔ اس روز ووٹروں کا جوش و خروش دیکھنے کے لائق تھا۔ وہ اپنے حق کے استعمال کے لیے گھنٹوں لائن میں کھڑے رہے۔ اس روز لوگوں نے نئے کپڑے پہنے تھے اور یوں لگتا تھا جیسے وہ کسی میلے جا رہے ہوں۔ برسہا برس سے انگریزوں کے ظلم و ستم سے دبی قوم کی آنکھوں میں نئی کرنیں پھوٹ رہی تھیں۔ اُنھیں یہ یقین ہو گیا تھا کہ حکومت واقعی اب اُن کی ہو گی اور اُنھیں کے لیے کام کرے گی۔

تیسرے دن نتیجہ سامنے آ گیا۔ سارے ملک میں کانگریس کو شاندار کامیابی ملی تھی۔ پارٹی نے جد و جہد کر کے مُلک کو آزادی دلائی تھی تو ملک نے بھی اُس کی خدمات کا صلہ اُسے فوراً ہی عطا کر دیا تھا۔ اختر حسین آٹھ ہزار ووٹوں سے جیت گئے۔ حیرت انگیز بات یہ تھی کہ دوسرے نمبر پر آزاد اُمیدوار ناصر خاں رہے تھے جنھیں شروع میں لوگوں نے کوئی اہمیت نہ دی تھی۔

کانگریس کے لوگ بہت خوش تھے۔ بین ہاؤس کے میدان میں اُس دن اتنے آدمی جمع ہو گئے تھے کہ اس میں تِل دھرنے کو جگہ نہ رہی تھی۔ اتنی بھیڑ تو گاندھی جی اور علی برادران کے آنے پر بھی نہیں ہوئی تھی۔ ہر آدمی کے ہاتھوں میں ہار تھا اور ہر شخص اختر حسین کو ہار پہنانا چاہتا تھا۔ اختر حسین ہاروں سے اس طرح لدے تھے کہ اُن کا چہرہ اس میں چھُپ چکا تھا۔ شام کو ایک بیل گاڑی کو خوب سجایا گیا، اُس پر ایک بڑا جھنڈا لگایا گیا، اختر حسین کو اس پر کھڑا کر کے سارے شہر میں گھمایا گیا۔ رات کو کوئی بارہ بجے اس ہنگامے سے فرصت ملی تو اختر حسین، بی بی صاحبہ کی قدم بوسی کے لیے اندر گئے۔ وہاں اُن کی نذریں اُتاری گئیں اور چاول نچھاور کیے گئے۔ اجودھیا بابو برابر اختر حسین کے ساتھ رہے تھے، صرف اسی وقت جُدا ہوئے تھے جب اختر حسین اندرونِ حویلی گئے۔ اختر حسین کے پاس جو بھی ہار لے کر آتا، وہ کہتے۔

"دیکھو بھئی ــــــ ہار کے اصل حق دار اجودھیا بابو ہیں، یہ جیت انھیں کی ہے، انھیں ہار پہناؤ۔"

کم و بیش اتنے ہی ہار اجودھیا بابو کے گلے میں بھی پڑے تھے۔ اجودھیا بابو اپنے دوست کی جیت سے اس قدر خوش تھے جیسے یہ جیت واقعی اُنھیں کی ہو۔

الیکشن کے چوتھے دن پٹنہ میں کانگریس قانون ساز پارٹی کی میٹنگ بلائی گئی جس میں ڈاکٹر شری کرشن سنہا پھر لیڈر چُن لیے گئے۔ اُنہیں یہ اختیار دیا گیا کہ وہ اپنی پسند سے مجلس وزرا کی تشکیل کریں۔ پھر بھی وزارت حاصل کرنے کے لیے ممبران قانون ساز اور دوسرے لیڈروں کی بھاگ دوڑ شروع ہوگئی۔ پٹنہ سے لے کر دہلی تک لوگوں کا ایک تانتا سا بندھ گیا۔ اجودھیا بابو نے اختر حسین کو اُکسایا کہ کیوں نہ منسٹری حاصل کرنے کے لیے کوشش کی جائے لیکن اختر حسین نے سختی سے منع کر دیا۔

"دیکھیے، اُمیدواری کے لیے تو میں محض آپ کے کہنے پر چلا گیا تھا، جب کہ میری خواہش اس میں ہرگز نہ تھی۔ اتفاق سے اس میں کامیابی بھی ہوگئی۔ اب میں مزید اپنے آپ کو کسی کے سامنے گرا نہیں سکتا۔"

"تو ایسا کرتے ہیں کہ میں دلّی چلا جاتا ہوں، میں ہی کوشش کروں تو ..."

"اجودھیا بابو، اب اس قصّے کو چھوڑیے۔ میں ایم ایل اے ہوگیا تو محض آپ کی محبّت اور محنت سے۔ اب زیادہ ہوس نہیں ہونی چاہیے۔ جو مل گیا، اس پر شکر کرنا چاہیے۔ جو ذمّہ داری آپڑی ہے، خدا اسی کو پورا کر دے تو بہت ہے۔"

اجودھیا بابو نے دیکھا کہ وہ مزید آگے جانے کو تیار نہیں تو وہ چُپ ہوگئے۔ لیکن اُسی رات پٹنہ سے چیف منسٹر نے اختر حسین کو لانے کے لیے گاڑی بھیجی تو سب کا ماتھا ٹھنکا۔ اختر حسین نے اجودھیا بابو کو ساتھ لیا اور پٹنہ روانہ ہوگئے۔ پٹنہ میں صوبائی صدر کانگریس اور چیف منسٹر کے سکریٹری نے بتایا کہ چیف منسٹر نے اپنی مجلس وزارت کو آخری شکل دے دی تھی اور فہرست گورنر کے یہاں بھیجنے ہی والے تھے کہ دلّی سے مولانا آزاد کا فون آگیا کہ اختر حسین کو وزارت میں شامل کیا جائے۔ چیف منسٹر کی مجبوری یہ تھی کہ وہ وزارت سازی کے سلسلے میں آخری فیصلہ کر چکے تھے، اپنے اُن ساتھیوں کو اطلاع دے چکے تھے جنھیں وزارت میں شامل ہونا تھا، لیکن مولانا کے حکم کو ٹالا بھی نہیں جا سکتا تھا، چنانچہ اختر حسین کو نائب وزیر کی حیثیت سے وزارت میں شامل کیا جا رہا ہے۔

یہ سُن کر اختر حسین کے چہرے پر خوشی کے کئی رنگ آگئے۔ اجودھیا بابو تو مارے خوشی کے اچھل پڑے۔ اُنہیں جس کی بالکل توقع نہیں تھی، وہ گھر بیٹھے حاصل ہوگیا تھا۔

اختر حسین تو اس سلسلے میں کچھ سُننے کو بھی تیار نہیں تھے لیکن اُنہیں کیا پتہ تھا کہ قسمت کی دیوی اُن پر مسکرا رہی ہے۔ دوپہر کے بعد راج بھون میں حلف برداری ہوئی۔ اختر حسین کو تو ابھی ایم ایل اے فلیٹ بھی نہیں ملا تھا اور وہ گیسٹ ہاؤس میں مقیم تھے۔ سرکاری گاڑی سے واپس آئے تو اُن کے کمرے کے باہر مسلح گارڈ آچکا تھا۔ شام کو مجلس وزارت کی میٹنگ تھی جس کے بعد محکموں کی تقسیم ہوئی۔ اختر حسین کو محنت اور اوقاف کے محکمے دیے گئے۔ اُن کا کابینہ وزیر رامیشور چودھری اور اُن کے درمیان یہ طے ہوا کہ چودھری جی محنت کی وزارت دیکھیں گے، اور اختر حسین اوقاف۔

۱۷

دوسری صبح اختر حسین بہار شریف روانہ ہوگئے۔ اجودھیا بابو اُن کے ساتھ تھے۔ عوام کو اُن کے آنے کی خبر مل گئی تھی۔ شہر میں داخل ہونے سے قبل ہی اُنہیں پھولوں سے لدی ایک کھلی جیپ پر سوار کرایا گیا، اس کے بعد سارے شہر میں گھمایا گیا۔ دورویہ عوام نے اُن پر پھول پھینکے، اُنہیں جگہ جگہ روک کر ہار پہنائے گئے۔ شام کے وقت یہ جلوس 'بین ہاؤس' پہنچا۔ وہاں بھی صحن، لوگوں سے کھچا کھچ بھرا تھا۔ محمد یونس ایک موٹے سے ہار کے ساتھ پہلے سے وہاں موجود تھے۔ اختر حسین کو گلے لگا کر اُنہوں نے مبارک باد دی۔ اختر حسین، جیتنے کے بعد اُن کی طرف سے ساری کدورتیں دھو چکے تھے۔ وہ محمد یونس سے لپٹ گئے۔ اندرون حویلی میں بی بی صاحبہ کی آنکھوں میں خوشی کے آنسو تیر رہے تھے۔ اُن کی بیوی ماں کی اوٹ میں کھڑی اُنہیں دیکھتی رہیں اور اُن کی آنکھوں سے خوشی کے آنسو گر گر کے زمین میں جذب ہوتے رہے۔

اختر حسین دوسری صبح پٹنہ چلے گئے۔ ایک ہفتہ تک اُن کا قیام گیسٹ ہاؤس ہی میں رہا۔ جب اُنہیں ایک آراستہ بنگلہ الاٹ ہوگیا تو وہ اس میں منتقل ہوگئے۔ یوں تو نوکر چاکر اور چپراسیوں کی کمی نہیں تھی، لیکن وہ گھریلو زندگی کے عادی تھے، اُنہیں کھانے پینے کی تکلیف ہونے لگی۔ بہار شریف جا کر اُنہوں نے بی بی صاحبہ سے بھی کے ساتھ پٹنہ چلنے کی درخواست کی۔ بی بی صاحبہ تو شوہر کی موت کے بعد سے اس گھر سے اُٹھ کر کہیں نہیں گئی تھیں۔ اُنہوں نے اختر حسین سے انکار تو نہیں کیا لیکن اُن سے بیوی بچّوں کو پٹنہ لے جانے کو کہا۔ لیکن اختر حسین کو

یہ گوارا نہ تھا کہ وہ محض اپنے آرام کے لیے اُنہیں تنہا چھوڑ دیں۔ جوان لڑکیاں اُن کے ساتھ تھیں، لڑکے باہر تھے۔ اُن کے سامنے تنہائی ایک بہت بڑا مسئلہ ہوئی۔ اختر حسین کے لیے بار بار بہار شریف آنا ممکن نہیں تھا اور پٹنہ میں رہ کر گھر کو دیکھنا بھی مشکل تھا۔ اُنہوں نے کچھ دنوں کے لیے یہ مسئلہ ٹال دیا اور پٹنہ میں تنہا رہنے لگے۔ ہر سنیچر کو بہار شریف آجاتے اور سوموار کی صبح کو چلے جاتے۔

وزارت میں شامل ہوتے ہی اُنہوں نے ضلع کانگریس کے صدر کے عہدے سے استعفیٰ دے دیا تھا، اگرچہ صوبائی صدر نے اُن سے کہا تھا کہ وہ دونوں عہدوں پر فی الحال کام کریں۔ لیکن اُن کے ضمیر نے گوارا نہ کیا۔ سرکاری مصروفیتوں کی وجہ سے تنظیمی کاموں پر بھی اثر پڑ رہا تھا۔ ضلع کانگریس نے اتفاق رائے سے اجودھیا بابو کو اپنا صدر چُن لیا۔

ایک روز اختر حسین دفتر سے گھر آئے تو اپنی بیوی اور بچّوں کو دیکھ کر حیرت زدہ رہ گئے۔ ایسا تو کوئی پروگرام نہیں تھا۔ وہ تو ایک لمحہ کے لیے بہت گھبرا گئے، لیکن سبھی کے چہرے پر اطمینان دیکھ کر نارمل ہوئے۔

" اماں نے زبردستی ہم لوگوں کو پٹنہ بھجوا دیا کہ دولہا اکیلے رہتے ہیں۔ اُنہیں تکلیف ہوتی ہے۔" اُن کی بیوی نے بتایا۔

" آپ لوگوں کو اماں کو سمجھانا چاہیے تھا۔ آخر اُن کو تنہا چھوڑ کر آپ لوگ کیسے آگئیں۔"

" اماں نے ٹیکسی منگا کر زبردستی ہم لوگوں کو روانہ کر دیا۔ "

اختر حسین چُپ ہو گئے، لیکن انہوں نے حامد کو فوراً بہار شریف بھیج دیا۔ حامد نے تھرڈ ڈویژن سے میٹرک اور پھر تھرڈ ڈویژن ہی سے آئی اے پاس کر لیا تھا اور اب اس امید میں تھا کہ باپ اپنے رسوخ سے پٹنہ کالج میں داخلہ کرا دیں گے۔ لیکن اختر حسین نے فیصلہ کیا کہ بہار شریف ہی میں پڑھنا چاہیے تاکہ بین ہاؤس میں مرد کی کوئی صورت تو رہے۔ پٹنہ کالج میں تھرڈ ڈویژن کے داخلے کا کوئی سوال ہی نہیں تھا اور اختر حسین کسی حال میں بھی اس سلسلے میں پیروی کرنے کے مخالف تھے۔

۱۸

کونسل میں جگہوں کو پُر کرنے کے لیے بہت سے لوگ دوڑ دھوپ میں لگے تھے۔ ایوان قانون ساز میں گھس کر اقتدار کا مزہ محسوس ہونے لگا تھا۔ پٹنہ سے دلّی تک ایک دوڑ تھی جو جاری تھی۔ صوبائی کانگریس سے کونسل کے اُمیدواروں کی فہرست مانگی گئی تھی۔ جس نے احتیاط کے ساتھ ایک فہرست بنا کر دلّی بھیج دی تھی۔ آخری فیصلہ کانگریس پارلیمنٹری بورڈ ہی کو کرنا تھا جس کی میٹنگ جلد ہی ہونے والی تھی۔ اختر حسین کو اِس بھاگ دوڑ سے کوئی مطلب نہیں تھا، وہ اپنی دُنیا میں مگن تھے۔ ایک روز اخباروں میں کانگریس کے اُمیدواروں کی قطعی فہرست میں اُنہیں محمد یونس کا نام دیکھ کر بہت حیرت ہوئی۔ وہ مان گئے کہ محمد یونس کی پہنچ اور پیروی بہت تگڑی اور دُور دُور تک تھی۔ اسمبلی کا ٹکٹ حاصل کرنے کے لیے اُنہیں کیا کیا پاپڑ بیلنے پڑے تھے، وہ سب اُنہیں اچھی طرح یاد تھا اور راجو دھیا بابو نہ ہوتے تو وہ یہ بھی نہ کرتے۔ یہ سوچ کر وہ چپ ہو رہے کہ محمد یونس کو اسمبلی کا ٹکٹ چوں کہ ملتے ملتے رہ گیا تھا اس لیے شاید کونسل میں اُنہیں لے کر اس کی تلافی کر دی گئی ہے۔

کونسل کا الیکشن ہوا۔ محمد یونس جیت گئے۔ وہ اس روز پٹنہ ہی میں تھے۔ اختر حسین اُن کو مبارک باد دینے گئے اور اُنہیں پھولوں کا ہار پہنایا۔ محمد یونس مستقل طور پر پٹنہ ہی آ گئے۔

چھ مہینوں کے بعد وزارت میں معمولی ردو بدل ہوا۔ دو ایک منسٹر ڈراپ کیے گئے اور چند کے محکموں کی از سرِ نو تقسیم ہوئی۔ دو نئے منسٹر بنائے گئے جن میں ایک محمد یونس تھے۔ اختر حسین یہ سُن کر حیرت زدہ رہ گئے۔ وہ ڈپٹی منسٹر تھے اور محمد یونس کو کابینہ کا درجہ دیا گیا تھا۔ چشم زدن میں اُنہیں محمد یونس سے نیچا کر دیا گیا تھا۔ وہ بہت بددل ہو گئے۔ دو روز تک دفتر بھی نہیں گئے۔ تیسرے روز اجودھیا بابو اُن کے پاس آئے۔ اُنہیں بھی نئی تبدیلیوں سے بہت دُکھ ہوا تھا۔ اختر حسین نے دو روز گھر پر رہ کر اور خوب غور و فکر کر کے یہ فیصلہ کر لیا تھا کہ وہ مستعفی ہو جائیں گے۔ محمد یونس اُن سے بہت جونیئر تھے اور پھر

وہ اس وقت واہ واہ لوٹنے والوں میں شامل تھے جب اختر حسین اور دوسرے کانگریسی اپنے پرائے کی گالیاں اور مار کھا رہے تھے۔ اب انہیں محمد یونس ہی کے تحت وزارت میں کام کرنا تھا اور یہ بات اُن کی برداشت سے باہر تھی۔ اجودھیا بابو سے اُنہوں نے مشورہ کیا تو کچھ پس وپیش کے بعد وہ بھی ان کے فیصلے سے متفق ہو گئے۔ اختر حسین نے اپنا استعفیٰ نامہ اجودھیا بابو کی معرفت چیف منسٹر کو بھجوا دیا۔ چیف منسٹر نے اُن کا خط تو لے لیا لیکن اجودھیا بابو کے ساتھ انہیں بات چیت کے لیے مدعو کیا۔ اختر حسین اس کے لیے بھی تیار نہیں تھے لیکن اجودھیا بابو کی رائے تھی کہ ملاقات کر لینے میں کوئی حرج نہیں ہے۔ چنانچہ بادل ناخواستہ وہ چیف منسٹر سے ملنے کو تیار ہو گئے۔

چیف منسٹر نے تنہائی میں دونوں سے ملاقات کی اور اختر حسین سے استعفیٰ دینے کی اصل وجہ پوچھی۔ انہوں نے لکھا تھا کہ چند ذاتی وجوہ کی بنا پر وہ استعفیٰ دے رہے ہیں۔ چیف منسٹر سے اُنہوں نے صاف صاف وجہ بیان کر دی۔ چیف منسٹر نے ان سے قوم اور ملک کے بہتر مفاد میں استعفیٰ واپس لینے کی اپیل کی۔ انہوں نے اختر حسین کو سمجھایا۔

"دیکھیے، حسین صاحب، آپ جانتے ہیں کہ صوبہ میں بہت سے مسلم لیگیوں نے کانگریس میں شمولیت اختیار کر لی ہے۔ ان لوگوں نے اپنے ماضی سے توبہ کر کے کانگریس کے سیکولر اصولوں پر چلنے کا تہیہ کیا ہے۔ اب تک اُن کے بارے میں کوئی شکایت نہیں ملی ہے۔ اُن لوگوں میں بے چینی ہے کہ کانگریس انہیں نظرانداز کر رہی ہے۔ مایوس ہو کر وہ لوگ اپوزیشن میں جا سکتے ہیں اور کانگریس کے لیے مشکلات کھڑی کر سکتے ہیں۔ اس سے تو انکار تو نہیں کیا جا سکتا کہ ان لوگوں کا مسلمانوں پر خاصا اثر ہے اور وہ ہماری پارٹی کے لیے ASSET ثابت ہو سکتے ہیں۔"

"لیکن پھر اُن مسلمان لیڈروں اور کارکنوں کا کیا ہوگا جو برسہا برس سے کانگریس کی خدمت کرتے چلے آ رہے ہیں اور جو اب بھی محض خدمت کا جذبہ رکھتے ہیں، کسی لالچ کا نہیں۔ پرانے مسلم لیگیوں کی ہمت افزائی کر کے اُنہیں مسلمانوں کا لیڈر بنایا جا رہا ہے، اس طرح کانگریسیوں کا جو اثر مسلمانوں پر ہے، وہ ختم ہو جائے گا۔"

چیف منسٹر نے اُن کی دلیل تسلیم نہیں کی۔ اُن کا کہنا تھا۔

"ہمیں فرقہ وارانہ بنیادوں پر لیڈرشپ کے رجحان کی ہمت افزائی نہیں کرنی چاہیے۔ ہماری رہنمائی کانگریس کے وہ عظیم اصول کرتے ہیں جن کی بنیادوں پر آزادی کی لڑائی لڑی گئی۔

اور انہیں بنیادوں پر نئے ملک کی تعمیر کرنی ہے۔"

"لیکن کانگریس نے خود الیکشن میں اُمیدواری کی بنیاد فرقہ اور ذات پات پر رکھی تھی، اُس وقت ان اصولوں کا خیال کیوں نہیں رکھا گیا؟۔"

اجودھیا بابو شروع سے کانگریس کی کُل ہند کمیٹی کے اس رویّہ پر معترض رہے تھے۔

"دیکھیے، ہم سیاست میں ہیں، کسی مندر کے پجاری نہیں۔ سیاست میں الیکشن جیتنا اس لیے ضروری ہے کہ اس سے اقتدار حاصل ہوتا ہے جس کے ذریعہ اپنے اصولوں کے مطابق عوام کی خدمت کرنے کا موقع ملتا ہے۔"

"اختر حسین اور اجودھیا بابو خاموش ہو گئے۔ چیف منسٹر نے بہت اصرار کے ساتھ اختر حسین کو استعفےٰ واپس لینے پر مجبور کر دیا۔ انہوں نے یہ یقین دہانی کی کہ اگلی بار جب وزارت میں ردوبدل کی جائے گی تو اُنہیں کابینہ درجہ دیا جائے گا۔

۱۹

حامد نے پڑھائی میں جو دلچسپی لینا شروع کی تھی وہ جاری تھی۔ تھرڈ ڈویژن میں ہی سہی، وہ ہر امتحان میں پاس ہوتا جا رہا تھا۔ بی اے میں اُس نے خاصی محنت کی تھی لیکن تھرڈ ڈویژن اُس کی قسمت میں لکھ گئی تھی۔ اِدھر اُس نے بی اے پاس کیا، اُدھر کانگریس حکومت نے زمینداری کا خاتمہ کر دیا۔ اس سے بہار کے مسلمان بہت بڑی تعداد میں متاثر ہوئے۔ زمینداری اُن کی عزّت اور روٹی کا بہت بڑا سہارا تھی۔ یہی وجہ تھی کہ وہ کھیتی باڑی اور تجارت کی طرف کم ہی مائل ہوتے تھے۔ زمینداری سے اُن کی زندگی ہموار تھی، اس لیے وہاں سے اُن کی چھلانگ نوکری پر جا کر ختم ہو جاتی تھی۔ زمینداری کے خاتمے کی بات تو بہت دنوں سے ہو رہی تھی لیکن اس کا مذاق اُڑایا جاتا تھا۔ جب یہ مذاق تلخ حقیقت بن کر سامنے آ گیا تو ایک کھلبلی سی مچ گئی۔ کانگریس حکومت کو کوس کوس کے خوب بھڑاس نکالی گئی۔ کافی دیر کے بعد جب یہ طوفان تھما تو پتہ چلا کہ مسلمانوں کے پاس تو کھیت ہیں ہی نہیں اور جن کے پاس ہیں بھی تو وہ کھیتی نہیں کر سکتے۔ کھیتی تو اب وہی کر سکے گا جس کی ماں، بہن، بیوی، بیٹی کھیتوں میں کام کریں۔ اِس صورت حال سے

بددلی اور مایوسی کی فضا طاری ہوئی۔ پڑھے لکھے مسلم نوجوان نوکری کی تلاش میں مارے مارے پھرتے لیکن نوکری ہزار میں سے صرف ایک ہی کو ملتی، بقیہ کے ہاتھوں میں مایوسی آتی۔ اس وقت ابن صفی کے جاسوسی ناول بازار میں خوب بکنا شروع ہوئے جس سے وقتی طور پر مایوس نوجوانوں کو بہت راحت ملتی۔ اُن میں سے کوئی فریدی بننے کے خواب دیکھتا، کوئی عمران اور کوئی حمید بننے کے۔

حامد کے لیے بڑا عجیب وقت آپڑا تھا۔ بی اے پاس کرنے کے بعد اُس نے بارہا اختر حسین سے کہلایا کہ وہ اُسے نوکری دلادیں، اب تو زمین داری بھی جاچکی، نوکری کرنے کے سوا چارہ بھی کیا ہے۔ لیکن اختر حسین نے اس کی سفارش یا پیروی کرنے سے صاف انکار کر دیا۔ وہ اُسے اُن جگہوں کا پتہ ضرور بتا دیتے جہاں آسامیاں خالی ہوتیں۔ وہ اُسے مقابلے کے امتحانات میں بیٹھنے کا مشورہ دیتے اور اس سلسلے میں ہر طرح کی مدد کا وعدہ بھی کرتے۔ حامد کو اُن کی اس قسم کی باتیں کھوکھلی لگتیں۔ وہ ایک باشعور پڑھا لکھا نوجوان تھا۔ اُس نے یہ بات سُنی نہیں بلکہ اپنی آنکھوں سے دیکھی تھی کہ اُس کے بہت سے ساتھیوں نے پیروی اور سفارش سے نوکریاں حاصل کی تھیں، اُن کی ڈگریوں نے اُن کی کوئی مدد نہیں کی تھی۔ اُس کے ساتھی اُس کی قسمت پر رشک کرتے کہ اس کے باپ تو منسٹر ہیں، اُسے پیروی اور سفارش کی کیا کمی۔ حامد جانتا تھا کہ اختر حسین چاہیں تو اُسے کہیں بھی رکھوا سکتے ہیں لیکن اختر حسین نے اصولوں کی جو زمین پکڑی تھی، اُسے چھوڑنے پر ہرگز تیار نہیں تھے۔

مصروفیت کی وجہ سے اختر حسین بین کی طرف توجہ نہیں کر پا رہے تھے، نتیجے میں وہاں کا سارا کاروبار پٹواری جی، گماشتہ جی اور دوسرے نوکروں پر تھا، اگرچہ یہ سبھی قابل اعتماد لوگ تھے لیکن گاؤں کی فضا کچھ ایسی ہو چکی تھی کہ مالک کی غیر موجودگی، کسی وقت بھی کوئی رنگ لا سکتی تھی۔

یہ لوگ بڑی بڑی حکمتوں سے کھیتی کرواتے اور بیل گاڑیوں پر غلّہ لاد کر بہار شریف پہنچا دیتے۔ اوٹ سے وہ ہمیشہ بی بی صاحبہ سے گزارش کرتے کہ حضور کسی کو بھیجیے، وقت بہت خراب آنے والا ہے۔ بی بی صاحبہ نے اپنے طور پر ایک بار حامد کو وہاں بھیج دیا تو اُس کی سمجھ میں کچھ نہ آیا۔ پھیلے ہوئے کھیت اور سپاٹ چہروں کو دیکھ کر کوئی ایسا مسئلہ دکھائی نہیں دیتا تھا جو اُلجھا ہوا ہو، نتیجہ یہ کہ حامد تالاب کی مچھلیاں کھا کر اور ایئرگن سے دو چار چڑیوں کو مار کر گھر لوٹ آیا۔ اختر حسین کی یہ سخت تاکید تھی کہ گاؤں کی حویلی کو ہمیشہ صاف ستھری اور سفید پوش رہنا چاہیے، چاہے

اس پر جو بھی خرچ ہو۔ باہر کے دو کمروں میں گماشتہ جی اور پٹواری جی رہتے۔ ہفتہ میں ایک بار سارے کمروں کو کھول کر اُن کی صفائی کرادی جاتی اور گدّوں کو دھوپ دکھا پائیں باغ میں آم، امرود اور لیموں کے درجنوں درخت تھے، اُن کے پھل ٹوکریوں میں بھر کے بہار شریف بھیج دیے جاتے۔ حامد کو پہلے دن تو یہ بنگلہ بہت اچھا لگا، دوسرے دن اُسے وحشت ہونے لگی اور تیسرے دن وہ بھاگ آیا۔

ادھر اصغر حسین کا مقدمہ ہائی کورٹ میں فیصل ہوا نچلی عدالت کا فیصلہ برقرار رہا۔ اُن کے منشی نے جب پٹنہ میں اختر حسین کو یہ اطلاع دی تو انہوں نے سختی سے منع کر دیا کہ اس بات کو پوشیدہ رکھا جائے اور بی بی صاحبہ تک یہ خبر ہرگز نہ پہنچنے پائے۔ انہوں نے منشی جی سے کہا کہ یہ مقدمہ سپریم کورٹ جائے گا، اس کے لیے وہ خود دلّی جائیں گے۔ منشی جی کو انہوں نے اگلے ماہ اس غرض سے پٹنہ بلایا لیکن منشی جی گھر کیا گئے کہ اُن کا بلاوا ہی آ گیا۔ رات میں فالج کا حملہ ہوا اور صبح انہوں نے پران تیاگ دیے۔ اختر حسین کے لیے یہ نئی مصیبت تھی۔ منشی جی مقدمہ کے کام کے لیے وقف تھے اور وہ معاملات کی نزاکتوں کو بھی سمجھتے تھے۔ اختر حسین تو انہیں مشورہ دے کر الگ ہو جاتے تھے۔ منشی جی کے انتقال کے بعد انہوں نے متعلقہ فائل نکال کر اپنی میز پر رکھ لی کہ فرصت کے اوقات میں اُسے پڑھیں گے۔ لیکن وہ جب بھی فائل پڑھنے کا ارادہ کرتے، اُسی وقت کوئی ضروری سرکاری مصروفیت آجاتی اور وہ اُس میں لگ جاتے۔ نتیجہ یہ ہوا کہ وہ فائل، سرکاری فائلوں کے انبار میں کھوگئی اور جب بھی فائلیں میز سے اُٹھائی گئیں تو وہ فائل بھی سب کے ساتھ ہی چلی گئی۔ کئی مہینوں کے بعد محکمہ کے ڈپٹی سکریٹری وہ فائل لے کر اختر حسین کے پاس آئے کہ بہ غور مطالعہ کے بعد بھی اُن کے پلے کچھ نہیں پڑا تھا۔ اختر حسین نے دیکھا تو وہ وہی فائل تھی۔ اُنہوں نے شرمندہ ہو کر ڈپٹی سکریٹری سے معذرت کی اور فائل کو اُٹھا کر کیبنٹ میں رکھ دیا۔

ڈپٹی منسٹر ہونے کے بعد اختر حسین کی مالی حالت اِدھر خراب ہوتی جا رہی تھی۔ اُنہیں پندرہ سو روپے ماہوار ملتے، اس سے زیادہ تو وہ اپنی وکالت میں کما لیتے تھے۔ چھوٹے بیٹے کو ایک انگریزی اسکول میں داخل کرا دیا تھا۔ لڑکی کو دوسرے اسکول میں ڈال دیا تھا۔ فیاض ایک ماہر نفسیات کے زیر نگرانی تھا جس کی فیس بہت زیادہ تھی۔ حامد کے لیے اُن کے

پاس پیسے نہیں بچتے تھے۔ یوں بھی بی اے پاس کر لینے کے بعد اس کا خرچ ہی کیا تھا۔ اُس کی چھوٹی چھوٹی ضرورتیں تھیں جن کے لیے وہ پریشان رہتا۔ وہ سگریٹ پینے لگا تھا لیکن سگریٹ کے نام پر پیسے نہیں مانگ سکتا تھا، زیادہ سے زیادہ لانڈری میں کپڑے دُھلانے کے نام پر یا پھر درخواستیں بھیجنے کے لیے ڈاک خرچ کے نام پر وہ کچھ فاضل پیسے مانگ لیتا۔ اصغر حسین کے گونگے بیٹے کو بی بی صاحبہ ہر ماہ جیب خرچ کے لیے ایک مخصوص رقم دیتیں جس کا کوئی خرچ نہیں تھا، حامد اُسی کی خوشامد میں لگا رہتا اور اسی پیسے سے اس کا کام بھی چل جاتا۔ نثار کو فلم دیکھنے کا بہت شوق تھا، حامد اس کا یہ شوق پورا کرتا رہتا اور اُسی کے پیسے پر۔

۲۰

اصغر حسین کا ایک تفصیلی خط کراچی سے بی بی صاحبہ کے نام پہنچا۔ وہ کراچی میں بہت خوش تھے۔ اُن کا سینما ہال خوب چل رہا تھا۔ جو زمین انہوں نے الاٹ کرالی تھی، اُس پر ایک شاندار بنگلہ بنوا لیا تھا جسے ایک غیر ملکی سفارت خانہ نے بہت ہی معقول کرایہ پر لے رکھا تھا۔ بچّے سب اُن کے اچھے اچھے اسکولوں اور کالجوں میں پڑھ رہے تھے۔ خود انہوں نے ایک امپورٹ، ایکسپورٹ کا پرمٹ حاصل کر لیا تھا اور اب جلد ہی اپنا بزنس شروع کرنے والے تھے۔ البتہ انہوں نے سرور حسین کے بارے میں یہ اطلاع دی تھی کہ اُن کی وکالت وہاں نہیں چل رہی۔ اُن کے جج بننے کا جب بھی موقع آیا، مقامی لوگوں کو ترجیح دی گئی۔ جو جگہیں اُن سے بچیں، اُن پر پنجاب کے لوگوں نے قبضہ کر لیا۔ اُن کے پاس آمدنی کا کوئی دوسرا ذریعہ بھی نہیں تھا، بس کسی طرح گزر بسر ہو رہی تھی۔

اصغر حسین نے اپنے مقدمے کا بالکل ذکر نہیں کیا تھا، البتہ منشی مکند لال کی موت پر انہیں بہت افسوس تھا۔ نثار کے بارے میں انہوں نے لکھا تھا کہ اُسے کوئی ہُنر سکھا کر کام پر لگا دیا جائے۔ وہ اسے کراچی اس لیے نہیں بُلا سکتے کہ وہاں وہ جیتے جی مر جائے گا۔ اُسے دیکھ بھال کے لیے ایک آدمی چاہیے جو یہاں میسّر نہیں۔ سب کو سلام و دعا لکھی تھی۔ بہت لمبا چوڑا خط تھا۔

بی بی صاحبہ، سرور حسین کی حالت سن کر بہت بے چین ہوگئیں۔ وہ جب اُن سے ناراض ہوئی تھیں تب سرور حسین کی مالی حالت بہت اچھی تھی، اُن کی وکالت عروج پر تھی اور سب کو یہ یقین تھا کہ وہ جہاں بھی جائیں گے، اپنا سکّہ جما لیں گے۔ اب اُن کی خراب حالت کو سن کر اُن آنکھوں سے آنسو جاری ہوگئے۔ ساری ناراضگی ایک دم بھلا دینے کے بعد اُنہوں نے سرور حسین کو براہ راست حامد سے لکھوایا کہ وہ سب کچھ چھوڑ چھاڑ کے ہندوستان آ جائیں، یہاں اب بھی اللہ کا دیا بہت کچھ ہے، اگر وہ کوئی کام نہ بھی کریں، تب بھی بُرے نہیں رہیں گے۔

دو ہفتوں کے بعد اُن کا جواب آ گیا۔ سب سے پہلے انہوں نے اپنے کردہ اور ناکردہ گناہوں کی معافی مانگی۔ پھر یہ وہ اب مستقل طور پر ہندوستان نہیں آ سکتے۔ وہ پاکستانی ہوگئے ہیں اور پاسپورٹ، ویزا کے سہارے ایک دو مہینے کے لیے ہی ہندوستان جا سکتے ہیں اور وہ انشاء اللہ جلد ہی وہاں آئیں گے۔

بی بی صاحبہ کو یہ جان کر بہت تعجب ہوا کہ وہ ہمیشہ کے لیے ہندوستان نہیں آ سکتے۔ بھلا یہ کیسی بات تھی، اُن کے گاؤں شیخ پورہ کے بہت سے لوگ کلکتہ اور بمبئی میں کام کرتے تھے۔ پندرہ سال، بیس سال کمانے کے بعد گھر آ جاتے اور پھر آرام سے بقیہ زندگی گزار دیتے۔ بکس میں پیسے بھی رہتے اور کھیتوں سے غلّہ بھی آتا۔ اُن کی بیویاں مزے سے ہر سال سونے کی بالیاں اور کڑے بنواتی رہتیں۔ اُنہیں سرور حسین کی بات پر یقین نہیں آیا۔ اختر حسین بہار شریف آئے تو اُن سے انہوں نے دریافت کیا۔ وہ اُن کی بات سن کر چپ ہوگئے اور پھر کچھ سوچ کر بولے۔

"ہاں اماں، یہ بات صحیح ہے۔ وہ لوگ ہمیشہ کے لیے اب گھر نہیں آ سکتے۔"

"ایسا کیوں کر ہو سکتا ہے بھلا۔؟"

"اس لیے کہ انہوں نے اپنا گھر جو بدل لیا ہے۔ وہ دوسرے ملک کے باشندہ ہوگئے ہیں۔"

"لیکن اُن کا گھر وہاں کیسے ہو سکتا ہے۔ وہ یہاں پیدا ہوئے، پلے بڑھے، یہاں اُن کی زمین ہے، کھیت ہے، مکان ہے، اُن کے باپ دادا یہاں دفن ہیں۔" بی بی صاحبہ جذباتی ہوگئیں۔

بات یہ ہے اماں کہ پاکستان ایک الگ ملک بن گیا ہے۔ اُس کی اپنی سرحد ہے، جو

اسے ہندوستان سے الگ کرتی ہے۔ وہاں کے رہنے والے پاکستانی ہیں اور یہاں کے ہندوستانی، پاکستانی، ہندوستانی نہیں ہوسکتا اور ہندوستانی .... "

اختر حسین بولتے بولتے رُک گئے۔ بی بی صاحبہ بھی چپ ہو رہیں۔ اُن کا دل اس بات کو ماننے پر تیار نہیں تھا۔ وہ جب بھی یقین پر اپنے آپ کو آمادہ کرتیں تو اُن کا دل مکر جاتا۔ دراصل انہوں نے کبھی یہ بات سوچی ہی نہیں تھی کہ اُن کے بیٹے ہمیشہ کے لیے کسی دوسرے ملک میں جا بسے ہیں۔ وہ تو یہی سمجھتی رہی تھیں کہ وہ لوگ کمانے کے لیے پردیس گئے ہیں اور ایک دن واپس آجائیں گے، لیکن یہاں تو بات ہی اُلٹ گئی تھی۔ وہ جیسے جیسے اس پر غور کرتیں، اُن کا دل انہیں اندر اندر گھلاتا رہتا۔ گھر میں ایسا کوئی نہیں تھا جس سے وہ اپنے دل کی بات کہہ سکتیں۔ ایسے موقع پر اُنہیں اپنے مرحوم شوہر کی بہت یاد آتی کہ وہ اگر ہوتے تو اُنہیں ایسا غم کاہے کو دیکھنا پڑتا۔ وہ تو کانگریس کے بہت بڑے لیڈر تھے۔ بھلے ہی وہ پاکستان بنوا دیتے لیکن دوسرا ملک تو ہرگز نہیں بننے دیتے۔ وہ دن رات اُن لوگوں کو کوستیں جن کی وجہ سے اُن کے بیٹے ہمیشہ کے لیے اُن سے چھوٹ گئے۔

۲۱

برس کے آخر میں سرور حسین کراچی سے بہار تشریف آئے۔ وہ بہت دُبلے اور بوڑھے لگ رہے تھے۔ رکشا سے اُتر کے سیدھے بی بی صاحبہ کے پاس گئے اور اُن کے قدموں میں جھک گئے۔ بی بی صاحبہ نے اُنہیں سینے سے لگایا اور دیر تک روتی رہیں۔ کافی دیر کے بعد جب غبار چھٹا تو انہوں نے دریافت کیا۔

" بٹیا، دُلہن کو نہیں لائے۔ ؟ "

" اماں، آپ کا حکم ہوگا تو وہ لوگ پھر آجائیں گی۔ "

" بٹیا سب کو لے کر یہیں آجاؤ نا ــــ یہاں کھیتی باڑی ہے، گھر ہے، زمین ہے۔ "

" اماں، میں تو پاکستانی ہوگیا ہوں اور پاکستانی، ہندوستانی نہیں ہوسکتا۔ "

" کیوں نہیں ہوسکتا۔ جب ہندوستانی، پاکستانی ہوسکتا ہے تو پھر پاکستانی ہندوستانی

کیوں نہیں ہو سکتا۔"

"اس لیے کہ ہندوستانیوں نے پاکستان بنوا کے ہندوستان کو ہمیشہ کے لیے کھو دیا۔"

"بات میری سمجھ میں نہیں آئی ــــ اچھا یہ بتاؤ کس نے بنوایا پاکستان ؟"

"مسلم لیگ نے اور ..."

"خدا کی مار پڑے اُن لوگوں پر ..."

"ایسا نہ کہیے اماں" ــــ سرور حسین نے اُن کے مُنہ پر اپنا ہاتھ رکھ دیا۔" پاکستان بنوا کے ان لوگوں نے مسلمانوں پر بڑا احسان کیا ہے اماں، ورنہ پھر سبھی کو ہندو راج میں رہنا پڑتا۔"

"واہ جی اچھا احسان کیا ہے۔ میرے بچّوں کو مجھ سے چھُڑوا دیا اور تم کہتے ہو کر ..."

"اماں، یہاں مسلمان پریشان ہوتا ہے تو کتنے مزے سے پاکستان چلا جاتا ہے، وہاں اُسے نوکری بھی مل جاتی ہے اور گھر بھی۔"

"بیٹا، پھر تم کو کیوں نہیں ملی نوکری ــــــ ؟ تم تو وہاں جج بننے کے لیے گئے تھے۔ ؟"

سرور حسین کے چہرے پر دھواں سا پھیل گیا۔

"دیر سویر تو ہوتی ہی رہتی ہے اماں' وعدہ تو اُن لوگوں نے کیا ہے۔"

سرور حسین گھر بھر کے لیے کچھ نہ کچھ تحفہ لائے تھے۔ چلغوزہ، بادام اور کشمش کے پیکیٹ۔ نثار کے لیے اصغر حسین نے چمڑے کا ایک جیکیٹ بھیجا تھا۔ جب سب کو تحفے بانٹ چکے تو بی صاحبہ نے اُن سے آہستہ سے رازدارانہ انداز میں پوچھا۔

"بڑی دلہن کے لیے کچھ لائے ہو۔ ؟"

سرور حسین، چپ چاپ' اُن کا مُنہ تکنے لگے۔ بولے کچھ نہیں۔

"نہیں لائے ہو تو یہ تمہاری غلطی ہے بیٹا، جاؤ میرا سامان اُنہیں دے آؤ۔"

سرور حسین پھر بھی چپ رہے۔

"تم نے سُنا نہیں بیٹا، مَیں کیا کہہ رہی ہوں۔ ؟"

"اماں، اُنہوں نے تو مجھ سے پردہ کر رکھا ہے، میں کیسے اُن کے پاس جاؤں۔"

"بیٹا، پردہ تو اُنہوں نے ہم سب سے کر رکھا ہے، کسی کے سامنے نہیں جاتیں. بھائی

کے ساتھ بٹیا: کبھی نہیں گئیں۔ لیکن اس کا ڈر ایسا ہے کہ وہ کچھ بھی کر سکتی ہے۔"

سرور حسین نے سر جھکا دیا۔ تھوڑی دیر کے بعد وہ بولے۔

"پھر میں کیا کروں اماں، آپ جو حکم دیں۔ تحفے تو میں اُن کا لایا ہوں۔"

"بہت اچھا کیا بیٹے۔ وہ تمہاری بیوی ہے۔ یہ رشتہ اتنا آسان نہیں ہوتا، خُدا کے یہاں رشتے ناتے طے ہوتے ہیں۔ بہت اچھا کیا تم نے۔ جو غلطی ہو چکی ہے، وہ تو ہو چکی، مرد تو چار شادیاں کر سکتا ہے۔ تم تحفے نکالو، میں اُسے خوان میں سجا کے بھیجتی ہوں۔ قبول کر لیا تو پھر تم چلے جانا اور جیسے بھی ہو، اس کا دل جیت لینا۔"

سرور حسین کو تحفے نکالتے وقت شرم سی لگ رہی تھی لیکن ماں کا حکم تھا جسے وہ ٹال نہیں سکتے تھے۔ وہ تو کچھ چیزیں محض اس اُمید پر لے آئے تھے کہ اگر حالات درست ہوئے تو وہ چپکے سے اُنہیں دے آئیں گے۔ ایک ساڑی تھی، چوڑیاں اور ایک سینڈل۔ بی بی صاحبہ نے ان چیزوں کو ایک طشت پر سجایا، اس پر ایک خوب صورت خوان پوش رکھا اور ایک دائی کے ہاتھوں وہاں بھیج دیا۔

تھوڑی دیر کے بعد دائی واپس آئی تو اُس کے سر پر دو خوان تھے۔ ایک وہ جو یہاں سے گیا تھا، دوسرا نیا تھا۔ دونوں ڈھکے ہوئے تھے۔ دائی نے دونوں خوان دالان پر رکھا اور بھاگ گئی۔ بی بی صاحبہ نے خوان پوش اُٹھائے۔ پہلا خوان تو وہ تھا، جو یہاں سے گیا تھا، سبھی چیزیں ویسی ہی سجی ہوئی تھیں، صرف چوڑیاں نہیں تھیں۔ دوسرے میں چولھے کی راکھ بھری تھی جس میں ٹوٹی ہوئی چوڑیاں ملی ہوئی تھیں ـــــ بی بی صاحبہ نے فوراً دونوں خوان پوش ڈھک دیے۔ کسی کے مُنہ سے ایک لفظ نہ نکلا۔ سارے گھر کو جیسے سانپ سونگھ گیا۔

مکان کے جس حصّہ میں وہ رہتی تھیں، وہ بالکل الگ تھلگ تھا۔ انہوں نے اپنے آپ کو اس میں مقید کر لیا تھا۔ کسی سے ملنا جلنا نہیں، آنا جانا نہیں۔ برسوں سے کسی نے اُن کی شکل نہیں دیکھی تھی۔ کبھی کبھی جب اُن پر دَورہ سوار ہوتا تو اختر حسین کو چھوڑ کے وہ سارے خاندان کو بہ آوازِ بلند خوب کوستیں۔ اُن کے کوسنے کی آواز سب سُنتے اور چپ رہتے۔ بی بی صاحبہ کا سخت حکم تھا کہ کوئی اُن کی بات کا جواب نہ دے۔ صرف ایک

پُرانی کھلائی تھی جو اُن کا کھانا پکاتی، دیکھ بھال کرتی اور اُن کی خبریں باہر لاتی۔ اخراجات کی ذمّہ داری اختر حسین پر تھی۔

سرور حسین کی آمد کے دوسرے روز اچانک رات کے تیسرے پہر گھر کے لوگوں نے اُن کے چیخنے، چلّانے اور کوسنے پیٹنے کی آواز سُنی۔ چونکہ یہ معمول تھا اس لیے لوگوں نے اس طرف یاد دھیان نہیں دیا، جب یہ سلسلہ دراز ہوتا گیا تو لوگوں کو مجبوراً آنکھیں کھولنی پڑیں۔ اُٹھ کر بھی وہ کیا کر سکتے تھے، وہ حصّہ تو اُن کے لیے شجر ممنوعہ تھا۔ اندھیرے ہی میں دیکھا گیا کہ سرور حسین سر جھکائے وہاں سے نکل رہے ہیں۔ سب چپ چاپ اپنے بستروں میں دبک گئے۔

اختر حسین، سرور حسین سے ملنے ضرور آئے لیکن اُن کے رویّے میں نمایاں سرد مہری تھی۔ بچّوں کو وہ ساتھ لے کر نہیں آئے تھے۔ سرور حسین سے اُنہوں نے کہا کہ وہ آگئے ہیں تو ذرا جا کر کھیت، زمین کے معاملات بھی دیکھ لیں۔ بات معقول تھی۔ گماشتہ جی سرور حسین سے ملنے آئے تو اُنہوں نے اُن سے معاملات کو سمجھنے کی کوشش کی تھی۔ وہ خود ایک ذہین وکیل تھے، ایسے معاملات وہ بہت دیکھ چکے تھے۔ گماشتہ جی کے ساتھ وہ بن گئے۔ وہاں کے لوگ اُنہیں دیکھ کر بہت خوش ہوئے۔ وہاں اب بھی شیخ الطاف حسین کی صحبت میں بیٹھنے والے موجود تھے۔ وہ تین روز تک وہاں رہے اور لوگوں میں گھرے رہے۔ وہاں سے واپس آ کر اُنہوں نے بی بی صاحبہ سے گفتگو کی۔

" اماں، ہم لوگوں کے پاس اتنے کھیت ہیں، باغات ہیں، لیکن دیکھنے والا کوئی نہیں۔"

" کیا کریں بیٹا، تم لوگ پردیس چلے گئے، وسیم اور شمیم گھر پر رہتے نہیں۔ بڑے دولہا سب دیکھتے تھے، سو اب اُنہیں فرصت ہی نہیں ملتی۔"

" غلّہ، پھل وغیرہ آجاتے ہیں؟"

" جو پٹواری جی بھجوا دیتے ہیں، ہم لوگ لے لیتے ہیں۔ کچھ پتہ نہیں کہ کتنا پیدا ہوتا ہے، کتنا ضائع ہوتا ہے۔"

" ایک خرابی ہے امّاں —— ہم لوگوں کے کھیت ایک جگہ پر نہیں ہیں، پھیلے ہوئے ہیں، ایک جگہ پر رہتے تو کھیتی کرنے میں بھی آسانی ہوتی۔"

" وہ تو کہو کہ نوکر چاکر، جن مزدور تمہارے ابّا کے زمانے کے ہیں۔ ایماندار لوگ ہیں،

اپنوں کی طرح دیکھتے ہیں۔"

"اماں میری مانیے تو ایک کام کیجیے۔ جو کھیت پھیلے ہوئے ہیں، اُنہیں بیچ دیجیے اور پیسے بینک میں رکھوا دیجیے۔ اس سے بہنوں کی شادیاں بھی ہو جائیں گی اور کھیتی کرنے میں بھی آسانی ہوگی۔"

"بیٹا زمین بیچنا شریفوں کا شیوہ نہیں اور پھر یہ سب زمینیں تو خاندانی ہیں۔"

"اماں، زمانہ بہت بدل چکا ہے۔ ہر چیز بدل رہی ہے۔ زمینداری نہیں رہی، وہ بات ہی نہیں رہی۔"

"پھر بھی بیٹا، زمین تو ماں کی طرح ہوتی ہے نا۔"

"مسلمان اِس عقیدے کو نہیں مانتا۔ وہ جہاں جاتا ہے، وہیں کی زمین کو اپنا لیتا ہے، وہی اس کا وطن بن جاتا ہے اور پھر اماں، یہ زمین رہنے والی بھی نہیں۔ ہندو حکومت جس طرح سے چھوٹے لوگوں کو سر چڑھا رہی ہے، دیکھیے گا، یہ چیز ایک دن رنگ لائے گی، یہ چھوٹے لوگ ایک دن حکومت پر بھی قبضہ کر لیں گے۔"

"بیٹا یہ کون نئی بات ہے۔ زمانہ جب بھی کروٹ لیتا ہے تو چھوٹی کنکری اوپر آ جاتی ہے اور بڑی کنکری نیچے بیٹھ جاتی ہے ——— لیکن میرا دل گوارا نہیں کرتا کہ زمین بیچ دوں۔"

"اماں زمین سے محبت ایمان کی علامت نہیں ——— اور پھر اماں، میں چاہتا ہوں کہ زمین بیچ کے کچھ روپے پاکستان لے جاؤں، وہاں مجھے اس کی بڑی ضرورت ہے۔"

بی بی صاحبہ یکلخت چپ ہو گئیں۔ ایسا لگا جیسے وہ اپنی دی ہوئی دلیلوں پر خود ہی شرمندہ ہو گئی ہوں۔ کچھ دیر کے بعد اُنہوں نے کہا۔

"بیٹا یہ زمین تمہارے ابا کی ہے، تم لوگوں کی ہے، تم لوگوں کے کام نہ آئی تو پھر کس کام کی۔ تم شوق سے ان سے روپے حاصل کر کے لے جاؤ۔"

یوں تو سارے کھیت، شیخ الطاف حسین نے اپنی اولاد کے نام لکھ کر بی بی صاحبہ کو تاحیات اُن کا وارث بنایا تھا اور اُن کی اجازت کے بغیر جائداد کے کسی حصّے کو فروخت نہیں کیا جا سکتا تھا۔ سرور حسین کو جب بی بی صاحبہ کی طرف سے اجازت مل گئی تو اُنہوں نے

پٹواری جی اور گماشتہ جی کو بین سے بُلایا اور اُن کے سامنے یہ تجویز رکھی۔ سُن کر دونوں سُن سے رہ گئے۔ زمین بے شک اُن کی نہیں تھی لیکن اس کی خدمت ان لوگوں نے اس طرح کی تھی کہ اس کی محبت اُن کے اندر سرایت کر گئی تھی۔ اس کو الگ کرنے کی بات سے اُن لوگوں کو بہت دُکھ ہوا۔ لیکن مالک کا حکم تھا، وہ لوگ کر بھی کیا سکتے تھے۔ سرور حسین نے اُنہیں گاہک تلاش کرنے کو کہا۔ گاہک کی کوئی کمی تو تھی نہیں۔ کھیت اور زمین خریدنا، دیہاتوں میں ہمیشہ سے عزت اور وقار کا نشان رہا ہے اور پھر شیخ صاحب کی زمینیں خریدنا تو بہت ہی فخر کی بات تھی۔

کئی گاہک سامنے آ گئے۔ اُن میں دو ایک تو اتنے پُرجوش تھے کہ اس سلسلے میں براہ راست سرور حسین سے ہی بات کرنا چاہتے تھے۔ لیکن پٹواری جی اور گماشتہ جی نے انہیں ایسا کرنے نہیں دیا۔ جب تک وہ لوگ اس خاندان سے وابستہ تھے، اس وقت تک اُنہیں اس خاندان کے ناموس اور وقار کو بلند رکھنا تھا۔ اُن کی اپنی سماجی حیثیت بھی اسی خاندان سے وابستگی میں مضمر تھی ورنہ جو تنخواہیں اُنہیں شیخ صاحب کے زمانے میں ملتی تھیں، وہی اب بھی مل رہی تھیں یعنی پندرہ روپے ماہوار۔ اس سے زیادہ تو پٹواری جی اپنے اُس نوکر کو دے دیتے تھے جو اُن کا پانی بھرتا اور پاؤں دباتا تھا۔ اُن کا بڑا لڑکا ڈپٹی کلکٹر ہو گیا تھا، دوسرا لڑکا وکالت پڑھ رہا تھا، گھر کے دروازے پر بھینس اور گائے بندھی رہتیں۔ لیکن پٹواری جی، شیخ صاحب کی ڈیوڑھی چھوڑ کر اپنے گھر کم ہی جاتے۔ گماشتہ جی کا ایک لڑکا داروغہ ہو گیا تھا۔ دوسرے اور تیسرے لڑکے کالجوں میں پڑھ رہے تھے۔ وہ ہر صبح ناشتہ میں پکّی ڈیڑھ سیر دودھ اور آدھ سیر جلیبی کھاتے۔

پٹواری جی کے ڈپٹی کلکٹر لڑکے نے کہیں سُن لیا کہ مالک کی زمین بکنے والی ہے تو وہ چھٹی لے کر باپ کے پاس پہنچا۔

"بابو جی، سنا ہے کہ مالک کی زمین بکنے والی ہے اور گاہک تلاش کیا جا رہا ہے۔"

"ہاں جی، سنا تو تم نے ٹھیک ہی ہے۔ مالک کی یہی مرضی ہے تو ہم لوگ اس میں کیا بول سکتے ہیں۔"

"بابوجی، کیوں نہ ہم لوگ یہ زمین خرید لیں۔ آپ کی وجہ سے کچھ اونے پونے۔۔۔ ۔۔۔"

"کیا کہا تم نے ______؟" پٹواری جی نے اپنی کمائی دار گاندھی کٹ چشمے کو اپنی ناک پر ایک عزم کے ساتھ جمایا۔" دماغ تو ٹھیک ہے تمہارا، کہیں ڈپٹی ہو کر خراب تو نہیں ہو گیا۔"

"کیوں بابوجی، اِس میں برائی کیا ہے۔ آخر آج ہم اس لائق ہیں کہ ۔۔۔ ۔۔۔"

"جو بولے سو بولے، اب نہ بولنا۔ میری عزت تمہارے ڈپٹی ہونے سے نہیں بڑھی ہے۔ میری عزت نمک حلالی میں پوشیدہ ہے۔ میں نے اس خاندان کا نمک کھایا ہے تو اس کی مریادا کے لیے مر مٹوں گا۔"

"لیکن آخر تو یہ زمینیں بکیں گی اور کوئی گاہک آئے گا پھر۔ ؟"

"کوئی گاہک آئے اور کوڑیوں کے مول مالک اپنی زمین بیچ دیں، ہمیں اس میں کچھ نہیں بولنا، لیکن ہم کبھی یہ ہمت نہیں کر سکتے کہ مالک کے سامنے گاہک بن کر کھڑے ہوں۔ کم از کم میری زندگی تک تو ایسا نہیں ہو سکتا۔"

"پتہ نہیں آپ کس زمانے کی بات کر رہے ہیں بابوجی ـــ ہم لوگ بھی تو آخر زمینداری کے معاملوں کو دیکھتے ہیں۔ نوّے فی صد زمینداروں کی زمینیں اُن کے پُرانے نوکر خریدتے ہیں۔ اس میں زمینداروں ہی کی عزّت بچ جاتی ہے۔ وہ ضرورت پڑنے پر اپنے پُرانے نوکر سے ہی پیسے لیتے رہتے ہیں اور جب یہ پیسے لوٹانے کے لائق نہیں رہتے تو چپکے سے زمین رجسٹری کر دیتے ہیں۔ کسی کو پتہ بھی نہیں چلتا۔ اُن کی عزّت بھی بچ جاتی ہے اور نوکر کو کچھ سستے داموں زمین بھی حاصل ہو جاتی ہے۔"

"وہ کوئی اور مالک اور نوکر ہوتے ہوں گے۔ میں نے کبھی اپنے مالک کے سامنے سر نہیں اُٹھایا۔ انہیں ہمیشہ اپنا مالک سمجھا ہے اور سمجھتا رہوں گا، اس لیے میں جیتے جی وہ سب نہیں ہونے دوں گا جو تم چاہ رہے ہو۔ جاؤ، بھگوان تم کو بہت دے گا، اس معاملے میں دخل مت دو۔"

"ٹھیک ہے بابوجی، جو آپ کی اِچّھا ہوگی وہی ہوگا، لیکن اتنا یاد رکھیے گا کہ دیہات میں اب ہم ہی لوگوں کو رہنا ہے، آپ کے مالک لوگ نہیں رہیں گے۔"

"مالک نہیں رہیں گے تو ہم کون سے بیٹھے رہیں گے ـــ اس وقت تم جو جی چاہے کر لینا۔"

پٹواری جی کا بیٹا مایوس ہو کر چلا گیا۔

مالک کے حکم کی تعمیل میں انہوں نے گاہک سے بات کر لی اور بیعانہ کی رقم لا کر دے دی۔ زمین کی فروخت کے کاغذات تیار ہوئے اور کچہری جا کر رجسٹری ہو گئی۔ پٹواری جی نے دستخط سے پہلے اُن لوگوں سے ساری رقم وصول کر لی تھی۔ چالیس ہزار روپے تھے۔ سرور حسین جب دستخط کے بعد رکشا پر بیٹھنے لگے تو دو آدمی لپکے ہوئے اُن کی طرف آئے۔

" حضور، آپ کے اہل کاروں نے آپ کو بہت کم رقم دلائی۔ اس سے زیادہ تو ہم لوگ دے رہے تھے، لیکن ان لوگوں نے آپ تک پہنچنے ہی نہیں دیا۔"

" بھئی، اب تو جو ہونا تھا، وہ ہو گیا۔" کہہ کر وہ تو چلے گئے لیکن اُن کے دل میں ایک گرہ سی پڑ گئی۔ بی بی صاحبہ سے اُنہوں نے پٹواری جی اور گماشتہ جی کی شکایت کی تو انہوں نے فوراً انہیں ٹوک دیا۔

" توبہ کرو بیٹا ـــــ ان لوگوں کو بے ایمانی ہی کرنی ہوتی تو اب تک سب کچھ ختم ہو جاتا۔ یہ لوگ تو اپنوں سے بڑھ کر ہیں۔ یہ سب تم کو لوگوں نے بہکایا ہے۔"

سرور حسین اُن کی بات سن کر چپ ہو گئے۔ اُن کے زمین بیچنے کی بات بہت جلدی پھیل گئی۔ حالانکہ اُنہوں نے سب زمینیں نہیں بیچی تھیں، صرف پھیلی ہوئی زمینوں کو نمٹایا تھا، ابھی بھی اُن کی بہت سی زمین باقی تھی۔ مولوی شمس الدین، جو اُن کے ابا کے دوستوں میں تھے اور اُن کے بعد بھی اُنہوں نے اس گھر سے اپنا رشتہ برقرار رکھا تھا، ایک روز سرور حسین سے ملنے آئے تو انہیں کنارے لے جا کر پوچھا۔

" بیٹا، سنا ہے تم نے اپنی زمینیں بیچی ہیں۔؟"

" ہاں چچا۔ ضرورت تھی اور پھر اُنہیں دیکھنے والا بھی کوئی نہیں۔"

" ایسی بھی کیا ضرورت پڑ گئی جو تم کو زمین بیچنی پڑی۔ تمہاری ہمت کیسے ہوئی۔ بیٹا اگر ایسی ہی ضرورت تھی تو کم از کم مجھ سے کہا ہوتا۔"

سرور حسین جانتے تھے کہ مولوی شمس الدین کی مالی حالت اچھی نہیں، بس کسی طرح کام چل رہا ہے، اُنہوں نے پوچھ ہی لیا۔

" چچا، آپ کیسے میری مدد کرتے۔؟"

" بیٹا، میں براہ راست تو تمہاری کوئی مدد نہیں کر سکتا تھا لیکن میرے تعلقات بہت ہیں،

میں تمہارے لیے راستہ آسان کر دیتا۔"

"وہ کس طرح ـــــ؟ آپ بتا دیجیے چچا تاکہ آئندہ کبھی ضرورت ہو تو ـــــ"

"میاں صاحبزادے، میں تمہیں قرض دلا دیتا اور وہ بھی یوں کہ داہنے ہاتھ سے دیا جائے تو بائیں کو خبر نہ ہو۔"

"لیکن پھر قرض کے ادا ہونے کی کیا صورت ہوتی۔؟"

"ارے قرض کی ادائیگی کی صورت تو خدا پیدا کرتا ہے، ہم بندوں کی کیا حقیقت ہے۔"

"اس کے سوا اور کیا ہو سکتا ہے چچا کہ چپکے چپکے قرض لیے جائیں اور جب قرض خواہ کا مطالبہ بڑھ جائے تو ہزار کی چیز سو میں دے دی جائے۔ فضلو چچا نے یہی کیا، قمرالدین ماموں نے یہی کیا، میں کتنے نام گناؤں۔"

"لیکن بیٹا، برسرِ عام زمین فروخت کرنا تو عزت کی نیلامی ہے۔ اس سے تو لاکھ گنا اچھا ہے کہ آدمی اندھیرے میں کچھ زیادہ دے دلا کر اپنی ضرورت پوری کرلے۔"

"یہ کون سی عقل مندی ہے۔ جب بیچنا ہی ٹھہرا تو پھر منہ چھپانے کی کیا ضرورت، مناسب دام تو وصول ہونے چاہئیں۔"

"بیٹا، تم جس طرح بات کر رہے ہو، وہ شیخ الطاف حسین کا لہجہ ہرگز نہیں ہے۔ بیٹا، ہم لوگ بنیا نہیں ہیں نا، جو نفع نقصان کا حساب رکھیں۔ ہم لوگ تو خاندانی رئیس ہیں۔ زمانہ نے بے شک یہ وقت دکھلا دیا ہے کہ پیسوں کے محتاج ہو گئے ہیں لیکن الحمدللہ خاندانی وقار اور رئیسانہ مرتبے میں کوئی کمی نہیں آئی ہے۔"

"چچا، ہم لوگ تو پاکستان جا کر ان چیزوں کو بھول چکے ہیں۔ ہمیں تو اپنے گھر چلانے ہیں، روٹی حاصل کرنی ہے، اس لیے ہم لوگ تو نفع نقصان کو خوب پرکھتے ہیں۔"

مولانا شمس الدین نے خاندانی رئیس کی اولاد کے اطوار پر اظہارِ افسوس کیا اور مرض کو لاعلاج سمجھتے ہوئے رخصت ہو گئے۔

سرور حسین کا کافی وقت بھاگ دوڑ میں گزر گیا اور ان کو جانے میں صرف بیس دن رہ گئے۔ انہوں نے نصف رقم بی بی صاحبہ کے نام پر بینک میں رکھوا دی اور نصف رقم کو پاکستان منتقل کرنے کے لیے اپنے ایک خاندانی نمک خوار کو کراچی خط بھیجا کہ وہ روپے انہیں وہاں دے دے۔

وہ اتنے ہی روپے یہاں اس کے رشتہ داروں کو ادا کر دیں گے ـــــ وہ شخص دیکھتے دیکھتے کراچی میں لکھ پتی ہو گیا تھا۔ اُس نے ٹھیکہ کا کام شروع کر کے نام اور دولت دونوں کمائے تھے۔ سرور حسین وغیرہ کے سامنے آتا تو بڑا مؤدب رہتا لیکن انہیں پتہ چلا تھا کہ وہ خود کو اُن کا رشتہ دار بتاتا ہے۔ سرور حسین نے یہ سُن کر اقرار کیا تھا اور نہ انکار۔ کراچی میں اُس سے میل جول رکھنا، سوشل اسٹیٹس کا معاملہ تھا۔ وہ اپنے غریب رشتہ داروں کو ہندوستان میں روپے بھیجتا، اور ضرورت مندوں سے اس قسم کے تبادلے کیا کرتا۔ سرور حسین کو اُس نے فوراً لکھا کہ وہ تبادلے کے لیے تیار ہے۔ اُس نے اپنے اُن رشتہ داروں کے نام بھی لکھ بھیجے جنھیں ہندوستان میں یہ روپے دینے تھے۔ سرور حسین نے گماشتہ جی کی معرفت یہ روپے اُن لوگوں کو بھیج دیے اور احتیاطاً رسید بھی لکھوالی۔ گماشتہ جی اس سارے کھیل میں بس خدا کی قدرت دیکھتے رہے کہ جن لوگوں کے یہاں جانے کے بارے میں انہوں نے کبھی سوچا بھی نہیں تھا وہاں مالک کے کہنے پر اور مالک کے کام سے جانا پڑا۔

بہنوں کی شادی کا مسئلہ گمبھیر تھا۔ رشتے آتے رہتے لیکن کوئی حتمی جواب نہیں ہونے کی صورت میں یوں ہی پڑے رہتے۔ سرور حسین نے چھان پھٹک کر دو گولٹ رشتے نکالے اور بی بی صاحبہ سے مشورہ کرنے کے بعد منظوری کے خط لکھ دیے۔ وسیم تو نوکر ہو گئے تھے، شمیم کی وکالت کا آخری سال تھا، دوسری طرف ایک لڑکا بڑا کاشت کار تھا، پڑھا لکھا کوئی خاص نہیں تھا، لیکن پیسے بہت تھے۔ دوسرا بی اے پاس تھا اور جوتوں کی دُکان کھول رکھی تھی۔ تیسری بہن کا رشتہ انہوں نے مشہور کانگریسی لیڈر امام الدین کے لڑکے نصیر الدین سے طے کر دیا، جو یوں تو کوئی کام نہیں کرتا تھا لیکن سیاست میں بڑا سرگرم تھا اور بہت سے منسٹروں اور ممبران قانون ساز کے یہاں اس کا آنا جانا تھا۔ اختر حسین کے یہاں بھی اُس کی خوب آمد و رفت تھی۔ لوگ کہتے تھے کہ یہ لڑکا بہت اونچا جائے گا کیوں کہ جہاں وہ پاؤں رکھ کر کھڑا ہے، وہاں زمانے کی نبض دھڑک رہی ہے۔ سرور حسین نے ٹیلیگرام دے کر وسیم اور شمیم کو بُلایا اور بہت سادگی کے ساتھ بھائیوں اور بہنوں کی شادیاں کر دیں۔ قریبی رشتہ داروں میں صرف اختر حسین ہی شرکت کر سکے۔ بی بی صاحبہ کہتی رہیں کہ ابھی صرف نکاح کر دیے جائیں، شادیاں بعد میں ہوں تاکہ اصغر حسین بھی ان میں شرکت کر سکیں۔ لیکن سرور حسین نے انہیں راضی کر کے ہی دم لیا۔

وہ اچھی طرح جانتے تھے کہ پھر اُن کا آنا بہت مشکل ہوگا اور اُن کی غیر موجودگی میں ان مسئلوں کو کوئی نمٹا نہیں سکے گا۔

شادی کے تیسرے ہی دن وہ پاکستان روانہ ہوگئے۔ اُن کے ویزا کی میعاد ختم ہو چکی تھی۔ اس میں توسیع کی اُنہوں نے جو درخواست دی، وہ نامنظور ہوگئی، اس لیے فوراً روانہ ہو جانے کے سوا کوئی چارہ ہی نہیں تھا۔

اس دفعہ اُن کی روانگی پر گھر میں ایک کہرام سا مچ گیا۔ بی بی صاحبہ رو رہی تھیں، سبھی لوگ رو رہے تھے۔ بین سے پٹواری جی، گماشتہ جی اور دوسرے نوکر اُنہیں رخصت کرنے آئے تھے۔ بہار شریف میں ملنے جلنے والوں کی بھیڑ تھی۔ لوگ اب اچھی طرح جان گئے تھے کہ پاکستان جانے کا کیا مطلب ہوتا ہے۔ رکشا آ گیا۔ سرور حسین کو پٹنہ میں رُک کر ضلع پولیس ہیڈ کوارٹر میں اپنی روانگی کا اندراج کرانا تھا۔ رکشا پر چڑھنے سے پہلے اُنہوں نے بی بی صاحبہ سے مصافحہ کیا اور آنکھیں بند کر کے سورہ فاتحہ پڑھی۔ بی بی صاحبہ نے ڈبڈبائی آنکھوں سے اُنہیں رخصت کیا۔

"جاؤ بیٹا، خدا کے سپرد کیا ——— جلدی آنا اور جج بن کے آنا۔"

آنسوؤں کی بارش میں سرور حسین زبان سے کچھ نہیں نکال سکے، رکشا چلا گیا۔

۲۲

پٹنہ میں اختر حسین نے اُن سے کہا۔

"اماں بالکل تنہا رہ گئی ہیں۔ لڑکیاں بھی سسرال چلی گئیں۔ وہ پٹنہ آنے کو تیار ہی نہیں ہوتیں۔ آپ اس سلسلے میں کچھ سوچیے۔"

یہ مسئلہ واقعی بہت غور طلب تھا۔ نثار بیچارہ گونگا ہی تھا۔ وہ کسی کام ہی کا نہیں تھا۔ اُس کے سامنے ناشتہ کھانا لگا دیا جاتا تو کھا لیتا ورنہ بھوکا ہی رہ جاتا۔ بی بی صاحبہ اس کو بہت چاہتی تھیں۔ اُنہوں نے اس کا پلنگ، اپنے پلنگ کے قریب ہی بچھوا لیا تھا۔ وہ جوان تھا لیکن وہ بچّوں کی طرح اسے پیار کرتیں۔ اُنہوں نے نثار کے لیے ایک سلائی

مشین خرید دی تھی۔ ایک درزی روزانہ اُسے سلائی سکھانے آتا۔ نثار نے بہت جلدی سینا سیکھ لیا تھا اور اب وہ چھوٹی موٹی چیزیں سینے بھی لگا تھا۔

حامد، نوکری کے چکر میں دن رات ایک کیے ہوئے تھا۔ جس روز اُس کو نوکری مل جاتی، وہ بہار شریف چھوڑ کے چلا جاتا۔ بی بی صاحبہ کی تنہائی اختر حسین کے لیے سوہان روح بن گئی تھی۔ وہ بہار شریف چھوڑنے کو کسی قیمت پر تیار نہیں تھیں۔ لوگ انہیں سمجھاتے سمجھاتے تھک گئے تھے۔ سرور حسین نے اختر حسین سے کہا کہ وہ اُن کا پاسپورٹ بنوا دیں، وہ کسی بہانے سے اُنہیں پاکستان بلوانے کی کوشش کریں گے، وہاں وہ بچّوں میں بہل جائیں گی اور یہاں آنا بھول جائیں گی۔ اختر حسین خاموش رہے۔ وہ جانتے تھے کہ بی بی صاحبہ نہ پاکستان جائیں گی اور نہ وہاں رُکیں گی۔ سرور حسین پاکستان روانہ ہوگئے۔ اگرچہ اُن کا یہ سفر مختصر تھا لیکن اس عرصہ میں وہ بہت سے کام کر گئے تھے۔

اختر حسین اپنی مصروفیت کی وجہ سے پٹنہ میں تھے اِس لیے بہت سی باتوں پر اُن سے مشورہ نہیں ہو سکا تھا۔ اختر حسین کو اس سے ایک دھچکا سا لگا تھا۔ لیکن وہ عقل مند آدمی تھے، ہر بات کا عقلی پہلو اُن کے سامنے رہتا۔ شیخ صاحب کی جائداد کے وہ مالک نہیں تھے، لیکن اُنہوں نے اُن کی جائداد کی حفاظت کی تھی اور اس کے رموز و نکات سے گہری واقفیت رکھتے تھے، وہ فیصلہ نہیں کر سکتے تھے لیکن مشورہ دینے کا اُن کا حق ضرور محفوظ تھا۔ زمین کے فروخت ہونے کی بات اُن تک دیر میں پہنچی تھی اور اُنہیں اس کا افسوس ہوا تھا لیکن وہ اپنے جذبات کو اندر اندر جذب کر لینے کی بے پناہ صلاحیت رکھتے تھے اور رواداری کو اپنی شریعت میں ایمان کا درجہ دیتے۔ وہ قبل کی طرح ہر ہفتہ بہار شریف جاتے رہے۔

جب وہ بین ہاؤس آتے تو اُن کی موجودگی سے وہاں ایک رونق سی ہو جاتی۔ پولیس کا پہرہ لگ جاتا اور ملنے جلنے والوں کا ایک تانتا سا بندھ جاتا۔

محمد یونس اگرچہ کابینہ سطح کے منسٹر تھے لیکن اُنہیں یہ عوامی مقبولیت حاصل نہ تھی۔ اس کے علاوہ وہ پولیس اور حکام میں گھرے رہنا زیادہ پسند کرتے، کچھ مخصوص افراد کے یہاں دعوت کھاتے اور چلے جاتے۔ عوام سے وہ براہ راست ملاقات ہی نہ کرتے۔ اُن کا سکریٹری ضرورت مندوں کی درخواستیں جمع کر لیتا، ان درخواستوں کا کیا ہوتا، یہ آج تک کسی کو پتہ نہ چلا۔

البتہ اُن کے آنے پر اُن کے پرانے مسلم لیگی دوست اور نئے کانگریسی رفیق شہر میں استقبالیہ دروازے لگوانے کا اہتمام ضرور کرتے اور اُن کے جلسوں میں ٹرکوں سے بھر بھر کے آدمی لاتے۔ ان سب میں پیسے تو بہت خرچ ہوتے، لیکن اس کی فکر کرنے کی زیادہ ضرورت محسوس نہ ہوتی۔ محمد یونس آبپاشی اور بجلی کے محکموں کے منسٹر تھے۔ اُن کے محکموں کے افراد، اُن کی آمد کے موقع پر بہت ہی مستعدی کا ثبوت دیتے۔

محکمہ آبپاشی میں سیکڑوں آسامیاں نکلیں۔ محمد یونس کے بہار شریف کا باشندہ ہونے کی وجہ سے یہاں کے نوجوانوں کے دل میں دھڑکنیں پیدا ہوگئیں۔ ہر شخص محمد یونس تک پہنچنے کی کوشش کرنے لگا۔ حامد نے بھی درخواست بھیج دی اور بی بی صاجبہ سے اختر حسین سے کہلوایا کہ وہ اگر پیروی کر دیں تو نوکری پکی ہو جائے۔ اختر حسین نے بی بی صاجبہ سے وعدہ کیا کہ وہ اس سلسلے میں معلومات حاصل کریں گے۔ پیروی کا وعدہ انہوں نے نہیں کیا۔

دریافت کرنے پر اجودھیا بابو نے انہیں بتایا کہ آب پاشی کی یہ جگہیں دس دس ہزار روپے میں فروخت ہو رہی ہیں، کبھی کبھی نیلام کی صورت بھی آجاتی ہے۔ اختر حسین کو اس پر یقین نہیں آیا کہ سیاسی رقابت میں اس قسم کی باتیں اُڑا دی جاتی ہیں۔ اتفاق سے وہ چیف منسٹر کے پاس ایک سرکاری کام سے گئے ہوئے تھے کہ اپوزیشن لیڈروں کا ایک وفد چیف منسٹر سے ملنے آیا جس نے ایک میمورنڈم دے کر محکمہ آب پاشی کی بحالیوں میں ہونے والی دھاندلیوں کی جانچ کرنے کی مانگ کی۔ چیف منسٹر نے اُن سے جانچ کرانے کا وعدہ کر لیا۔ لیکن یہ بحالیاں ہوگئیں۔ حامد کے جن ساتھیوں نے روپے خرچ کیے، وہ نوکر ہو گئے۔ حامد کی بحالی نہیں ہو سکی۔ جس روز اس کے ساتھیوں کو بحالی کے خطوط ملے، اُس روز وہ دن بھر لحاف میں پڑا رہا۔ بی بی صاجبہ کئی بار اُسے کھانے کو پوچھنے آئیں لیکن اُس نے ہر بار پیٹ میں درد کا بہانہ کر دیا۔ بی بی صاجبہ نے پیٹ میں درد کی دوا منگا کر دی تو وہ کھڑکی سے باہر پھینک دی۔ شام ہوگئی اور وہ یوں ہی پڑا رہا تو بی بی صاجبہ نے لحاف ہٹا کے اُسے اُٹھانے کی کوشش کی۔ تکیہ آنسوؤں سے بھیگا تھا اور بستر بھی نم تھا۔ حامد کی آنکھیں سُرخ تھیں، وہ شاید دن بھر روتا رہا تھا۔ بی بی صاجبہ اُس کی یہ کیفیت دیکھ کر دہل گئیں۔

"یہ کیا بیٹے ——— جوان ہو کے رونا دھونا ———"

" نانی اماں ـــــ مجھے بی اے پاس کیے ہوئے کئی برس ہو گئے، میرے تمام ساتھیو کو نوکری مل گئی اور میں بیکار رہ گیا، ایسی زندگی سے کیا فائدہ ــ ؟ "

" بیٹا، حالات سے آدمی اتنا گھبراتا ہے ـ ؟ تم پھر دنیا کا سامنا کیسے کرسکو گے ـ ابھی تو تمہارے سامنے بہت بڑی دنیا پھیلی ہوئی ہے ـ دنیا میں بہت سے لوگ نوکری نہیں کرتے تو کیا وہ بھوکوں مرتے ہیں ـ "

" نانی اماں، جو لوگ نوکری نہیں کرتے، اُن کے گھروں میں کھانے کو بہت کچھ ہوتا ہے ـ میرے پاس کیا ہے، میں کیا کروں گا ـ نوکری کی عمر چلی گئی تو پھر بھیک مانگتے گزرے گی ـ "

" بیٹا، روزی روٹی کا وعدہ اللہ نے کیا ہے تو وہ پورا کرے گا ـ اِس کی فکر میں ہم کیوں جان دیں ـ اور پھر تمہیں کون سی کمی ہے ـ آج نہیں تو کل نوکری ہو ہی جائے گی ـ "

" نانی اماں، میرے ساتھی کہتے ہیں کہ تمہارے ابا ڈپٹی منسٹر ہیں، پھر بھی تم کو نوکری نہیں ملی ـ تمہارے ابا کا کوئی اثر نہیں ہے، اُن کی بات کوئی نہیں سُنتا ـ بتائیے، میں کیا جواب دوں ؟ "

" تمہارے ابا ایمان دار آدمی ہیں ـ وہ بے ایمانی نہیں کر سکتے ـ وہ نہیں چاہتے کہ اُن کا بیٹا غلط ڈھنگ سے کچھ حاصل کرے ـ جب وہ خود کسی کے پاس نہیں جاتے تو پھر اثر نہیں ہونے کا کیا سوال ہے ـ "

" نانی اماں، میرے باپ نہیں چاہتے کہ میں نوکری کروں ـ وہ مجھے بیکار دیکھ کر بہت خوش ہوتے ہیں ـ دیکھ لیجیے گا نانی اماں، مجھے نوکری نہیں ملی تو میں پاکستان بھاگ جاؤں گا ـ "

بی بی صاحبہ نے اُس کے مُنہ پر جلدی سے اپنا ہاتھ رکھ دیا ـ

" ایسی باتیں مُنہ سے نہیں نکالا کرتے ـ تو کیا جانے کہ پاکستان کیا ہوتا ہے، ارے وہ یہ دُنیا نہیں، کوئی دوسری ہی دُنیا ہے ـ "

" پھر میں کیا کروں گا ـ یہاں بھوکوں مرنے سے تو بہتر ہے ـ "

" کون کون مر رہا ہے ـــ ؟ کون تجھے بھوکا مار رہا ہے ـ ؟ سُن لڑکے، ابھی تیرے پاس خُدا کا دیا اتنا کچھ ہے کہ تو کیا، تیرے بال بچے بھی برسوں آرام سے کھائیں ـ "

" نانی اماں ـــ یہ زمین، یہ کھیت، انڈے دینے والی مُرغی نہیں ـ یہ کسی کا پیٹ نہیں پال سکتے، یہ چیزیں ختم ہونے والی ہیں ـ آپ جانتی ہیں کہ حکومت، مزدوروں کو بہت سے حقوق دینے

جا رہی ہے۔ مزدور مالک سے بھی بڑھ جائیں گے، اُنہیں نوکری بھی ملے گی اور کھیت بھی۔"

"ارے بٹیا تو سُن تارہ۔ کون مالک، مزدور کو اپنا کھیت دے گا۔ حق بل جانے سے کیا ہوتا ہے، اصل چیز تو قبضہ ہے۔"

"پھر بتائیے، نانی اماں، میں کیا کروں۔ آخر میری بھی ضروریات ہیں اور....."

"تجھے جب بھی کسی چیز کی ضرورت ہو، مجھ سے کہو۔ میں تمہاری ضرورتیں پوری کروں گی، لیکن خدا کے واسطے پاکستان کا نام کبھی مت لینا۔ ارے بٹیا، تو نہیں جانتا کہ پاکستان میں نے کیا کچھ کھو دیا ہے۔ دیکھ تیرے ماموں، یہاں آنے کے لیے کیسا تڑپتے ہیں۔ پاکستان، سرور کو کیا دے رہا ہے، وہی باپ دادا کی زمین کام آ رہی ہے نا ————"

بی بی صاحبہ کی باتوں سے حامد کے دل کو ایک گونہ سکون سا ملا۔ اُسے ایسا لگا کہ اگر فوراً اس کو نوکری نہیں ملی تو کم از کم وہ بھوکوں نہیں مرے گا۔ نانی اماں کی زندگی تک تو ایسا نہیں ہوگا۔ اُس نے ڈھونڈ ڈھونڈ کر کئی ٹیوشن تلاش کیے اور تقریباً سو روپے ماہوار کمانے لگا۔ اتنے پیسے تو بہت سی اُن نوکریوں میں بھی نہیں ملتے تھے جن کے لیے وہ درخواستیں بھیج چکا تھا۔ لیکن ٹیوشن سال بھر نہیں چلتے تھے، امتحان کے وقت دو تین مہینوں کے لیے اُن کا عروج رہتا۔ والدین حضرات کا خیال تھا کہ امتحانوں میں پاس ہونے کے لیے ٹیوشن ایک ضروری امر ہے۔

گھر میں ایک پرانی سائیکل پڑی تھی جس پر "ریلے" نام بہت گھسنے کے بعد بھی مٹ نہیں سکا تھا۔ حامد کے پاس کچھ پیسے ہوئے تو اُس نے ٹوٹی پھوٹی سائیکل کو صاف کرا کے مرمّت کرایا، وہ استعمال کے لائق ہو گئی۔

ایک روز ٹیوشن سے واپسی پر وہ میٹھے پان کھانے کے لیے رُکا تو اُس کی چامو سے ملاقات ہو گئی۔ چُست پاجامہ، کرتا اور واسکٹ میں چامو کوئی نیتا لگ رہا تھا۔ آنکھوں پر چشمہ بھی چڑھا تھا۔ حامد کے ہاتھ بے ساختہ سلام کے لیے اُٹھ گئے۔ چامو اس سے بڑی محبت سے ملا۔

———— چامو کی ماں، بی بی صاحبہ کی خاص ملازمہ رہ چکی تھی۔ چامو نے بھی بچپن میں اُن کے گھر کے برتن صاف کیے تھے۔ اُس کی ماں مر گئی تو چامو وہاں سے بھاگ نکلا، کلکتہ جا کر پتہ نہیں کیا کرتا رہا۔ اب بھی کلکتہ ہی میں رہتا تھا۔ کبھی کبھار گھر آتا تو ایک آدھ بار بین

ہاؤس بھی آجاتا۔ بی بی صاحبہ کے سامنے نہیں بیٹھتا، بچّوں سے پوچھتا۔

" بتاؤ تو میں کون ہوں۔؟ "

" چامو ـــــ چامو۔ "

" بچّے چلّاتے۔ بی بی صاحبہ تو اُسے چموا کہتی تھیں۔"

" نہیں، چامو ماموں ـــــ جو ماموں کہے گا، اُسے ٹافیاں ملیں گی۔ "

" چامو ماموں، چامو ماموں۔ "

بچّوں کو بھلا 'ماموں' کہنے میں کیا اعتراض ہوتا۔ اُنہیں کلکتہ کی کھٹّی میٹھی گولیاں ملتیں۔ ایک بار وسیم نے چامو کو بچّوں سے کورس کراتے دیکھ لیا تو بی بی صاحبہ سے شکایت کی۔

" کیا حرج ہے بیٹیا۔ آخر وہ بین کا ہے، اس سے کوئی چھوٹا بڑا تھوڑا ہی ہو جاتا ہے۔"

بی بی صاحبہ نے اُسے سمجھایا۔ تو چامو، بچّوں کا چامو ماموں بن گیا تھا۔ حامد بھی اُسے ماموں کہتا۔

چامو نے ایک ایک کر کے سب کی خیریت دریافت کی۔ اُس کے بعد پوچھا۔

" آج کل تم کیا کر رہے ہو ـــــ بی اے کر چکے ہونا۔؟ "

" بیکار ہوں چامو ماموں۔ نوکری ملتی ہی نہیں۔ "

" کمال ہے بھئی، تمہارے ابا منسٹر ہیں پھر بھی نوکری نہیں ملتی۔ "

" ابّا کہتے ہیں کہ اپنے بل پر نوکری حاصل کرو۔ وہ پیروی کے بڑے مخالف ہیں۔ "

" جانے کس دُنیا کے آدمی ہیں تمہارے ابّا بھی ـــــ ارے آج کل جب تک پیروی نہ ہو تو کسی کو نوکری ملتی ہے؟ "

" میں تو آج کل ٹیوشن پڑھا رہا ہوں۔ "

" بہت افسوس کی بات ہے۔ تمہارے جیسا اعلیٰ خاندان کا لڑکا نوکری کے لیے یوں پریشان رہے، بہت افسوس کی بات ہے۔ "

چامو، حامد کو ایک ہوٹل میں لے گیا۔ انڈوں کے پکوڑے کھلائے، کافی پلائی، پھر بولا۔

" بیٹا، تم پاکستان کیوں نہیں چلے جاتے۔ "؟

" آپ تو جانتے ہی ہیں ابّا، پاکستان کا نام بھی سننا نہیں چاہتے۔ نانی اماں پاکستان کے نام پر

رونے لگتی ہیں اور ــــــ"

"وہ سب تو ٹھیک لیکن یہاں نوکری نہیں ملے گی تو کیا کرو گے۔ نوکری ملنے کی ایک عمر ہوتی ہے نا، وہ ختم ہو جائے گی تو کیا زندگی بھر ٹیوشن پڑھاتے رہو گے ــــ جب تم اتنی بڑی پیروی کے رہتے ہوئے نوکری حاصل نہیں کر سکے تو سوچو، جس کا کوئی نہیں ہے، اس کا کیا حال ہوتا ہوگا؟"

حامد سر جھکائے، اس کی بات سنتا رہا۔

"بیٹا اگر پاکستان نہ ہو تو تم جیسے نوجوان یہاں بھوکوں مر جاتے۔ نہیں تو چوری ڈکیتی، لوٹ مار کرنے کے سوا اُن کے پاس کوئی راستہ نہیں رہ جاتا، پیٹ کی آگ بجھانے کے لیے کچھ تو کرنا ہی پڑتا ہے۔

یہاں نوکری نہیں ملتی" نہ ملے۔ اللہ پاکستان کو سلامت رکھے، آخر وہ کس مصرف کے لیے بنا ہے۔ وہاں نہ نوکری کی کمی ہے نہ پیسوں کی۔ تم نہیں جانتے حامد میاں کہ جب آدمی کے پاس پیسے رہتے ہیں تو پرائے بھی اپنے ہو جاتے ہیں اور جب پیسے نہیں رہتے تو پھر کوئی بھی بُرے وقت میں کام نہیں آتا۔ تم خود سوچو، کب تک دوسروں کے کہنے پر اپنے آپ کو برباد کرتے رہو گے۔"

چاموں کی باتیں ایک ایک کر کے حامد کے اندر اُترتی جا رہی تھیں۔

"لیکن چاموماموں، میرا پاسپورٹ کیسے بن سکتا ہے۔ ابّا اس کے لیے کبھی تیار نہیں ہوں گے اور پھر ویزا وغیرہ ... ..."

"میاں پاسپورٹ سے جاؤ گے تو کتنے دن وہاں رہو گے۔ بھلا آدمی پاسپورٹ سے پاکستان جاتا ہے؟ــــ پاسپورٹ سے جاؤ گے تو بھگا دیے جاؤ گے۔ سمجھے؟"

"پھر ــــ؟"

چامو نے حامد کا سر پکڑ کر اپنے نزدیک کیا اور کان میں بولا۔

"گردنیا پاسپورٹ کا نام سنا ہے کبھی۔۔؟

نام تو حامد نے بہت سنا تھا، لیکن اس کے بارے میں جانتا کچھ بھی نہ تھا۔ اس کے بہت سے ساتھی اسی پاسپورٹ کے سہارے پاکستان گئے تھے۔

"نام تو بہت سُنا ہے ماموں۔ لیکن یہ کیا ہوتا ہے، کیسے ہوتا ہے، میں نہیں جانتا۔"

"تم کو زیادہ جاننے کی ضرورت بھی نہیں۔ میں تم جیسے سیکڑوں نہیں، ہزاروں نوجوانوں کو وہاں بھیج چکا ہوں۔ سب کو وہاں اچھی اچھی نوکریاں ملیں اور سب وہاں خوش ہیں۔"

یہ تو حامد بھی جانتا تھا کہ جو لوگ وہاں گئے تھے، وہ سبھی نوکریاں کر رہے تھے، اور سب خوش تھے۔ چامو کی باتوں نے اس کے اندر امید کی لہریں بیدار کر دیں۔

"پھر بتایئے ماموں، مجھے کیا کرنا ہوگا؟ میرے پاس تو پیسے بھی نہیں۔"

"بیٹا، یوں تو اس میں فی کس دو ہزار روپے خرچ ہوتے ہیں۔ لیکن میں نے تمہارے گھر کا نمک کھایا ہے۔ بی بی صاحبہ کی مہربانیاں میں کبھی بھول نہیں سکتا۔ تم تو گھر کے بچے ہو، جو آدمی تمہیں لے جائے گا، اُسے راستہ میں کچھ کھلا پلا دینا۔"

چامو نے اُسے بتایا کہ وہ کلکتہ سے اُسے خط لکھے گا، خط کے ملتے ہی وہ کلکتہ آجائے۔

چامو، حامد کے ساتھ بین ہاؤس بھی آیا، بی بی صاحبہ کے قدم چھوئے۔ دیر تک وہاں رہا لیکن کسی سے حامد سے ہوئی گفتگو کے بارے میں کچھ نہیں بتایا۔ حامد کے چہرے پر خوشیوں کے جو رنگ تھے، اُنہیں کوئی پہچان ہی نہیں سکا۔

حامد، چامو کے خط کا بہت بے چینی سے انتظار کرنے لگا۔ ڈاکیہ کو اُس نے کہہ دیا تھا کہ اس کے نام جو خط آئے، وہ کسی کو اور کو نہ دے سیدھا اس کے ہاتھ میں دے۔ ایک بار ڈاکیہ نے اسے ایک خط لا کر دیا۔ خط پر مہر اس سے پڑھی نہ گئی لیکن وہ خوشی سے دیوانہ ہو گیا۔ آخر اُسے کون خط لکھتا، سب لوگ تو بس سلام و دعا لکھوا کے رہ جاتے۔ اس کے پاس یا تو انٹرویو لیٹر آتے یا پھر نوکری نہ ملنے کی اطلاع آتی۔ اس کے بہت سے ساتھی پاکستان چلے گئے تھے لیکن کسی کا بھی اس کے پاس کوئی خط نہیں آیا تھا۔ اس کو یقین ہو گیا کہ یہ چامو ہی کا خط ہے۔ لرزتے ہاتھوں سے اس نے خط کھولا۔ اس کی ساری خوشی کافور ہو گئی۔ ایک ایسی فرم سے نوکری نہ ملنے کی اطلاع آئی تھی جہاں انٹرویو دے کے وہ لگ بھگ بھول چکا تھا۔ کافی عرصہ بیت گیا تھا۔ شاید دفتر میں اطلاعی خط دیر تک پڑا رہ گیا تھا۔ اس نے مارے غصے کے خط پرزہ پرزہ کر ڈالا۔ بے بسی سے اس کی آنکھوں میں آنسو آ گئے۔

چامو کے خط کا انتظار اس کی زندگی کا محور بن گیا تھا۔ اس نے ٹیوشن سے اب تک پانچ سو روپے جمع کر لیے تھے۔ چامو نے رقم کے بارے میں اس کو کچھ نہیں بتایا تھا۔ ایک سونے کی انگوٹھی اس نے ماں سے ضد کر کے پہن لی تھی جو ابھی تک اس کی انگلی میں تھی۔ ماں نے کہا تھا کہ سونا مرد کو حرام ہے لیکن وہ نہیں مانا تھا۔ کپڑے اس کے پاس جتنے بھی تھے سب اس نے سمیٹ سنبھال کر رکھے تھے کہ جانے کس وقت بلاوا آ جائے۔ اپنی کتابیں بھی لکڑی کے ایک بکس میں بند کر کے اسے کانٹیوں سے بند کر دیا تھا اور اس طرح وہ جانے کو بالکل تیار تھا۔

دوسرا الیکشن قریب آ رہا تھا۔ اقتدار کی حسرت رکھنے والوں کی دوڑ دھوپ شروع ہو چکی تھی۔ اس وقت تک یہ سلسلہ جاری تھا کہ مرکزی کمیٹی، صوبائی کمیٹی سے اور صوبائی کمیٹی ضلع کمیٹی سے امیدواروں کی فہرست مانگتی تھی۔ اس دفعہ امیدواروں کی تعداد بہت زیادہ تھی۔ عام طور پر ایوان قانون ساز میں جانے کا فائدہ معلوم ہو چکا تھا اور لوگ کسی قیمت پر بھی اس کی ممبری حاصل کرنا چاہتے تھے۔ اس سے ضلع کمیٹی اور اس کے تحت کام کرنے والی

کمیٹیوں کا کام بہت بڑھ گیا تھا۔ ایک ایک جگہ کے لیے چار چار پانچ پانچ ناموں کی سفارش کی جا رہی تھی تاکہ مقامی طور پر زیادہ ہنگامہ نہ ہو اور مرکزی کمیٹی انہیں میں سے کسی ایک کو منتخب کر لے۔

محمد یونس کونسل کے ممبر تھے، انہوں نے اسمبلی کے لیے درخواست ہی نہیں دی تھی، البتہ بہار شریف شہری حلقہ سے ضلع کمیٹی نے صرف ایک ہی نام کی سفارش کی تھی ——— اختر حسین کے نام کی۔ اختر حسین وزارت میں بھی شامل تھے، ان کی امیدواری گویا طے تھی اور لوگوں کی طرح انہوں نے بھاگ دوڑ میں حصہ بھی نہیں تھا۔ محمد یونس بہت سارے لوگوں کی سفارش لے کر دلّی گئے ہوئے تھے اور پندرہ روز سے دلّی میں مقیم تھے۔ جب کانگریس پارلیمنٹری بورڈ کی میٹنگ کے بعد امیدواروں کی آخری فہرست آئی تو یہ دیکھ کر سبھی کو بہت تعجب ہوا کہ اس میں اختر حسین کا نام شامل نہیں تھا۔ ان کی جگہ محمد یونس کو امیدوار بنایا گیا تھا۔ اجودھیا بابو جو ضلع کانگریس کے صدر بھی تھے بھاگے بھاگے اختر حسین کے بنگلہ پر پہنچے اور ان سے فوراً دلّی چلنے کو کہا لیکن اختر حسین نے صاف انکار کر دیا۔

"اب نہیں اجودھیا بابو! ——— جو ہونا تھا وہ ہو گیا، کانگریس نے کچھ مناسب ہی سمجھ کے محمد یونس کو اپنا امیدوار بنایا ہو گا۔ اب مجھے اس میں دخل نہیں دینا ہے۔"

"اختر بھائی ——— ان لوگوں نے ضلع کانگریس کے منہ پر ایک طمانچہ مارا ہے جس کا خمیازہ انہیں بھگتنا ہو گا۔ آپ نہیں جاتے تو مت جایئے۔ میں ایک بار کوشش کر کے دیکھتا ہوں، نہیں مانیں گے تو پھر میں دیکھوں گا کیا کرنا چاہیے۔"

"چھوڑیے بھی اجودھیا بابو، کہاں تکلیف کیجیے گا۔ پارٹی نے جو فیصلہ کر دیا، ہم لوگ اس پر عمل کریں اور بس۔"

"نہیں صاحب ——— میں تو بہت بے عزتی محسوس کر رہا ہوں۔ میں تو ایک بار جاؤں گا ضرور۔"

"جیسی آپ کی مرضی، لیکن مجھے تو معاف ہی رکھیے۔"

اجودھیا بابو اسی رات دلّی چلے گئے۔ دو روز کے بعد جانے کن لوگوں سے مل کے لوٹ آئے۔ اختر حسین کے بنگلہ پر آئے تو منہ لٹکا ہوا تھا۔ اختر حسین انہیں دیکھتے ہی سمجھ گئے کہ

ناکام لوٹے ہیں۔

"کہیے بھائی صاحب ــــــــ لوٹ آئے نا! میں تو پہلے ہی کہہ رہا تھا کہ پارٹی نے جو فیصلہ کر دیا ہے، اُسے چپ چاپ مان لیجیے۔"

"نہیں صاحب، یہ نہیں ہو سکتا۔ ہم کانگریسیوں کا ووٹ ایسے شخص کو نہیں جا سکتا جس کی زندگی کانگریس مخالفت میں گزری ہے۔"

"پھر کیا کریں گے آپ ــــــ؟"

"میں پارٹی چھوڑ دوں گا۔ ضلع کانگریس کے بہت سے لوگ پارٹی چھوڑ دیں گے۔ آپ اپنا فیصلہ بتائیے، ہم لوگ تو اپنا فیصلہ کر چکے ہیں۔"

اختر حسین ان کی بات سُن کے سن سے رہ گئے۔

"پارٹی چھوڑنے کے بعد کیا کریں گے آپ ـــ؟"

"سوشلسٹ پارٹی میں چلے جائیں گے۔ اچاریہ کرپلانی اور جے پرکاش نرائن کوئی دوسرے نہیں ہیں اپنے ہی لوگ ہیں۔"

"نہیں اجودھیا بابو ــــــــ میں آپ کو پارٹی چھوڑنے کا مشورہ کبھی نہیں دوں گا۔ یہ پارٹی کے ساتھ غداری ہوگی۔ صرف اسمبلی پارلیامنٹ میں گھسنے کا نام ہی سیاست نہیں ہے۔ سیاست، عوام کی خدمت کا ایک بہترین ذریعہ ہے، سو وہ تو ہم لوگ کرتے ہی رہیں گے۔"

"اختر صاحب ــــــــ سیاست اب دس پندرہ سال قبل والی چیز نہیں رہی ہے۔ اب سیوا سرکار کے ذریعہ ہوتی ہے اور سرکار میں گھسنا، اس میں رہنا ہی سیاست ہے۔"

"پھر بھی، میں آپ کے ہاتھ جوڑتا ہوں کہ میرے نام پر پارٹی مت چھوڑیے۔ یہ میں اس لیے کہہ رہا ہوں کہ میں کسی قیمت پر آپ لوگوں کا ساتھ نہیں دے سکوں گا اور ہر حال میں پارٹی کا ایک سپاہی بنا رہوں گا۔"

"خیر آپ مت ساتھ دیجیے۔ میں تو ضلع کانگریس کی میٹنگ بُلا کے اس میں یہ باتیں رکھوں گا، آپ منسٹری سے بھی استعفےٰ نہیں دیں گے؟"

ابھی منسٹری سے استعفیٰ دینے کا مطلب ہے امیدواری نہ ملنے پر احتجاج۔

اور وہ میں نہیں کرنے جا رہا ہوں ۔ اب تو چند ہفتوں کی بات ہے ۔"

ضلع کانگریس کی میٹنگ میں اختر حسین اپنی بہت سی مصروفیات کو بالائے طاق رکھ کر شرکت کرنے گئے ۔ وہاں اس قدر غم و غصہ تھا کہ بہت سے لوگ پارٹی چھوڑنے پر آمادہ تھے ۔ اختر حسین نے انہیں بہت سمجھایا اور پارٹی میں رہنے کی اپیل کی ۔ ان کی لمبی تقریر سے آنچ کی لو دھیمی ہوئی لیکن اجودھیا بابو نے صدارت سے اور دوسرے عہدہ داروں نے اپنے اپنے عہدوں سے استعفیٰ دے ہی دیا کہ آخر کسی طرح احتجاج تو ہونا ہی چاہیے ۔ آخر لیڈروں کو کیسے پتہ چلے گا کہ انہوں نے ضلع کانگریس اور اس کے کارکنوں کے جذبات کو کس طرح ٹھیس پہنچائی ہے ۔ اختر حسین اس مسئلے پر انہیں قائل نہیں کر سکے ۔ الیکشن کے وقت محمد یونس ایک جلوس کے ساتھ ان کے پاس آئے اور ان کی حمایت چاہی ۔

اختر حسین نے انہیں جواب دیا ۔

"آپ کو میری حمایت کی فکر ہی نہیں کرنی چاہیے ۔ میں کانگریس کا ایک ادنیٰ سپاہی ہوں اور ہمیشہ رہوں گا ۔"

انہوں نے محمد یونس کو وہ پروگرام بھی دکھایا جس کے تحت وہ سارے علاقے کے انتخابی مہم پر نکلنے والے تھے ۔ انہوں نے کانگریس امیدوار کی کامیابی کے لیے ایڑی چوٹی کا زور لگایا ۔ انہوں نے اجودھیا بابو کو اور پارٹی کے ان کارکنوں کو جو پارٹی کے فیصلے سے ناخوش تھے، انتخابی مہم پر لگانے کی بہت کوشش کی ۔ دو ایک تو بادل ناخواستہ تیار بھی ہوئے لیکن اجودھیا بابو نے ان سے معافی مانگ لی ۔

"سنیے صاحب ! میں کوئی سادھو سنت اور رشی منی نہیں ہوں ۔ سیاست کرتا ہوں اور اچھے برے کی تمیز جانتا ہوں ۔ مجھے تو آپ معاف ہی رکھیے ۔ میں آپ سے اتنا ضرور وعدہ کرتا ہوں کہ میرا ووٹ کانگریس ہی کو جائے گا اور وہ بھی اس لیے کہ میں کانگریس کا پرانا خادم ہوں ۔"

مخالف پارٹی نے ایک بہت ہی مضبوط مسلمان امیدوار کو کھڑا کیا تھا ۔ وہ کانگریس کے اندر پھیلی ہوئی بددلی اور بے چینی سے پورا فائدہ اٹھا رہے تھے ۔ محمد یونس بے تحاشہ روپیہ خرچ کر رہے تھے ۔ بہت سے نامعلوم افراد ان کے کام میں جٹے ہوئے تھے ۔ گاڑیوں

کی پوری فوج تھی۔ تب اور اب میں کتنا فرق ہو گیا تھا۔ الیکشن کے معیار میں نمایاں تبدیلی آگئی تھی۔

الیکشن ہوا اور محمد یونس ہار گئے۔ انہیں دس ہزار ووٹوں سے شکست ہوئی۔ بہار شریف سے کانگریس کا ہار جانا بڑا گمبھیر معاملہ تھا۔ بہار شریف، کانگریس کا ایک بڑا گڑھ سمجھا جاتا تھا۔ محمد یونس نے اخلاقی بنیاد پر وزارت سے استعفیٰ دے دیا لیکن ان کا استعفیٰ منظور نہیں کیا گیا۔ یوں بھی وزارت اپنی میعاد پوری کر رہی تھی۔

نئی وزارت بنی تو محمد یونس کو راجیہ ٹرانسپورٹ کارپوریشن کا چیرمین بنا دیا گیا جو وزیر ہی کے برابر کا عہدہ تھا۔ بنگلہ، کار وغیرہ برقرار تھے۔ چیف منسٹر نے تو انہیں وزارت میں جاری رکھنا چاہا تھا کیونکہ بہرحال وہ کونسل کے ممبر تھے اور ان کی ممبری کی میعاد باقی تھی لیکن ہائی کمانڈ سے اس کی اجازت نہیں ملی۔ وزارت کی تشکیل کے سلسلے میں اب ہائی کمانڈ ہی آخری فیصلہ کرنے لگا تھا۔

۲۴

اختر حسین نے وزارت سے ہٹتے ہی سرکاری بنگلہ فوراً خالی کر دیا۔ اگرچہ ان سے چیف منسٹر نے ذاتی طور پر کہا تھا کہ وہ چاہیں تو ابھی وہاں رہ سکتے ہیں۔ لیکن ان کے ضمیر نے گوارہ نہ کیا۔ وہ کرایہ کے ایک فلیٹ میں اٹھ آئے۔ وہ پٹنہ میں اس لیے رہنا چاہتے تھے کہ فیاض کا یہاں ایک ماہر نفسیات کے ذریعہ علاج ہو رہا تھا۔ انہوں نے ساجد اور خالدہ کا نام پٹنہ کے کالجوں میں لکھایا تھا اور ابھی ان کی تعلیم میں مداخلت مناسب نہیں تھی۔ انہوں نے سوچ رکھا تھا کہ کچھ روز آرام کے بعد وہ ہائی کورٹ میں وکالت شروع کر دیں گے۔ وہ اپنی موجودہ زندگی سے لگ بھگ آسودہ تھے۔ ان کی مصروفیات کا دور ختم ہو گیا تھا۔ اگر وہ کچھ دوڑ دھوپ کرتے تو کوئی عہدہ انہیں ایسا مل سکتا تھا جو ان کی وزارت کے نقصان کی تلافی کر دیتا۔

کی پوری فوج تھی۔ تب اور اب میں کتنا فرق ہو گیا تھا۔ الیکشن کے معیار میں نمایاں تبدیلی آ گئی تھی۔

الیکشن ہوا اور محمد یونس ہار گئے۔ انہیں دس ہزار ووٹوں سے شکست ہوئی۔ بہار شریف سے کانگریس کا ہار جانا بڑا گمبھیر معاملہ تھا۔ بہار شریف، کانگریس کا ایک بڑا گڑھ سمجھا جاتا تھا۔ محمد یونس نے اخلاقی بنیاد پر وزارت سے استعفیٰ دے دیا لیکن ان کا استعفیٰ منظور نہیں کیا گیا۔ یوں بھی وزارت اپنی میعاد پوری کر رہی تھی۔

نئی وزارت بنی تو محمد یونس کو راجیہ ٹرانسپورٹ کارپوریشن کا چیرمین بنا دیا گیا جو وزیر کے برابر کا عہدہ تھا۔ بنگلہ، کار وغیرہ برقرار تھے۔ چیف منسٹر نے تو انہیں وزارت میں جاری رکھنا چاہا تھا کیونکہ بہرحال وہ کونسل کے ممبر تھے اور ان کی ممبری کی میعاد باقی تھی لیکن ہائی کمانڈ سے اس کی اجازت نہیں ملی۔ وزارت کی تشکیل کے سلسلے میں اب ہائی کمانڈ ہی آخری فیصلہ کرنے لگا تھا۔

۲۴

اختر حسین نے وزارت سے ہٹتے ہی سرکاری بنگلہ فوراً خالی کر دیا۔ اگرچہ ان سے چیف منسٹر نے ذاتی طور پر کہا تھا کہ وہ چاہیں تو ابھی وہاں رہ سکتے ہیں۔ لیکن ان کے ضمیر نے گوارہ نہ کیا۔ وہ کرایہ کے ایک فلیٹ میں اُٹھ آئے۔ وہ پٹنہ میں اس لیے رہنا چاہتے تھے کہ فیاض کا یہاں ایک ماہر نفسیات کے ذریعہ علاج ہو رہا تھا۔ انہوں نے ساجد اور خالدہ کا نام پٹنہ کے کالجوں میں لکھایا تھا اور ابھی ان کی تعلیم میں مداخلت مناسب نہیں تھی۔ انہوں نے سوچ رکھا تھا کہ کچھ روز آرام کے بعد وہ ہائی کورٹ میں وکالت شروع کر دیں گے۔ وہ اپنی موجودہ زندگی سے لگ بھگ آسودہ تھے۔ ان کی مصروفیات کا دور ختم ہو گیا تھا۔ اگر وہ کچھ دوڑ دھوپ کرتے تو کوئی عہدہ انہیں ایسا مل سکتا تھا جو ان کی وزارت کے نقصان کی تلافی کر دیتا۔

لیکن اس قسم کے کام انہوں نے دوسروں کے لیے چھوڑ رکھے تھے۔

تقریباً ایک سال بیت جانے کے بعد اچانک حامد کو چامو کا خط ملا کہ وہ فوراً کلکتہ چلا آئے۔ پاس میں جو روپے اور سامان ہوں، وہ سب لیتا آئے۔ حامد تو اب چامو کی طرف سے مایوس ہو چکا تھا لیکن عقل مندی اس نے یہ کی تھی کہ اپنے جمع پیسے خرچ نہیں کیے تھے۔ اب اس کے پاس لگ بھگ دو ہزار روپے تھے۔ وہ اس فکر میں تھا کہ ان پیسوں کا کوئی بزنس کر لے، کوئی چھوٹی موٹی دوکان، یا کوئی ایجنسی یا کوئی چلتا پھرتا کاروبار۔ چامو کا خط ملا تو مارے خوشی کے اس کے ہاتھ پاؤں پھول گئے۔ اس نے اپنے سارے پروگرام فوراً ختم کر دیے اور بس ایک ہی پروگرام ایسا بنایا جس پر اسے عمل کرنا ہی تھا ——— اگرچہ بی بی صاحبہ کے لیے سوچ سوچ کر اس کا کلیجہ بیٹھا جاتا تھا لیکن وہ بار بار دل کو سمجھا لیتا کہ کچھ حاصل کرنے کے لیے قربانی بہت ضروری ہے۔ اس کی تو نوکری کی عمر بھی اب ختم ہونے والی ہے، یہاں تو اس کی زندگی سنورنے سے رہی۔ اگر وہ بی بی صاحبہ یا اختر حسین سے اجازت لینے کی سوچتا تو اسے اجازت کبھی نہ ملتی اور پھر یہ ہوتا کہ وہ ان کی بات نہ ماننے پر مجبور ہوتا۔ بہت سوچ سمجھ کے اس نے بی بی صاحبہ کے نام ایک خط لکھا۔

"نانی اماں محترمہ!

آپ سے بے حد معافی مانگتے ہوئے یہ عرض ہے کہ میں پاکستان جا رہا ہوں۔ آپ کی اور ابا کی اجازت کے بغیر۔ میں اس کیلیے اپنے آپ کو مجبور پاتا ہوں۔ یہاں میرے لیے کوئی راستہ باقی نہیں رہ گیا ہے۔ آپ اگر جذبات کو الگ کر کے جس میں یقینی طور پر آپ کی محبت غالب ہے، غور کریں تو آپ میرے فیصلے کی تائید کریں گی۔ بہر کیف، میں وہاں پہنچ کر آپ کو اطلاع دوں گا۔ ابا سے کہئے گا کہ اگر ہو سکے تو مجھے معاف کر دیں۔ وہ میرے لیے کچھ نہیں کر سکے۔ اگر معاف ہی کر دیں تو ان کا مجھ پر احسان ہو ———" خط کو اس نے ڈاک کے سپرد کیا اور اسی رات کلکتہ روانہ ہو گیا۔

کلکتہ میں چامو کے ہاں پہنچنے میں اسے کوئی تکلیف نہیں ہوئی۔ چامو کے ٹھاٹ باٹ دیکھ کے تو اس کی آنکھیں ہی کھل گئیں۔ چامو چار کمروں کے ایک شاندار فلیٹ میں رہتا تھا۔ دراصل ایک بنگالی خاندان، تقسیم کے وقت ڈھاکہ چلا گیا تھا، ان کی بہت بڑی جائداد

کلکتہ میں کسٹوڈین کے قبضہ میں چلی گئی۔ معلوم ہوا تو وہ لوگ وہاں سے گردنیا پاسپورٹ کے سہارے لوٹ آئے اور سرکار سے مقدمہ بازی شروع ہوئی۔ چامو، معاوضے پر ایسے مقدموں کی پیروی کرتا تھا۔ جن مقدموں پر پیشی پر حاضری کے لیے لوگوں کے پاس وقت نہیں ہوتا، وہ ان کی نمائندگی کرتا۔ چامو نے ان لوگوں کے مقدمے کی پیروی شروع کی اور اس کا معاوضہ بھی نہیں لیا۔ بڑا زبردست مقدمہ چلا۔ ہائی کورٹ میں سرکار ہار گئی۔ چامو کے وہ لوگ بڑے احسانمند ہوئے۔ اپنی لڑکی جو خاصی تعلیم یافتہ تھی، اس کی شادی جامو سے کر دی۔ جائداد تو کچھ فروخت ہو گئی اور کچھ لڑکی کے نام لکھ دی جس میں یہ فلیٹ بھی شامل تھا۔ وہ لوگ واپس چلے گئے۔ چامو کے ٹھاٹ باٹ ہو گئے۔ تھا بالکل جاہل، لیکن صحبت میں انگریزی اور بنگلہ بولنا خوب سیکھ گیا تھا اردو دانوں کی محفلوں میں اردو تو یوں بولتا کہ لوگوں کو یقین ہو جاتا کہ اس کا تعلق ضرور لکھنؤ سے ہے۔

حامد کی اس نے بڑی خاطر کی، اس کو ایک الگ کمرہ دیا، ملنے جلنے والوں سے بتایا کہ اس کا سگا بھانجا ہے اور پاکستان جا رہا ہے۔ اپنی بیوی کو بھی اس نے یہی بات بتائی تھی ——— وہ تو پتہ نہیں دن بھر کس چکر میں غائب رہتا لیکن اس کی بیوی نے حامد کو کلکتہ کی خوب سیر کرائی۔ وکٹوریہ میموریل، چڑیا گھر، ہگلی ندی وغیرہ وغیرہ۔ رات میں چامو بیوی کو اور حامد کو لے کے ہوٹلوں کی سیر کو نکلتا۔ رائل کا چاپ، امجدیہ کی کھیر اور امینیہ کی فیرنی کھلاتا۔ اس کے بال بچّے انگریزی اسکولوں میں پڑھتے اور فٹافٹ یوں انگریزی بولتے جیسے انگریز کے بچّے۔

کئی ہفتوں کے بعد چامو ایک شخص کو لے کر آیا۔ لنگی کرتا پہنے، سر پر گول ٹوپی اور چہرے پر بڑی بڑی مونچھیں۔ اس نے حامد سے ملایا۔

"دیکھ مجو۔ یہ اپنا سگا بھانجہ ہے، اس کو بہ حفاظت پار کرنا ہے۔"

"استاد، تمہارا بھانجہ ہے تو اپنا بھی سگا ہے۔ تم فکر نہ کرو۔ چل بیٹے، تیّار ہو جا، صبح سویرے روانہ ہو جانا ہے۔"

چامو اور مجو تو کمرہ میں بند ہو کے جانے کون سا حساب کرتے رہے۔ حامد کا دل خوشی کے مارے بلیتوں اُچھلتا رہا۔ اس کی زندگی کے سنورنے کے دن آ رہے تھے۔ سامان تو اس کا تیار تھا ہی، از سرِ نو پیک کرنا تھا۔ چار بجے کے بعد ہی ایک ٹرک چامو کے فلیٹ کے نیچے آ کے رکا۔ ہارن کی آواز سنتے ہی چامو کمرہ سے نکل آیا۔ ڈرائیور سے اس نے پوچھا۔

"سب تیار ہیں؟"

"جی ہاں۔"

"مجو کدھر ہے؟"

"سب کے ساتھ ہیں۔"

حامد کو رات بھر نیند ہی نہیں آئی تھی۔ وہ تیار ہی تھا۔ اس کا سامان ٹرک پر رکھا گیا چامو نے اسے ایک طرف بلایا۔

"لو بیٹے یہ خط۔ تمہاری ممانی کے بڑے بھائی وہاں پر بہت بڑے آدمی ہیں۔ وہ تمہیں نوکری دلادیں گے اور یہ پانچ سو روپے بھی رکھ لو، کام آئیں گے۔ میں نے مجو کو سب باتیں سمجھادی ہیں، وہ تمہیں بہت آرام سے پہنچادے گا۔"

چامو کی بیوی بھی جاگ گئی تھی۔ دونوں نے حامد کو گرم جوشی سے رخصت کیا۔

ٹرک جانے کن سڑکوں اور گلیوں میں مڑتی رہی۔ بہت دیر کے بعد جہاں رکی، وہاں شہر سے باہر جھونپڑوں کا اک سلسلہ تھا۔ دن چڑھ آیا تھا۔ ٹرک جہاں رکی تھی، وہاں ایک تاریک جھونپڑے میں سے بہت سے مرد، عورت اور بچے نکل کر ٹرک پر سوار ہو گئے۔ ٹرک میں تل دھرنے کی جگہ نہ رہی۔ حامد کے بیٹھنے کی جگہ بھی باقی نہ بچی تھی۔ وہ کھڑا ہو گیا۔ جب سب لوگ آگئے تو اندر سے مجو نکلا۔ اس نے حامد کو ٹرک کی اگلی سیٹ پر بلالیا اور خود بھی بیٹھ گیا۔ ٹرک چل پڑی۔ چلتی ہی رہی۔ راستہ میں چیک پوسٹ ملا۔ بانس کی ایک بلّی سڑک پر ٹریفک روکنے کے لیے لگادی گئی تھی۔ ٹرک رک گئی۔ چیک پوسٹ کے افسر کرسیوں پر بیٹھے رہے۔ تین چار سپاہی قریب آئے۔ مجوّ نے چلّا کے کہا۔

"بارات پارٹی ہے ـــــــ بارات۔"

ایک سپاہی کے ہاتھوں میں اس نے کچھ دیا۔ سپاہی سر ہلاتے ہوئے لوٹ گئے، بانس کی بلّی اٹھادی گئی ایسے ایسے تین چیک پوسٹ اور ملے۔ ٹرک خیریت کے ساتھ آگے بڑھتی رہی یہاں تک کہ رات ہو گئی۔ ٹرک ایک سنسان مقام پر رکی۔ وہاں پر صرف ایک پھونس کی جھونپڑی تھی۔ وہاں سبھی کو بھات اور مچھلی کھانے کو ملی۔ پھر مجو نے ایک ایک کر کے سب سے روپے وصول کیے۔ حامد سے اس نے کچھ نہیں مانگا۔ وصول کرنے کی کارروائی مکمل ہو گئی تو اس نے

سب کو مخاطب کرتے ہوئے کہا۔

"یہاں سے تم سب کو پیدل ہی جانا ہوگا۔ میرا آدمی تمہیں لے جائے گا۔ بھور ہونے سے پہلے تم سرحد پار کر جاؤ گے۔ اپنا اپنا سامان اٹھاؤ اور سفر شروع کر دو۔"

سب نے اپنی اپنی پیٹھ اور سر پر اپنے سامان لادے اور چل پڑے۔ چار آدمی ان کی رہنمائی کر رہے تھے۔ ان کے ہاتھوں میں بڑے بڑے ٹارچ تھے۔ وہ لوگ اشاروں پر چلتے رہے۔ انہیں سختی سے منع کر دیا گیا تھا کہ راستہ میں بات نہ کریں اور چپ چاپ چلتے رہیں۔ وہ لوگ اسی وقت رکتے جب وہ چاروں تھک کے کہیں، بیٹھ جاتے اور بیڑیاں پھونکنے لگتے۔ اس وقت مسافروں کو بھی بڑی راحت ملتی۔ راستہ میں حامد نے کئی بار کرخت آوازیں سُنیں۔

"کون ——— ؟"

اس کے ساتھ ہی تیز روشنیوں والے ٹارچ جل اٹھے۔ وہ چاروں، سب کو وہیں رُکنے کا اشارہ کر کے دوڑ کے ان کے پاس جاتے، جانے کیا کیا باتیں کرتے اور پھر لوٹ کے آجاتے سفر پھر شروع ہو جاتا۔

⁂

صبح ہونے سے ذرا پہلے وہ لوگ ایک پتلی ندی کے کنارے پہنچ گئے۔ وہاں ایک بار پھر وصولی کا سلسلہ شروع ہوا۔ ان چاروں نے مسافروں کے سامان ہی سے بہت سی چیزیں رکھ لیں۔ زیور، کپڑے اور روپے۔ حامد سے بھی پوچھا گیا۔

"تمہارے پاس کیا ہے ؟"

"پانچ سو روپے۔"

بے ساختہ اس کے منہ سے نکل گیا۔ پانچ سو روپے اس نے جیب میں رکھے تھے، بقیہ کمر میں بندھے تھے۔

"نکالو۔"

حامد جب روپئے دینے لگا تو اس کی انگلی کی انگوٹھی چمک اٹھی۔

"انگوٹھی اتارو۔"

انگوٹھی اسے بہت عزیز تھی۔ اس کی ماں کی نشانی، جنہیں جانے اب وہ کب دیکھ سکے گا۔ اس نے انگوٹھی اتارنے میں پس و پیش کی تو ان میں ایک سختی سے بولا۔

"جلدی اتارو انگوٹھی ———— استاد کا آدمی ہے اس لیے چھوڑے دے رہا ہوں ورنہ ————"

اس نے چپ چاپ انگوٹھی اتار کے ان کے حوالے کر دی۔ تب ان میں سے ایک بولا۔

"ندی پار کر جاؤ اور ایک کوس چلو۔ آگے بس اڈا تمہیں ملے گا، پھر جہاں چاہو جاؤ۔"

ندی میں کمر بھر پانی تھا۔ وہ سب نے پار کر لیا۔ تقریباً ایک کوس چلنے کے بعد وہ ایک بس اڈا کے پاس پہنچے تو صبح ہو چکی تھی۔ بس اڈے کی بلڈنگ پر ایک جھنڈا لہرا رہا تھا سبز رنگ کا جس پر چاند اور ستارے بنے ہوئے تھے۔ حامد نے فوراً جھنڈا پہچان لیا۔

"تو ہم لوگ پاکستان پہنچ گئے۔"

حامد نے ایک ٹھنڈی سانس بھری۔ بسیں آرہی تھیں۔ اس کے ساتھی، بسوں کے آگے پیچھے دوڑنے لگے۔ اس نے ایک دھوئی ہوئی لنگی نکالی اور بلڈنگ کے وار نڈے پر بچھا کے دو رکعت نماز شکرانہ ادا کی۔ ڈھاکہ کی بس کھڑی ہوئی تھی۔ وہ جلدی سے جا کے اس میں بیٹھ گیا۔ ڈھاکہ ہی اس کی منزل تھی۔

ڈھاکہ بڑا شہر تھا لیکن وہ اس سے بھی بڑے شہر کلکتہ سے آرہا تھا۔ رکشہ پر بیٹھ کے اس نے چاموں کے دیے ہوئے خط کو کھولا۔ لکھا تھا۔

'بدرالاسلام بھائی!

میں اپنی سگی بہن کے لڑکے کو بھیج رہا ہوں۔ لڑکا ہونہار ہے، بی۔اے پاس ہے، وہاں نوکری کی تلاش میں جا رہا ہے۔ آپ اس کے لیے کوشش کر دیجیے تو اس کو نوکری ضرور مل جائے گی ...."

تو وہ چاموں کا سگا بھانجہ بن کے پاکستان آیا ہے۔

چلو کوئی بات نہیں۔ جب ملک بدل گیا، قومیت بدل گئی تو سید زادے سے ملا زادہ بننے میں کیا قباحت۔

اس کے بتائے ہوئے پتہ پر، رکشہ ایک بڑے بنگلے کے دروازے پر رکا۔ اس وقت سورج غروب ہو رہا تھا۔ وہ رکشہ کو رخصت کر کے اندر داخل ہوا۔ باہر ہرے بھرے لان سے نوکر گارڈن چیئرس اٹھائے اندر لے جا رہے تھے۔ اس نے قریب پہنچ کر ایک نوکر کو مخاطب کیا۔

"میاں ——— مجھے اسلام صاحب سے ملنا ہے۔"

نوکر اس کی زبان سمجھ نہیں سکا اور اس کا منہ تا کنے لگا۔ اس نے فوراً کہا۔

"بدر الاسلام صاحب۔"

نوکر سر ہلانے لگا اور اندر چلا گیا۔ اندر سے کرتا پاجامہ میں ملبوس ایک ادھیڑ، باوقار شخص نکلا اور سلام وکلام کے بعد اسے ڈرائنگ روم میں لے گیا۔ ڈرائنگ روم سادگی اور خوبصورت کا نمونہ تھا۔ خوبصورت اور نازک صوفے، کتابوں کے خوبصورت شیلف، موسیقی کے آلات رابندر ناتھ ٹیگور اور نذر الاسلام کے گیتوں کے نغمے ...... حامد کو یہ سادگی پسند آئی۔

خط پڑھ کر بدر الاسلام نے کہا۔

"ہوں۔ تو تم ثمین اللہ کے بھانجے ہو ——— ؟"

یہ تو حامد کو ابھی ابھی معلوم ہوا تھا کہ چامو کا نام ثمین اللہ بھی ہے، جب اس نے چامو کا خط پڑھ لیا تھا۔

"جی ہاں ———"

حامد نے سعادت مندی سے جواب دیا۔

"میاں، آپ بہت دیر میں آئے۔ نوکریاں تو بہت ہوا کرتی تھیں لیکن نوکریوں سے زیادہ لوگ یہاں آگئے۔ یہاں تو اب مقامی لوگوں کو بھی نوکری نہیں ملتی ——— خیر، آپ آرام کیجیے، میں کوشش کروں گا۔"

حامد کے لیے ایک کمرہ مخصوص کر دیا گیا۔ تین دن اور تین رات اس نے وہاں گزارے۔ یہ وقت زیادہ تر سوتے ہوئے گذرا۔ کھانے ناشتے کے وقت اسے ڈرائنگ روم میں بلایا جاتا جہاں بدر الاسلام کے ساتھ ان کی بیوی اور ان کی بیٹی بھی ہوتیں۔ وہاں جو ماحول تھا،

اس سے اس کی اجنبیت آہستہ آہستہ دور ہوتی گئی۔ تیسرے دن شام کے وقت بدرالاسلام نے اس سے کہا۔

"آدم جی جوٹ ملز میں ایک جگہ خالی ہے۔ تنخواہ تین سو روپے اور رہنے کے لیے فلیٹ میں نے بات کرلی ہے۔ آپ کل جوائن کر لیجیے۔"

حامد کو ان کی یہ بات خوابوں کی دنیا سے آتی ہوئی معلوم ہوئی۔ وہ، وہ بات سن رہا تھا جو ہندوستان میں اس کے لیے شجر ممنوعہ بن چکی تھی۔ بدرالاسلام کی طرف اس نے تشکر بھری نظروں سے دیکھا۔

اس نے جوٹ ملز جوائن کرلیا۔ فلیٹ مل گیا تھا لیکن بدرالاسلام نے اسے مشورہ دیا کہ ابھی وہ نئے ملک، نئے شہر اور نئے ماحول کو اچھی طرح سمجھ لے، اس کے بعد ہی اپنا الگ گھر بسائے۔ وہ ان کے بنگلے میں ہی رہنے لگا۔ بدرالاسلام کے پاس امپورٹ، ایکسپورٹ کا ایک بہت بڑا پرمٹ تھا جس کے ذریعہ انہوں نے اپنا کاروبار بہت پھیلا رکھا تھا۔ ان کے دفتر میں سیکڑوں افراد کام کرتے تھے، لیکن ان کے ہاں پہلے ہی سے فاضل آدمی تھے، نئے کی گنجائش بالکل نہیں تھی۔ ان کی بیوی اور بیٹی کے علاوہ گھر میں کوئی نہیں تھا۔ ان کے گھر کا ماحول اگرچہ حامد کے لیے مانوس نہیں تھا لیکن پتہ نہیں کیوں اسے بہت اچھا لگتا۔ ان کی بیٹی نازیہ کو ایک ماسٹر ڈانس اور میوزک سکھانے آتا اور جب وہ ناچنے لگتی تو ایسا لگتا کہ اس کے جسم میں کوئی جادو ہے جو سر چڑھ کے بول رہا ہے۔ حامد نے ایک مہینہ میں صرف دو بار اس کا ناچ دیکھا تھا اور وہ بھی اتفاق سے اس کے کمرہ میں چلے جانے پر۔ وہ اس وقت تک مبہوت سا کھڑا رہ گیا جب تک کہ اس کا ناچ ختم نہیں ہوگیا۔ وہ جب گانے بیٹھتی تو جیسے ساری فضا پر سکوت طاری ہو جاتا اور سارا ماحول اس کی آواز پر کان لگائے بیٹھ جاتا۔ اکثر رات کے کھانے کے بعد ڈرائنگ روم میں بیٹھ کے بدرالاسلام اس کا گانا سنتے اور حامد کو بھی پکار لیتے۔ ناچ گانے کے ساتھ ساتھ گھر کے لوگ نماز روزے کے بھی پابند تھے۔ گھر میں سب بنگلہ بولتے، صرف بدرالاسلام حامد سے اردو میں گفتگو کرتے تھے۔ حامد کو گھر کے دوسرے افراد کی بات پلے نہیں پڑتی تھی۔ وہ بڑی کوششوں سے ان کی بات سمجھنے کی کوشش کرتا اور ٹوٹے پھوٹے الفاظ میں اپنی بات

بھی کہہ دیتا۔ نازیہ کالج میں پڑھتی تھی۔ بڑے باپ کی بیٹی ہونے کے باوجود اس میں غروریا بڑاپا نام کو نہیں تھا۔ اس میں بے جا شرم و حیا بھی نہیں تھی۔ حامد سے اس کی روزانہ ہی ایک دو باتیں ہو جاتیں، اس سے زیادہ کا کبھی موقع ہی نہیں آتا۔ چامو یعنی ثمین اللہ کا بھانجہ ہونے کے سبب وہ ان کے گھر کا ہی ایک فرد تھا۔

۲۵

حامد کو بدر الاسلام کے گھر رہتے ہوئے کافی عرصہ بیت گیا۔ اس درمیان نازیہ سے اس کی کوئی بے تکلفی نہ ہو سکی لیکن وہ اپنے دل میں اس کے بارے میں بہت کچھ محسوس کرنے لگا تھا۔ اس کے اندر چند ایسے جذبوں نے جنم لے لیا تھا جن کا کوئی نام نہیں تھا۔ اس نے اپنے نوکری سے کافی روپے جمع کر لیے تھے اور اب وہ اپنے فلیٹ میں منتقل ہو جانا چاہتا تھا۔ ڈھاکا شہر اب اس کے لیے اجنبی نہیں رہا تھا۔ ہزاروں افراد اس کے ملاقاتی بن چکے تھے۔ اس کی ملاقات بہت سے ایسے افراد سے بھی ہوئی تھی جن کے بارے میں اُس نے سنا تھا کہ وہ کمانے کے لیے کلکتہ یا بمبئی گئے ہیں۔ اس کے ایک رشتہ کے ماموں بھی یہاں مل گئے جو تقسیم کے وقت ہی یہاں آ گئے تھے۔ بیچارے ہندوستان میں بھوکے مرتے تھے یہاں تو ان کے وہ ٹھاٹ باٹ تھے کہ بس۔ ایک پریس کے مالک تھے، دو دو گاڑیاں تھیں۔ اپنا شاندار مکان تھا۔ وہ جوٹ مل میں کسی سے ملنے آئے تھے اور حلیمؔ سے باتیں کرتے ہوئے اس کی پہچان تک پہنچ گئے۔ انہیں جب معلوم ہوا کہ حامد بدر الاسلام صاحب کے یہاں پڑا ہوا ہے تو انہوں نے عجب سا منہ بنایا۔ بدر الاسلام، ڈھاکہ کی ایک معروف شخصیت کے مالک تھے اور بہاریوں، بنگالیوں کی اکثریت کے بیچ ان کی شہرت تھی۔ حامد کو وہ اپنے گھر لے گئے، اپنی بیوی بچوں سے ملایا۔ ایک لڑکا تھا ان کا جو پریس کا کام دیکھتا۔ دو لڑکیوں میں ایک کی شادی کر چکے تھے، لڑکا مغربی پاکستان میں تھا۔ دوسری

ڈھاکا ہی میں پڑھ رہی تھی۔ خوش حال تھے۔ دولت کی ریل پیل تھی۔

"بیٹا تم تو یہاں بہت دیر میں آئے۔ جو چیزیں یہاں تھیں، وہ تو قبل ہی بٹ گئیں اگر اسی وقت تم یہاں آجاتے تو اب لاکھوں میں کھیلتے۔"

انہوں نے حامد کو اپنے اعتماد میں لیتے ہوئے کہا۔

"ماموں ——— اب ہم لوگ یہاں جو بھی حاصل کریں گے، وہ اپنے بل بوتے پر"

حامد نے انہیں جواب دیا لیکن وہ اس کی بات کی تہہ تک نہیں پہنچ سکے۔

"میاں، یہاں کوئی اپنے بل بوتے پر کچھ حاصل نہیں کرتا۔ دماغ لگانا پڑتا ہے دماغ، جو اتفاق اور ہم لوگوں کی خوش قسمتی سے بنگالیوں کے پاس بالکل نہیں ہے۔"

حامد کو بدرالاسلام کے ساتھ رہتے ہوئے بنگالیوں سے کچھ ہمدردی پیدا ہو گئی تھی، اسے ان کی بات اچھی نہیں لگی۔

"واہ ماموں آپ بھی کیا بات کرتے ہیں۔ بنگالیوں کے پاس تو وہ دماغ ہے کہ ہم لوگ سو برس تک ان تک نہیں پہنچ سکتے۔ سنا نہیں آپ نے کہ بنگال جب آج جاگتا ہے تو سارا ہندوستان کل۔"

"میاں ابھی تمہیں تجربہ نہیں ہے۔ یہ بنگالی اس قدر سست اور کام چور ہیں کہ ہم لوگ اگر یہاں نہ آتے تو پتہ نہیں یہ کتنے پچھڑے رہ جاتے۔ تعلیم ان کے پاس نہیں۔ تہذیب ان کی ہندوانہ ہے دیہاتوں میں جاؤ تو کوئی پاکستان کا نام نہیں لیتا۔ سب بنگلہ بنگلہ کرتے ہیں۔"

"یہ تو کوئی ایسی بری بات نہیں۔ انہیں اپنی قومیت کا اس قدر احساس ہے۔ لیکن آپ یہ تو سوچیے ماموں کہ ان بنگالیوں نے بہاریوں کو کس طرح گلے لگایا ہے۔ انہیں پناہ ہی نہیں دی، سر آنکھوں پر بٹھایا ہے۔ آخر ہم انہیں کیوں نیچا سمجھیں۔"

"حامد بابو، تم یہاں دیر میں آئے ہو اس لیے کچھ نہیں جانتے۔ ان بنگالیوں کے دل میں اس قدر بنگالیت بھری ہوئی ہے کہ وہ پاکستان سے کوئی دلچسپی نہیں رکھتے۔ اردو اور بنگلہ کے نام پر یہاں اکثر جھگڑے ہوتے رہتے ہیں۔ خدا کروٹ کروٹ جنت نصیب کرے جناح صاحب کو کہ اردو کا ایک لفظ بھی نہیں جانتے تھے سوائے 'پاکستان' کے لیکن پاکستان کی زبان اردو بنا دی۔ ان کی موجودگی میں تو ان بنگالیوں کی ہمت نہ

ہوتی تھی۔ اُن کے بعد تو انہوں نے وہ سر اٹھایا کہ خدا کی پناہ۔"

"ماموں اگر وہ لوگ اپنی زبان کو قائم رکھنا چاہتے ہیں تو اس میں حرج بھی کیا ہے۔ اردو کوئی مسلمانوں کی مذہبی زبان تو ہے نہیں۔ آپ اردو بولیں، وہ بنگلہ بولیں، جھگڑا ختم۔"

"میاں ابھی تم نہیں سمجھ سکو گے۔ پاکستان اس لیے نہیں بنا ہے کہ اس میں بنگلہ، پنجابی اور سندھی زبانوں کا بول بالا ہو اور ہندوانہ تہذیب کو فروغ ملے۔ یہاں تو وہی زبان بولی جائے گی اور وہی تہذیب فروغ پائے گی جس کے لیے پاکستان بنا ہے۔ پاکستان بنگالیوں، پنجابیوں اور سندھیوں کے لیے نہیں بنا ہے۔ وہ ہم بہاریوں کے لیے بنا ہے جو ہندوؤں کے ظلم و ستم سہہ رہے ہیں۔ مقامی لوگوں کو پاکستان بننے سے کون سا فرق پڑ گیا سوائے اس کے کہ ان کی ترقی کی نئی راہیں کھل گئیں۔ ان کو مدد کے لیے ہم جیسے لوگ مل گئے۔"

حامد ان کی باتیں سن رہا تھا اور اسے حیرت ہو رہی تھی کہ ان کے خیالات کو وہ کون سا نام دے۔ اسے اپنے باپ اختر حسین یاد آ رہے تھے۔ کس قدر متوازن خیالات کے مالک تھے۔ ان کے اندر سب کو لے کے چلنے کا جذبہ تھا۔ انہیں محسوس ہو رہا تھا کہ اختر حسین کے خیالات ہندوستان ہی میں نہیں، یہاں بھی قبول کیے جا سکتے تھے۔ اس نے ان سے زیادہ بحث کرنا مناسب نہیں سمجھا۔ ان کے بال بچے تو ایسی باتیں کرنا بھی نہیں جانتے تھے وہ صرف پیسوں کی اور پیسوں سے تعلق رکھنے والی چیزوں کی باتیں کرتے۔ کار ہو، صوفہ ہو، خوبصورت مکانات ہوں، جاپان ہو، امریکہ ہو، جرمنی ہو، سودی عرب ہو ——

حامد ان چیزوں کے بارے میں زیادہ واقفیت نہیں رکھتا تھا، اس لیے وہ ان کے لیے سخت بور ثابت ہوا۔ ہر ویک اینڈ پر وہ سیر یا پکنک کا کوئی پروگرام بنا لیتے اور حامد کو اطلاع کرتے۔ لیکن حامد کے پاس ان چیزوں کے لیے کم ہی وقت تھا۔ بدرالاسلام کے ہاں نہ صرف ڈانس اور میوزک تھا بلکہ وہ نہایت صاف ستھرا ادبی ذوق بھی رکھتے۔ ان کے پاس بہترین ادبی کتابیں تھیں۔ ٹیگور اور نذرالاسلام کے پورے سیٹ انگریزی میں بھی موجود تھے جنہیں حامد نے پڑھنے کی کوشش کی تو اس کی سمجھ میں کچھ نہ آیا۔ لیکن بدرالاسلام نے ٹیگور اور نذرل کی شاعری کے بارے میں اسے ایک دن تفصیل سے بتا دیا کہ حامد کو

ان کی شاعری میں لطف آنے لگا۔ اس نے ان کے گیتوں کو کئی بار پڑھا اور ہر بار نیا لطف اٹھایا۔ ایک زمانہ تھا جب اسے اس قسم کی کتابیں خشک لگتیں اور ایسے موضوعات پھیکے لگتے۔ وہ بہت بیزاری اور بد دلی کے ساتھ صرف وہ سوالات رٹ لیتا جن کے امتحان میں آنے کی توقع ہوتی۔ امتحان کے وقت وہ سب کچھ بھول جاتا۔ اس کا ذہن اور حافظہ سلیٹ کی طرح شفاف ہو جاتا۔ بدرالاسلام سے اس کی مختلف موضوعات پر باتیں ہوتیں۔ باتیں کیا ہوتیں بس اسے سننے اور جاننے کا موقع ملتا اور ہر بار وہ کچھ پا لینے کے احساس کے ساتھ ہی ان کے پاس سے اٹھتا۔

ایک روز دبی زبان سے اس نے بدرالاسلام سے کہا کہ اب وہ اپنے فلیٹ میں شفٹ کرنا چاہتا ہے۔

"کیوں ______ یہاں آپ کو کوئی تکلیف ہے کیا ______؟"

"جی، یہاں تو گھر سے زیادہ آرام ہے، لیکن جب فلیٹ الاٹ ہو چکا ہے تو پھر اسے خالی رکھنے سے کیا فائدہ۔"

"بات تو آپ صحیح کہہ رہے ہیں لیکن فلیٹ سے زیادہ آرام ہے تو پھر عقل کا تقاضہ یہی ہے کہ جو چیز بہتر ہو اسے اختیار کیا جائے۔"

"آپ کی محبت سر آنکھوں پر، لیکن آخر میں کب تک تکلیف دوں ___؟"

"دیکھو میاں، تکلیف وہ ہوتی ہے جو ذہنی اور روحانی طور پر محسوس ہو۔ جسمانی تکلیف وقتی ہوتی ہے اور وقت کے ساتھ ہی ختم ہو جاتی ہے۔ آپ کی موجودگی سے ہمیں بہت فرحت نصیب ہوتی ہے، سو وہ آپ کیوں چھین لینا چاہتے ہیں۔"

حامد سے کوئی جواب بن ہی نہیں سکا۔ وہ یہ سوچ کے بیٹھا تھا کہ وہ بدرالاسلام سے اجازت لے کے ہی اٹھے گا، اس نے انہیں قائل کرنے کے بہت سے دلائل سوچ رکھے تھے، وہ سب کے سب دھرے رہ گئے۔

ایک روز اس کے رشتے کے ماموں حفیظ الدین اس سے ملنے بدرالاسلام کے ہاں آ گئے۔ اس وقت حامد موجود نہیں تھا۔ بدرالاسلام موجود تھے۔ ان کو پتہ چلا کہ حامد کے رشتہ دار ہیں تو وہ بڑے اخلاق سے پیش آئے۔ انہوں نے سمجھا کہ حامد کے رشتہ دار ہیں تو ثمین اللہ کے بھی رشتہ دار ہوں گے۔ انہوں نے حفیظ الدین سے ثمین اللہ یعنی چاموکی خیریت بھی پوچھی، لیکن حفیظ الدین کچھ سمجھ نہ سکے۔ کافی دیر بیٹھنے کے بعد وہ جانے لگے۔ ان کی گاڑی نکل ہی رہی تھی کہ حامد اندر داخل ہوا۔ حامد کو دیکھ کر دروازے پر انہوں نے گاڑی روک دی اور بولے۔

" واہ بیٹا، واہ، میں تو سمجھ رہا تھا کہ تم بدرالاسلام کے ہاں مہاجر بن کے رہ رہے ہو گے لیکن تم تو ان کے رشتہ دار نکلے۔"

حامد نے ان کے طنز کو نظر انداز کر دیا اور بولا۔

" ماموں، رشتے صرف خون کے ہوتے ہیں کیا ——— ؟"

" میاں خون، پانی سے زیادہ گاڑھا ہوتا ہے، سمجھے۔"

" لیکن اگر صرف خون ہی خون ہو اور خون کے سوا کچھ نہ ہو تو کیا وہاں پر رشتہ پیدا ہو گا۔"

" بھئی باتیں کرنا تو تم خوب سیکھ گئے ہو۔ اتنا یاد رکھنا بیٹے کہ یہ بنگالی بڑے بے مروّت ہوتے ہیں۔ یہ نہ کبھی ہم لوگوں کے ہوئے ہیں اور نہ ہوں گے۔ جناح صاحب نے سخت غلطی کی کہ ان لوگوں کو پاکستان میں لیا۔ وہ اگر پورا پنجاب لے لیتے تو کہیں فائدے میں رہتے۔ یہ کام چور بنگالی۔"

" ماموں اتنا تو خیال رہے کہ جسے آپ گالی دے رہے ہیں کم از کم اس کے دروازے سے تو ہٹ جائیے۔"

" بیٹا حامد ——— مجھے تم سے صرف یہ کہنا ہے کہ بنگالیوں پر کبھی بھروسہ نہ کرنا۔ یہ دراصل ہندو ہیں، تم کسی بنگالی کی چمڑی کھول کے دیکھو، اندر تمہیں ہندو خون ملے گا۔"

"ماموں ـــــ اب تک کوئی ایسا آلہ ایجاد نہیں ہوا جو خون کو مذہب اور ذات کے خانوں میں بانٹ سکے۔ اگر کبھی ایجاد ہو گیا تو میں ضرور آپ کے مشورہ کے مطابق عمل کر کے دیکھوں گا۔"

"خیر مانو یا نہ مانو، تمہیں اختیار ہے۔ میں تو ان لوگوں کو بہت دنوں سے دیکھ رہا ہوں اور انہیں خوب پہچانتا ہوں۔ یہ کھاتے پاکستان کا ہیں اور گاتے کسی اور کا۔"

"یہ کسی سے بھیک نہیں مانگتے، اپنا کھاتے ہیں اور جس کا کھاتے ہیں، اسی کا گن گاتے ہیں۔"

"بہر کیف، خدا تمہیں خوش رکھے۔ میں تو یہ کہنے کو آیا تھا کہ تمہاری بہن شہناز بی اے پاس کر گئی ہے، اس خوشی میں تمہاری ممانی نے تمہیں مٹھائی کھانے کو بلایا ہے۔"

"ارے مبارک ہو۔ آپ نے پہلے کیوں نہ بتا دیا، ہم لوگ تو خواہ مخواہ سیاست میں الجھ گئے۔ میں ضرور آؤں گا، لیکن کس روز ـــــ؟"

"جمعہ کو۔"

حفیظ الدین نے جواب دیا اور اتنی تیزی سے موٹر اسٹارٹ کر کے بڑھ گئے کہ اگر کوئی سامنے ہوتا تو ضرور ایکسیڈنٹ ہو جاتا۔

بدرالاسلام نے حامد کو گیٹ پر حفیظ الدین سے باتیں کرتے دیکھ لیا تھا لیکن سنا نہیں تھا۔ حامد اندر آیا تو انہوں نے کہا۔

"بیٹے تمہارے رشتہ دار آئے تھے تو پھر انہیں اندر لے آتے۔ گیٹ پر کھڑے کھڑے کیوں رخصت کر دیا؟"

"جی وہ کچھ جلدی میں تھے، بس ضروری باتیں کیں اور چل دیے۔"

"بیٹے، تم سے ایک ضروری بات کرنی ہے۔"

حامد کانپ گیا کہیں انہوں نے حفیظ الدین کی باتیں نہ سن لی ہوں۔

"جی فرمائیے۔"

"بھئی مہاجروں کا ایک قافلہ سرحد پار کر کے یہاں پہنچا ہے۔ یہ لوگ مظفر پور سے جان بچا کے بھاگے ہیں۔ وہاں فرقہ وارانہ فساد ہو گیا تھا اور کافی لوگ مارے گئے۔"

"جی ......"

"وہ لوگ میرے دفتر کے وارنڈے پر پناہ لیے ہوئے ہیں لیکن وہ کوئی معقول جگہ نہیں ہے۔ دفتر کھول کے انہیں جگہ نہیں دی جا سکتی، وہاں کاغذات پھیلے ہوئے ہیں۔ اگر بارش ہو گئی تو یہ بیچارے بری طرح پھنس جائیں گے۔ تم ایسا کرو کہ اپنے فلیٹ میں انہیں رہنے دو۔ جب یہ اپنا ٹھکانہ ڈھونڈ لیں گے تو وہاں سے چلے جائیں گے۔"

"آپ کو مجھ سے پوچھنے کی کیا ضرورت ہے۔ وہ جگہ آپ کی ہے۔ آپ جو چاہیں اس کا مصرف نکالیں۔ لیکن چونکہ وہ فلیٹ مل کا ہے اس لیے ——————"

"میں آدم جی کے جنرل منیجر سے کہہ دوں گا۔ مجھے صرف تمہاری مرضی درکار تھی۔"

"تو گویا اس کے مستقل قیام کا بندوبست اس بنگلے پر ہو رہا ہے۔"

حامد نے سوچا اسے یوں تو کوئی اعتراض نہیں تھا لیکن وہ خود کو بہت زیادہ کسی کے احسان کا بوجھ ڈھونے کا اہل نہیں سمجھتا تھا۔ مگر فی الحال اس کے سوا کوئی چارہ ہی نہیں تھا۔

وہ حفیظ الدین کے یہاں مٹھائی کھانے گیا تو وہاں پورے میز پر بہاری کھانے سجے ہوئے تھے۔ بچکا، آلو چاپ، پھلکیاں، بیسن کی روٹی، اچار، گھی، منگوچھی، فیرنی اور جانے کیا کیا۔ حفیظ الدین نے چند اور بہاریوں کو بھی بلا رکھا تھا جو ڈھاکہ میں اچھی جگہوں پر تھے کھانے کے بعد وہاں باتوں کا سلسلہ شروع ہوا۔ سب کے سب بنگالیوں کو گالیاں دے رہے تھے۔

"ارے ان بنگالیوں کا بس چلے تو قرآن شریف کو بھی بنگلہ میں پڑھنا شروع کر دیں۔"

"ان لوگوں کی نماز —————— ایک بہاری کے ہاں ایک بنگالی چور گھسا۔ کچن سے کھٹ پٹ کی آواز آئی تو صاحب خانہ کی نیند ٹوٹ گئی۔ بنگالی نے دیکھا کہ اب پکڑے جانے کے سوا کوئی چارہ نہیں ہے تو چٹ پٹ بچھا بچھا کے نماز کی نیت باندھ لی۔ صاحب خانہ کچن میں آئے تو وہ رکوع سجدے میں مصروف تھا

ارے بھئی کوئی اس سے یہ پوچھے کہ بھیا تمہیں نماز پڑھنے کے لیے دوسروں ہی کا

گھر سوجھتا ہے، اللہ کا گھر دکھائی نہیں دیتا۔"

سب ہنسنے لگے۔

"پاکستانی حکومت ان لوگوں کو مراعات دے کے بہت شوخ کر رہی ہے۔ دیکھ لینا، ایک دن یہ بنگالی سر چڑھ جائیں گے۔"

"انہیں مار مار کے اسلامی تہذیب سکھانی چاہیے تھی۔ بھلا بتائیے، ہم لوگ یہاں بنگلہ زبان و تہذیب سیکھنے پر مجبور ہیں کہ اس کے بغیر ہم لوگوں کا کام ہی نہیں چلتا اور یہ لوگ ہیں کہ اپنی سرکاری زبان ہی سے نفرت کرتے ہیں۔"

"یہ تو ناچنے گانے والی قوم ہے۔ ان کے ہاں تہذیب اسی کو کہتے ہیں۔"

"سب بنگالیوں کے دماغ میں امار سونار بنگلہ گھسا ہوا ہے۔"

"کسی بھی بنگالی افسر سے بات کرنے جائیے تو کیا مجال کہ وہ اردو میں بات کر لے۔ آپ سمجھیں یا نہ سمجھیں وہ بنگلہ ہی میں بات کرے گا۔ ان لوگوں کو اپنی زبان کا خبط سوار ہے۔"

حامد ان کی باتیں سن رہا تھا۔ اتنے دنوں میں وہ اتنا تو جان ہی گیا تھا کہ کون کیا کہتا ہے اور کیوں۔ اسے یہ دیکھ کے تعجب ہو رہا تھا کہ حفیظ الدین کے ہاں کام کاج کرنے والے نوکر چاکر سبھی بنگالی تھے اور سب اس کمرے میں آجا رہے تھے جہاں گفتگو ہو رہی تھی۔ اس نے ان کی گفتگو میں حصہ نہیں لیا۔ وہ جانتا تھا کہ جو کچھ وہ سمجھتا اور بولتا ہے، وہ ان لوگوں کے خیالات سے میل نہیں کھاتے۔ باتیں کرتے ہوئے کافی رات ہو گئی۔ سب لوگ رخصت ہو گئے تو حفیظ الدین کی بیوی نے حامد سے پوچھا۔

"حامد میاں، سنا ہے کہ تم بنگالیوں کے ساتھ رہتے سہتے ہو؟"

"جی ہاں، صحیح سنا ہے آپ نے۔ میں جس بنگالی کے ساتھ رہتا ہوں، وہ میرے اپنوں سے بڑھ کے ہے۔"

"میاں، بنگالی کبھی اپنا نہیں ہو سکتا،" وہ آپس [illegible] ضرور ہوتے ہیں۔ تم نہیں جانتے کہ ہم لوگوں کو یہاں کیا کیا تکلیفیں اٹھانی پڑیں۔ آخر ہم لوگ یہاں لٹ پٹ کے آئے تھے اور پاکستان سمجھ کے آئے تھے، لیکن یہاں پاکستان تو ہے ہی نہیں، ہر طرف بنگلہ ہی بنگلہ ہے۔"

حامد نے ان کی بات کا کوئی جواب نہیں دیا۔ حفیظ الدین بولے۔

"دیکھو مغربی پاکستان جو بھی بہاری گیا، وہ کتنا خوش ہے۔ انہیں تو سمجھو کہ وہاں جنت مل گئی ہے۔ نوکری تو نوکری، مکان، زمین، جائداد کیا نہیں ملا۔"

"لیکن ماموں ______ دونوں میں ایک بڑا فرق یہ بھی تو ہے کہ مغربی پاکستان سے ہزاروں افراد زمین جائداد چھوڑ کے بھاگے تھے۔ جو لاکھوں مہاجرین کے ہاتھ لگ گئی۔ یہاں سے تو کوئی نہیں گیا، پھر یہ توقع کیوں کی گئی کہ یہاں بھی مغربی پاکستان کی جائدادیں ہاتھ لگیں گی۔"

حامد نے انہیں سمجھانے کی کوشش کی۔

"میاں، اسلام میں ہجرت سنّت ہے۔ ہمارے رسول نے مکّہ سے مدینہ کی طرف ہجرت کی تو پتہ ہے کہ انصار نے صحابیوں کے ساتھ کیا سلوک کیا۔ انہوں نے اپنی جائدادوں میں سے آدھا حصّہ مہاجر بھائی کو دے دیا۔ ہر انصار کے گھر میں ایک مہاجر مہمان بن کر رہنے لگا۔ ان بنگالیوں کو ان باتوں کی کیا خبر۔ انہیں تو بس اپنا سونار بنگلہ چاہیے۔"

حامد کی سمجھ میں نہیں آرہا تھا کہ یہ لوگ کس قسم کی باتیں کر رہے ہیں۔ اس نے اتنے دنوں میں ہزاروں بہاریوں کو دیکھا تھا، وہ سب کے سب بنگالیوں کے سخت مخالف تھے۔ انہیں بنگالیوں سے شکایت تھی تو یہ کہ وہ لوگ جب اپنی جان بچا کے یہاں بھاگ آئے تھے تو انہیں یہاں بنا بنایا کچھ نہیں ملا تھا۔ انہیں یہاں محنت کرنی پڑی تھی اور تب انہیں کچھ حاصل ہوا تھا۔ وہ جب مغربی پاکستان کے مہاجروں کو دیکھتے تو احساس کمتری میں مبتلا ہو جاتے اور شاید یہی احساس کمتری ان کے اندر پک پک کے نفرت بن کر نکل رہی تھی۔ رات زیادہ ہو گئی تھی۔ حامد نے حفیظ الدین سے جانے کی اجازت مانگی۔

"اب اتنی رات ہو گئی ہے بیٹا، یہیں رہ جاؤ، آخر یہ بھی تمہارا گھر ہے۔"

"جی وہ تو ٹھیک ہے لیکن ______"

"لیکن کیا، تم اسلام صاحب کو فون کر دو۔"

حامد نے اسلام صاحب سے فون پر یہی بات کہی تو انہوں نے جواب دیا۔

"شوق سے رہو بیٹا، آخر وہ تمہارے رشتہ دار ہیں، ان کا بھی تم پر حق ہے۔"

حامد نے بدر الاسلام کی بات حفیظ الدین سے دہرائی تو وہ خاموش رہے۔

حامد کے لیے ڈرائنگ روم کے بغل والا کمرہ کھول دیا گیا۔ صاف ستھرا ہوادار اور سجا سجایا کمرہ تھا۔ حامد کو ایک لنگی اور کرتا مل گیا اور وہ کپڑے تبدیل کر کے بے خبر سو گیا۔

نیند ہی میں اسے محسوس ہوا کہ کمرے میں کوئی ہے۔ اس کی نیند اچاٹ ہو گئی۔ ہلکی سبز روشنی میں اس نے دیکھا کہ حفیظ الدین کی بیٹی شہناز اس کے سامنے کھڑی ہے، وہ اٹھ بیٹھا۔

"تم ــــــ اس وقت یہاں ــــــ؟"

"بھائی جان۔ میں آپ سے ایک ضروری بات کہنے آئی ہوں۔"

"مجھ سے ــــــ؟"

"جی ہاں ــــــ موقع نہیں مل رہا تھا۔ آج خدا نے یہ موقع دے دیا تو ہمت کر کے چلی آئی۔"

حامد اس کی ہمت پر ہراساں تھا۔ آخر گھر میں ماں باپ، نوکر چاکر موجود تھے، کسی کی نیند کسی وقت بھی ٹوٹ سکتی تھی۔ اس وقت کون یہ دیکھنے جاتا کہ شہناز اس کے کمرے میں کیوں آئی۔ وہ بہت گھبرا گیا۔

"مجھ سے کیا بات کہنی ہے، جلدی کہو ــــــ کہیں کوئی اٹھ نہ جائے۔"

"آپ اطمینان رکھیں۔ اس طرف کوئی نہیں آئے گا۔ ان لوگوں کے کمرے دور ہیں اور پھر جب وہ ایک بار سوتے ہیں تو پھر ایک ہی بار اٹھتے ہیں، بار بار نہیں اٹھتے۔"

"ارے تو جلدی بولو نا ــــــ"

"بھائی جان ــــــ ابّا آپ کی جو خاطر کر رہے ہیں، اس کا مطلب سمجھ رہے ہیں آپ؟"

"میں کیا جانوں ــــــ؟"

"آپ کو پھانس رہے ہیں ــــــ نوشے بھائی کو بھی انہوں نے ایسے ہی پھانسا تھا۔"

حامد، شہناز کی بے باکی اور صاف گوئی پر حیران رہ گیا۔ شہناز اپنے والدین کی ایک ایسی تصویر اس کے سامنے پیش کر رہی تھی جس کے بارے میں اس نے سوچا بھی نہیں تھا۔ شہناز کی بات کے جواب میں وہ کچھ بول ہی نہیں سکا۔ وہ پھر بولی۔

"لیکن بھائی جان! خدا گواہ ہے کہ میں نے آپ کو بھائی سے کم نہیں سمجھا۔ میں تو وہ باتیں سوچ بھی نہیں سکتی جو میرے والدین سوچ رہے ہیں۔"

حامد سوچنے لگا کہ اس کی بے سر و پا باتوں کا کیا جواب دے۔ مسئلے تو وہ خود پیدا کر رہی ہے اور اب اس سے کیا چاہتی ہے ______؟

"بھئی آخر تم چاہتی کیا ہو ______؟ تمہاری بات کی تو کوئی بنیاد ہی نہیں ہے۔ میں اس سلسلے میں کیا کہہ سکتا ہوں، کیا کر سکتا ہوں۔"

شہناز نے حامد کا ہاتھ پکڑ لیا۔

"بھائی جان ______ آپ میری مدد کر سکتے ہیں۔ میں آپ کے سوا کسی سے دل کی بات نہیں کہہ سکتی۔ میں خدا کے بعد آپ کے سامنے اپنا راز کھول رہی ہوں ______ بھائی جان، آپ میری مدد کریں گے نا ______؟"

"حامد کی سمجھ میں نہیں آ رہا تھا کہ اس کی باتوں کا کیا جواب دے۔ اسے تو شہناز کی دماغی صحت پر ہی شک ہو رہا تھا۔ اس کی الجھن بھری خاموشی سے شہناز کی ہمت بڑھی۔

"بھائی جان ______ میں ایک لڑکے سے محبت کرتی ہوں، چار برس سے ہم لوگوں کی محبت پروان چڑھ رہی ہے۔ پرابلم یہ ہے کہ وہ لڑکا بنگالی ہے اور آپ جانتے ہیں کہ ابا بنگالیوں سے کس قدر نفرت کرتے ہیں۔ لیکن میں اس کے بغیر زندہ نہیں رہ سکتی۔ میں اس کے لیے جان دے دوں گی۔"

حامد کو کہانی اب دلچسپ لگی۔ ماں باپ کو بنگالیوں سے اس قدر نفرت اور بیٹی ایک بنگالی کی محبت میں جان دینے کو تیار ______ اُس نے پوچھا۔

"وہ لڑکا کیا کرتا ہے ______؟ کیا وہ بھی تمہیں چاہتا ہے ___؟"

"وہ فوج میں سیکنڈ لفٹنٹ ہے۔ وہ میرے لیے کچھ بھی کرنے کو تیار ہے۔"

"پھر بتاؤ، میں کیا کروں ______؟"

"جب ایسا کوئی پرپوزل آپ کے سامنے آئے تو آپ صاف انکار کر دیجیے۔ کہہ دیجیے گا کہ شہناز میری سگی بہن کی طرح ہے۔ میں اس سے شادی کی بات سوچ بھی نہیں سکتا۔"

"ٹھیک ہے۔ اب تم جاؤ، میں ایسا ہی کروں گا۔"

"بھائی جان۔ اس کا اجر آپ کو خدا دے گا۔ میں تو آپ کے لیے کچھ نہیں کر سکتی۔"

شہناز نے وفورِ مسرت سے اس کے ہاتھوں کو چوم لیا اور دوڑتی ہوئی کمرے سے بھاگ گئی۔

حامد کو اس صورت حال پر بڑی ہنسی آئی۔ حفیظ الدین کے بارے میں وہ زیادہ نہیں جانتا تھا۔ انہیں بچپن میں بین ہاؤس آتے جاتے دیکھا تھا۔ بی بی صاحبہ انہیں اندرون حویلی بلا کے ملاقات کرتیں اور دنیا بھر کے لوگوں کی خیریت پوچھتیں۔ بچوں کو انہیں سلام کرنے کو کہا جاتا کہ تمہارے ماموں ہیں۔ اس نے انہیں پھر ڈھاکہ ہی میں دیکھا تھا۔ اسے کیا پتہ تھا کہ حفیظ الدین اس سے کیوں اپنائیت جتانے کو کوشاں ہیں۔ اب جبکہ شہناز سے اسے ساری حقیقت کا پتہ چل گیا تو ایک طرح سے اپنے آپ کو ہلکا پھلکا محسوس کر رہا تھا۔ اب حفیظ الدین کی ساری حرکتیں اور ان کی گفتگو اسے اداکاری لگ رہی تھی۔

۲۷

حامد کو گئے اب ایک برس ہو رہا تھا۔ اتفاق یوں ہوا کہ جس دن اس نے بہار شریف چھوڑا، اسی دن اختر حسین ایک ہفتہ کے لیے اپنے پورے خاندان کے ساتھ بہار شریف آئے۔ حامد کی دن بھر کی غیر موجودگی کو کسی نے محسوس نہیں کیا کہ اس کا اکثر یہ معمول تھا لیکن جب رات ہو گئی اور وہ نہیں آیا، تب سب کو تشویش ہوئی۔ دو چار جگہ آدمی دوڑائے گئے جہاں وہ ٹیوشن پڑھاتا تھا، پتہ چلا کہ ان جگہوں پر تو وہ گیا ہی نہیں۔ اختر حسین خاموش بیٹھے تھے۔ بی بی صاحبہ پر سکتہ ساطاری ہو گیا تھا۔ عورتیں سسک رہی تھیں اور بچے چپ چپ تھے۔ ان کی بیوی نے روتے ہوئے کہا۔

"خدا کے واسطے کچھ کیجیے۔ میں نے آپ سے کبھی کچھ نہیں کہا۔ آج کہتی ہوں کہ کہیں سے میرے بچے کو لا دیجیے۔ آپ تو یوں چپ چاپ بیٹھے ہیں جیسے آپ ہی نے اسے کہیں بھیجا ہو۔"

"تو میں کیا کر سکتا ہوں۔ جوان لڑکا ہے۔ کوئی اسے بہکا کے بھگا نہیں سکتا۔ جہاں بھی گیا ہے، اپنی مرضی سے گیا ہوگا۔ کم از کم اس کے کمرے اور کپڑوں وغیرہ کی تلاشی تو لیجیے۔"

کمرہ دیکھا گیا تو کپڑے غائب، بکس غائب، کتابیں ندارد۔ صاف معلوم ہو رہا تھا کہ وہ باقاعدہ تیاری کر کے کہیں گیا ہے۔ کوئی خط پرزہ وغیرہ نہیں ملا۔ اختر حسین نے سب کو سمجھاتے ہوئے کہا۔

"گھبرانے کی کوئی بات نہیں۔ یہ بات تو ظاہر ہو گئی کہ وہ جہاں بھی گیا ہے، اپنی مرضی سے گیا ہے۔ ایک دو دن میں یہ بات بھی صاف ہو جائے گی کہ کہاں گیا ہے۔"

ان کی بات سے کسی کی تشفی نہیں ہوئی۔ بی بی صاحبہ نے ایک آدمی کو بہن بھیجا۔ قریب و دور کے رشتہ داروں کے ہاں چھان مارا گیا۔ کئی خطوط ادھر ادھر لکھے گئے۔

دوسرے دن ڈاک سے حامد کا ڈالا ہوا خط ملا۔ اس کے پاکستان جانے کی خبر سن کے تشویش اور بڑھ گئی —— جانے کیسے گیا ہوگا، کس حال میں ہے، کہیں گرفتار نہ ہو گیا ہو —— اختر حسین کی خاموشی اور بڑھ گئی۔ انہیں اس بات کا دکھ تھا کہ ان کے بیٹے نے ایک ایسی ایک حرکت کی جس کی وہ ہمیشہ مذمت کرتے رہے ہیں۔ اگر وہ پکڑا گیا تو کتنی بدنامی ہوگی۔ وہ کہاں کہاں اپنی صفائی دیتے پھریں گے۔ ان کی بیوی نے ان سے التجا کی کہ کسی آدمی کو پاکستان کے راستے پر روانہ کریں تاکہ وہ حامد کا پتہ لا سکے۔ اختر حسین نے اپنی خاموشی توڑی۔

"ہزاروں افراد پاکستان گئے ہیں۔ کتنوں کو دیکھنے کے لیے آدمی بھیجے جائیں —— اور پھر ایسے لڑکے سے مجھے کوئی ہمدردی نہیں جس نے جان بوجھ کے قانون کو توڑا ہو، اس کو جانا ہی تھا تو باقاعدہ جاتا۔"

اختر حسین نے ایسے لہجے میں بات کہی کہ پھر آگے کچھ کہنے سننے کی گنجائش ہی نہ رہی۔

ان کی بیوی ان کے لہجوں کی خوب پہچان رکھتی تھیں۔

سب سے زیادہ پریشان بی بی صاحبہ تھیں۔ پہلے پاکستان ان کے سامنے وہی تھا جو اصغر حسین نے ان کے ذہن میں بٹھایا تھا۔ لیکن جب انہوں نے پاکستان کو خود جھیل لیا تو ان سے زیادہ پاکستان کو جاننے والا اور کوئی نہیں رہا۔ حامد کو انہوں نے بچپن سے پالا پوسا تھا، اس سے انہیں اپنے بچوں ہی کی طرح محبت تھی۔ اولاد کی اولاد زیادہ عزیز ہوتی ہے۔ پاکستان بار بار ان کا سکون چھیننے کے درپے تھا۔

اختر حسین کا چھوٹا بیٹا ساجد آئی۔ اے میں پوری یونی ورسٹی میں اوّل آیا تھا۔ اس کو کسی نے مشورہ دیا کہ اگر وہ دلّی کے سینٹ اسٹیفن کالج سے بی۔ اے کرے تو آئی اے ایس میں آسکتا ہے۔ اختر حسین اس کا نام پٹنہ کالج میں لکھانا چاہتے تھے اور وہ بضد تھا کہ دلّی جائے گا۔ دلی کا خرچہ برداشت کرنا اختر حسین کے بس کی بات نہیں تھی۔ وزارت سے ہٹنے کے بعد وہ بیکار ہو گئے تھے۔ ہائی کورٹ میں ان کی وکالت جم نہیں سکی۔ سیاست ان کا اوڑھنا بچھونا تھا لیکن سیاست میں اب روز نئے افراد نظر آرہے تھے، اس کی قدریں ٹوٹ رہی تھیں، نئی قدریں بن رہی تھیں۔ کانگریس میں ہر نقطۂ نظر کے رکھنے والے لوگ موجود تھے۔ البتہ ان میں ایک بات ضرور مشترک تھی، وہ سب گاندھی جی کا نام زور و شور سے لیتے اور پرانے لوگوں کو بڑی حقارت سے دیکھتے۔ البتہ جب کوئی مرکزی لیڈر آتا اور وہ بند کمرے میں تقریر کرنا چاہتا تو اس وقت ڈھونڈ ڈھونڈ کے پرانے لوگوں کو بلایا جاتا۔ اختر حسین کا شمار بھی پرانے لوگوں میں ہونے لگا تھا اور ان کی یاد بھی اب نئے لوگوں کو بہت بہت دیر میں آتی۔

ساجد کی ضد پوری نہیں ہوئی تو وہ اٹواٹی کھٹواٹی لے کے پڑ رہا۔ اختر حسین کی سمجھ میں نہیں آرہا تھا کہ وہ کیا کریں۔ ان کے پاس پیسے نہیں تھے۔ فیاض اب تک ماہر نفسیات کی نگرانی میں تھا۔ ان کی بیٹی خالدہ جوان ہو رہی تھی، اس کی شادی کی بھی فکر تھی۔ ایسے میں ساجد کو دلی بھیجنا ان کے لیے ممکن ہی نہ تھا۔ ساجد نے جب دیکھا کہ پٹنہ کالج میں نام نہ لکھانے پر بھی کچھ نہیں ہوا تو سال برباد جانے کا غم اسے کھانے لگا۔ اس نے کھانا پینا چھوڑ دیا۔ ہر وقت خاموش خاموش رہتا۔ اختر حسین کے سامنے فیاض کا حشر تھا اور وہ

ساجد کے بارے میں سوچ سوچ کے کانپ جاتے۔ وہ اس پر کوئی سختی نہیں کرنا چاہتے تھے۔ ہر طرح سے سمجھانے بجھانے کی کوشش میں ناکام رہنے کے بعد وہ اسے اسی حال میں چھوڑ کے پٹنہ چلے گئے۔ ادھر محض ضد میں ساجد نے بہار شریف کے نالندہ کالج میں نام لکھالیا۔ جب یہ خبر اختر حسین کو ملی تو وہ ایک مخمصے میں پڑ گئے۔ وہ صرف بچوں کی اور خاص طور پر ساجد کی پڑھائی کے سلسلے میں پٹنہ میں مقیم تھے۔ روزانہ کا ہائی کورٹ جانا بھی محض تضیع اوقات ثابت ہو رہا تھا۔ ان کا پٹنہ میں رہنا ہی بیکار ہو گیا۔ انہوں نے ایک بار پھر ساجد کو سمجھانے کی کوشش کی کہ وہ پٹنہ کالج میں نام لکھالے، اگرچہ اس کا وقت نکل گیا ہے لیکن وہ تعلیم کے منسٹر سے کہہ کے داخلہ کرادیں گے۔ لیکن ساجد تیار نہیں ہوا۔ اس کا کہنا تھا کہ جب وہ دلی میں نہیں پڑھ سکتا ہے تو پھر وہ کہیں بھی پڑھ سکتا ہے، اس کے لیے کوئی فرق نہیں پڑتا۔ مجبور ہو کر بوریا بستر پٹنہ سے اٹھایا اور بہار شریف چلے آئے۔

بین ہاؤس میں ایک بار پھر چہل پہل جاگ اٹھی۔ ان کے پرانے دوست اور رفیق روز شام کو ان کے ہاں جمع ہونے لگے۔ ان میں بہت سے لوگ عملی سیاست سے الگ ہو چکے تھے۔ کیونکہ وہ سیاست کے تیزی سے بدلتے اور بڑھتے قدم کا ساتھ نہیں دے سکے تھے۔ وہ سیاست کے نئے طریقے اور نئے انداز سیاست پر جی کھول کر تبصرہ کرتے اور اپنے اندر کے سارے غبار کو نکال کے جب ٹھنڈے پڑ جاتے تو اپنی اپنی راہ پکڑتے۔ اجودھیا بابو کی سیاست سے دلچسپی بس اسی حد تک برقرار تھی کہ جب کوئی پرانا آدمی آجاتا تو اس کی ملاقات کو آجاتے، ورنہ کسی میٹنگ میں وہ جوڑ لئے دیتے، اسے ایک کان سے سن سے دوسرے سے اڑا دیا جاتا۔ ملک کو سیاست کے علاوہ اور بہت سے ایسے مسائل درپیش تھے جن پر سوائے ان بوڑھے لوگوں کے اور کسی کی نگاہ نہیں جاتی تھی۔ وہ اس پر گفتگو تو کرتے لیکن کچھ کرنے سے مجبور تھے کہ اب کچھ کرنے کے لیے اقتدار کی ضرورت تھی اور اب اقتدار جن لوگوں کے پاس تھا، اقتدار ان کا نہیں، وہ اقتدار کے غلام تھے۔ اس لیے اقتدار جو چاہتا، ان سے کرالیتا وہ بھی مجبور تھے۔

اختر حسین نے بہار شریف میں پریکٹس شروع کردی اور کچھ پرانے جان پہچان کے لوگ ان کے پاس آنے لگے۔ وہ ایک پورا چکر ختم کرکے پھر اسی جگہ پر آگئے تھے۔ ان کے سامنے

تحریک آزادی جیسی کوئی مصروفیت نہیں تھی۔ کانگریس، ضلع میں جو پروگرام بناتی، اس میں ان لوگوں سے مشورہ لینا ضروری نہیں سمجھتی تھی۔ تقاریب کے دعوت نامے بس یوں چلے آجاتے کہ فہرست میں ان لوگوں کے نام بہت دنوں سے چلے آرہے تھے۔

۲۸

حامد کے لگاتار دو تین خطوط آئے جن سے گھر بھر میں خوشی کی لہر دوڑ گئی۔ اس کے جانے کا لوگوں پر جو بھی اثر رہا ہو اس کی خوش حالی کی خبر سے سب کو مسرت ہوئی۔ اختر حسین نے بھی یہ خط دیکھے اور خاموش رہے۔ حامد نے اپنے خطوط میں باپ ہی کو مخاطب کیا تھا لیکن جواب اس کی والدہ نے دیا تھا۔ اختر حسین، بیٹے کی قانون شکنی کو معاف نہیں کر سکے تھے۔

تیسرا الیکشن قریب آرہا تھا۔ کانگریس تو پچھلے الیکشن میں بہار شریف کی سیٹ ہار چکی تھی۔ اس دفعہ صوبائی کانگریس وہاں سے کوئی بہت ہی مناسب امیدوار کھڑا کرنا چاہتی تھی۔ اجو دھیا بابو اور دوسرے دوستوں کا مشورہ ہوا کہ اس دفعہ اختر حسین پھر اس کے لیے کوشش کریں کیونکہ محمد یونس بد عنوانی کے الزام میں راجیہ ٹرانسپورٹ کارپوریشن کے چیئرمین کے عہدے سے نکالے جا چکے تھے۔ ان کی خاصی بدنامی ہوئی تھی۔ اگرچہ وہ کانگریس ہی میں تھے لیکن اب ان کی امیدواری کی کوئی توقع نہیں تھی۔ سب کے کہنے پر اختر حسین نے درخواست دے دی۔ ضلع کانگریس کے صدر کو جب معلوم ہوا تو وہ اجودھیا بابو کے ساتھ اختر حسین سے ملنے آئے۔

"حضور، بڑی خوشی کی بات ہے آپ شہری حلقہ سے کانگریس کے ٹکٹ پر لڑنا چاہتے ہیں۔"

"بھئی، میں تو کانگریس کا پرانا خادم ہوں۔ یہ جگہ کانگریس نے کھو دی، اس کا سب کو بہت دکھ ہے۔ میری دلی تمنا ہے کہ یہ جگہ کانگریس کو پھر حاصل ہو جائے۔"

"اب تو کئی پارٹیاں میدان میں آگئی ہیں۔ مقابلہ بہت سخت ہو گیا ہے۔ پیسہ بھی بہت خرچ ہونے لگا ہے۔"

"میں آپ کا مطلب نہیں سمجھا؟"

"مطلب یہ کہ پارٹی تو آپ کو صرف دس ہزار دے گی۔ آپ خود کتنا خرچ کر سکیں گے؟"

"بھئی میرے پاس پیسہ کہاں ہے۔ پارٹی فنڈ سے جو بھی ملے گا، بس وہی خرچ کر سکوں گا۔"

"حضور، پارٹی فنڈ سے جو کچھ ملے گا، وہ تو بس ایک محلہ ہی میں خرچ ہو جائے گا۔ کم از کم پچاس ہزار تو ہونا ہی چاہیے۔ دوسری پارٹیاں بہت زیادہ خرچ کر رہی ہیں۔"

"آپ جو باتیں کر رہے ہیں، وہ میری سمجھ سے باہر ہیں۔ کیا اتنے دنوں میں سیاست اتنی بدل چکی ہے؟"

"بھئی یہ زمانہ ترقی کا ہے۔ ہر چیز ترقی کر رہی ہے تو سیاست کیوں پیچھے رہے گی۔ سیاست تو ایک ترقی یافتہ صنعت بن چکی ہے۔ یہ دور تو پیشہ ور سیاست کا ہے۔"

اجودھیا بابو نے گفتگو میں حصہ لیتے ہوئے کہا۔

"ہم لوگ تو اپنے آپ کو بدل نہیں سکتے نا ——— سیاست اور دنیا بھلے ہی بدل جائے۔"

"حضور زمانہ کے ساتھ چلنا ہے تو اس کا ساتھ دینا ہی ہوگا۔"

صدر ضلع کانگریس نے کہا۔

"آپ ہی بتائیے نا ——— آپ جو پیسوں کی بات کر رہے ہیں تو میں کہاں سے لاؤں۔ دوستوں سے کہہ سکتا ہوں، ہمدردوں سے کہہ سکتا ہوں اور وہ بھی ان لوگوں کی مرضی پر ہے۔ ہم لوگ تو دوستوں کے لیے خود ہی خرچ کرتے تھے اور خرچ کا حساب کبھی نہیں رکھا۔"

"دیکھیے حضور، ہم لوگ چندہ کریں گے۔ چندہ دینے والوں کی اب کمی نہیں ہے، بزنس طبقہ کے لوگ اس کے لیے تیار ہیں۔ صرف یہی کرنا ہے کہ قانون ساز اور سرکار میں پہنچ کے آپ کو ان کے مفاد کی حفاظت کرنی پڑے گی۔"

"آپ کا مطلب ہے کہ میں کانگریس اور عوام کا نہیں بلکہ چندہ دینے والوں کا نمائندہ بن کے وہاں جاؤں؟"

اختر حسین نے تیز لہجے میں کہا۔

"نہیں صاحب، نمائندہ تو آپ کانگریس ہی کے رہیں گے لیکن جو لوگ چندہ دے کے آپ کو بھیجیں گے، ان کو مدد تو آپ کو کرنی ہی ہو گی۔"

"دیکھیے جناب، صاف صاف بات۔ میں عوام کے مفاد کی حفاظت کروں گا، کسی ایک فرد یا ایک طبقہ کو فائدہ پہنچانے کی بات میں سوچوں گا بھی نہیں۔"

"حضور، تب پھر آپ الیکشن میں کامیاب نہیں ہو سکتے۔ اب الیکشن میں عوام کا ہاتھ زیادہ نہیں ہوتا۔ اس میں طرح طرح کی حکمت عملی بنانی پڑتی ہے۔ جن کے پاس طاقت اور پیسہ ہوتا ہے، انہیں ان چیزوں کا استعمال بھی کرنا پڑتا ہے اور جن کے پاس نہیں ہوتا، وہ دوسروں کی مدد لیتے ہیں۔"

"بھئی، چندہ کرنے میں حرج ہی کیا ہے ——— چندہ تو کانگریس کے کارکن کریں گے۔ آپ کانگریس کے امیدوار ہوں گے۔ اس لیے کانگریس آپ کی کامیابی کی فکر کرے گی۔"

اجودھیا بابو نے انہیں سمجھایا۔

"آپ کہتے ہیں تو چندہ کرنے میں مجھے کوئی اعتراض نہیں ——— لیکن پہلے ٹکٹ تو ملنے دیجیے۔"

"ضلع کانگریس آپ ہی کے نام کی سفارش کرے گی۔ ٹکٹ کے معاملے میں نئے اور پرانے کا کوٹا بن گیا ہے۔ پرانے لوگوں کے کوٹا میں ٹکٹ آپ ہی کو ملے گا۔ صوبائی صدر سے میری بات ہوئی ہے۔ وہ کہہ رہے تھے کہ چونکہ اس جگہ پر مسلمانوں کی تعداد بہت زیادہ ہے، اس لیے یہ جگہ مسلمان ہی کو ملے گی۔ لیکن ایسے مسلمان کو نہیں جو ہار جائے۔ یہاں سے جیتنا کانگریس کے وقار کا سوال ہے۔"

صدر کانگریس نے کہا۔

"آپ لوگوں کی محبت اور کوشش شامل حال رہی تو کامیابی کوئی بڑی بات نہیں ہو گی۔"

۲۹

اگرچہ اختر حسین ٹکٹ کے معاملہ میں زیادہ بھاگ دوڑ نہیں کرنا چاہتے تھے۔ انہیں اچھا نہیں لگتا تھا کہ محض ٹکٹ کے لیے وہ لوگوں کی خوشامدیں کرتے پھریں۔ پچھلی بار بھی وہ محض اجودھیا بابو کی ضد اور ان کی دل جوئی کے لیے دلی چلے گئے تھے، پھر بھی وہ موقع کی نزاکت کو سمجھتے ہوئے پٹنہ جا کے اجودھیا بابو کے ساتھ لوگوں سے ملے۔ کانگریس کے ٹکٹ کے شائقین بہت بڑھ چکے تھے۔ لیکن بہار شریف شہری حلقہ کے لئے کانگریس نے صرف انہیں کا نام بھیجا اور انہیں کے نام پر چندہ کا کام بھی شروع کر دیا گیا۔ پیسہ کتنا آیا، کتنا جمع ہوا، اس سے اختر حسین کو کوئی مطلب نہیں تھا۔ وہ تو امیدواری واضح ہوئے بغیر چندہ وغیرہ کرنے کے حق میں ہی نہیں تھے۔ لیکن صدر ضلع کانگریس اپنے فنڈ کو مضبوط رکھنا چاہتے تھے۔ انہوں نے قبل ہی سے الیکشن کے کئی محاذ کھول رہے اور سبھی محاذوں پر لگ گئے۔

دلی سے بورڈ کی میٹنگ کے بعد امیدواروں کی آخری فہرست آگئی۔ اختر حسین کو بہار شریف سے ٹکٹ مل گیا۔ وہ زور و شور سے انتخابی کاموں میں مصروف ہو گئے۔ بین ہاؤس میں دن رات چہل پہل رہنے لگی۔ اختر حسین نے خرچ کی ساری ذمہ داری صدر ضلع کانگریس پر ڈال دی تھی۔ ان کے پاس اپنا پیسہ تھا ہی نہیں جسے وہ خرچ کرتے۔ صوبائی کانگریس نے دس ہزار روپئے دیے تھے۔ یہ روپے بھی انہوں نے چندوں کے ساتھ صدر ضلع کانگریس کی تحویل میں دے دیے تھے۔ ان کے پاس جو بھی پیسوں کے لیے آتا، وہ اسے صدر ضلع کانگریس کے پاس بھیج دیتے۔ ان کے پاس بارہا شکایت آئی کہ صدر ضلع کانگریس پیسوں کو دبائے بیٹھے ہیں اور الیکشن میں ٹھیک ڈھنگ سے خرچ نہیں کر رہے۔ انہوں نے خود بھی دیکھا تھا کہ مخالف امیدواروں کے ہر جگہ کیمپ کھلے ہیں جہاں باقاعدہ لنگر کا انتظام ہے جب کہ کانگریس نے بس یہ کیا تھا کہ ہر جگہ دو بیلوں کی جوڑی کا پوسٹر لگوا دیا تھا۔ اجودھیا بابو

تک کو صدر ضلع کانگریس سے شکایت ہو گئی کہ وہ پیسوں کے سلسلے میں کنجوسی سے کام لے رہے ہیں۔ اختر حسین نے سب کچھ سن کر بھی زبان سے ایک لفظ نہیں نکالا اور اپنے انتخابی کاموں میں مصروف رہے۔ ان کے پاس ایسے مخلص کارکن بھی تھے جو اپنا کھا پی کر بھی ان کا کام کر رہے تھے اگرچہ ان کی تعداد قلیل تھی۔ ان کے پاس وسائل کی بڑی کمی تھی کیونکہ وسائل حاصل کرنے کے لیے انہوں نے تگ و دو نہیں کی۔ سیاست کو وہ پیشہ نہیں، خدمت کا ذریعہ سمجھتے تھے۔

الیکشن ہوا، نتیجہ نکلا۔ اختر حسین کئی ہزار ووٹوں سے ہار گئے۔ انہوں نے ہار کو عوام کا فیصلہ سمجھتے ہوئے بڑی حلیمی سے قبول کر لیا لیکن ان کے دوستوں اور رفیقوں پر اس کا گہرا اثر ہوا۔ ان لوگوں نے کبھی سوچا بھی نہیں تھا کہ اختر حسین ہار بھی سکتے ہیں۔ وسائل اور پیسے کی کمی کے باوجود ان لوگوں نے دن رات ایک کر دیا تھا۔ ان کے حساب کے مطابق اختر حسین کے کئی ہزار ووٹوں سے ہارنے کا تو کوئی سوال ہی نہیں تھا۔ لیکن ہار حقیقت بن کے سامنے آگئی تھی جس کو قبول کر لینے کے سوا کوئی چارہ ہی نہیں تھا۔

ایک شام اجودھیا بابو، اختر حسین کے ہاں آئے تو انہوں نے ایک دلچسپ خبر دی۔

"سنا بھائی صاحب آپ نے۔ شہر کے بنیے آج کل روز صدر ضلع کانگریس کے مکان کا چکر لگاتے ہیں۔ صدر صاحب لاپتہ ہیں۔"

"کیوں ______؟"

"الیکشن میں انہوں نے جو چندے جمع کیے تھے، اسی کا حساب لینے کو۔"

"بھئی، چندوں کا حساب، دینے والے کیوں لیں ______؟"

"دراصل ان لوگوں نے چندے اس لیے دیے تھے کہ کانگریس پارٹی جیت جائے۔ صدر صاحب نے ان سے وعدہ بھی یہی کیا تھا۔ اب جب کہ کانگریس ہار گئی تو یہ لوگ اپنے پیسے واپس لینا چاہتے ہیں۔"

اختر حسین چپ ہو گئے۔ کچھ دیر کے بعد بولے۔

"اجودھیا بابو ______ سیاست چھوڑ کے سنیاس لینا چاہیے۔ سیاست اب ہم جیسے لوگوں کا کھیل نہیں رہا۔"

"یوں تو ہم کون سے سیاست میں بہت سرگرم ہیں، لیکن ہم تو اب بھی سیاست

کو گندی چیز نہیں سمجھتے، دوسروں نے اسے گندا ضرور کر دیا ہے۔"

"مجھے تو ایسا لگتا ہے اجودھیا بابو کہ سیاست اب کوئلے کی ایک ایسی کان بن گئی ہے جس کے اندر جانے والوں کو کالک ضرور لگے گی، اس لئے اب دور رہنے ہی میں چارہ ہے۔ بھلا بتائیے چندے کے اس چکر میں اگر میں براہ راست پڑتا تو اس وقت میری کیا پوزیشن ہوتی ____؟"

"اور جانتے ہیں۔ مجھے بھی بعد میں پتہ چلا کہ چندے میں بڑی بڑی رقمیں دینے کا مطلب کیا ہوتا ہے۔ چندہ دینے والے، آپ سے ہر جائز و ناجائز کام کروانے کا پرمٹ حاصل کر لیتے ہیں اور آپ ان کی بات سے انکار بھی نہیں کر سکتے کیونکہ ان کے ہاتھ بہت لمبے ہوتے ہیں۔"

"مجھے تو شک ہو رہا ہے کہ کہیں میری ہار میں کوئی ایسا ویسا راز تو پوشیدہ نہیں؟"

"صحیح کہہ رہے ہیں آپ ________ مجھے پہلے خبر ملی تھی تو میں نے یقین نہیں کیا تھا لیکن اب بات کھل گئی تو اب یقین کرنا ہی پڑا۔ الیکشن اب عوام کی حمایت سے نہیں، بوتھوں پر قبضہ کرنے سے جیتا جا سکتا ہے۔ یہاں بھی ایسا ہی ہوا ہے۔ مخالف پارٹی والے طاقت اور پیسے میں ہم لوگوں سے بڑھ گئے اس لیے وہ جیت گئے ورنہ ہم لوگ بھی اگر طاقت اور پیسہ جٹا لیتے تو ہارنے کا سوال ہی نہیں تھا۔"

اختر حسین کو تو پہلے ہی شک تھا، اجودھیا بابو کی بات سے اُن کو یقین ہی ہو گیا۔ ان کے پاس فرصت ہی فرصت تھی۔ انہوں نے بین کے کام کو بہت دنوں سے چھوڑ رکھا تھا، کچھ تو مصروفیت کی وجہ سے اور کچھ تو اس لیے کہ سرور حسین نے پاکستان سے آکر جب کھیت بیچے تھے تو ان سے مشورہ نہیں کیا تھا اور پیسوں کا حساب بھی خود ہی رکھا تھا۔ وسیم اور شمیم اپنی نوکریوں پر تھے۔ چھٹیوں میں آتے تو ان کی سمجھ میں زمین کا حدود اور اربع بالکل نہیں آتا تھا اور وہ گماشتہ جی، پٹواری جی کی کہی سن کے چلے جاتے۔ بی بی صاحبہ برابر اختر حسین سے کہتی تھیں کہ وہ ذرا بین کی طرف توجہ کیا کریں۔ اب انہیں فرصت ملی تو وہ ایک بار ایک مہینہ کے قیام کی نیت سے وہاں چلے گئے۔ بین پہنچ کے تو انہیں دوسری دنیا ہی نظر آئی۔ اتنے عرصہ میں، بین بالکل ہی بدل کے رہ گیا تھا۔ پرانے اور بوڑھے لوگ کمروں میں بند ہو کے اللہ اور بھگوان کو یاد کرتے۔ اکثر مسلمان لڑکے، نوکری تلاش کرتے کرتے پاکستان کو

سدھار چکے تھے اور جو یہاں رہ کے کھیتی اور چھوٹی موٹی تجارت میں لگے تھے، وہ گاؤں کی سیاست میں بری طرح ملوث تھے۔ ان کی اپنی کوئی حیثیت نہیں تھی۔ وہ راجپوت، بھومیار یا بیک وارڈ گروپ کے تعلق سے پہچانے جاتے۔ انہوں نے اپنی کوئی پہچان نہیں بنائی تھی اس لیے وہ اپنے اپنے گروپ سے چمٹے رہتے۔

اختر حسین سے ملنے گاؤں کے بڑے بوڑھے آئے تو وہاں بہت سی خبریں ملیں۔ گاؤں میں چوری ڈکیتی کے واقعات بہت بڑھ گئے تھے۔ شام ۷ بجے کے بعد لوگ گھروں میں بند ہو جاتے، نکلنا اگر بہت ضروری ہوتا تو پھر گروہوں میں نکلتے۔ جرائم کے واقعات کی رپورٹ پولیس کو کی جاتی تو اول تو پولیس کوئی کارروائی نہیں کرتی اور اگر کرتی بھی تو اس کیلئے بہت رشوت مانگتی۔ عدم تحفظ کے احساس سے سارا علاقہ گھرا ہوا تھا۔

محمد یٰسین گاؤں کے بہت بوڑھے شخص تھے۔ اختر حسین انہیں چچا کہتے۔ وہ شیخ صاحب کے ملنے والوں میں تھے۔ چار بیٹے تھے ان کے۔ جن میں دو تو شہر سے بی۔ اے کر کے گر دنیا پاسپورٹ کے ذریعہ پاکستان چلے گئے۔ محمد یٰسین نے بڑے جتن سے ان لوگوں کو شہر میں رکھ کر بی۔ اے کروایا تھا۔ انہیں نوکری نہیں ملی تو وہ کئی بار اختر حسین کے پاس سفارش کے لیے بھی گئے تھے، اختر حسین نے کوشش بھی کی تھی، لیکن نوکری ان لوگوں کو نہیں مل سکی تھی۔ انھیں جب نوکری نہیں ملی تو انہوں نے ٹریکٹر خرید لیا اور مزے سے اپنے کھیتوں میں ٹریکٹر چلاتے پھرتے۔ پاس کے گاؤں کے ایک زمیندار بابو سریندر سنگھ کے بیٹے نریندر سنگھ نے محمد یٰسین کو بھی رائے دی کہ وہ بھی ایک ٹریکٹر لے لیں۔ اب تو بینک سے قرض لے کے ٹریکٹر خریدا جا سکتا تھا۔ محمد یٰسین کے پاس اچھے خاصے کھیت بھی تھے۔ بات ان کو اچھی لگی۔ بیلوں کے چکر میں ہر سال ان کے ہزاروں روپے برباد ہو جاتے۔ کبھی بیلوں کو سانپ کاٹ لیتا، کبھی وہ اتنے بیمار ہو جاتے کہ کھیتی کے لائق ہی نہیں رہ جاتے ٹریکٹر آجانے سے ان کا درد سر بھی ختم ہو جاتا اور وہ بابو سریندر سنگھ کی طرح ہزاروں روپے کا غلہ بھی فروخت کر سکتے تھے۔ لیکن ان کے لڑکے اس کے لیے تیار نہیں ہوئے اور ایک دن ان کو بتائے بغیر ڈھاکہ روانہ ہو گئے۔ محمد یٰسین اس صورت حال سے اتنے دل برداشتہ ہوئے کہ بقیہ دونوں بیٹوں کو اسکول سے میٹرک کرا کے چھوڑ دیا۔ ان کے دونوں بیٹے گاؤں

ہی میں رہتے تھے، لیکن کھیتی سے انہیں کوئی دلچسپی نہیں تھی۔ دونوں آوارہ گردی کیا کرتے مچھلیاں مارتے، تاش کھیلتے اور طرح طرح کے کھیل اور شرارتوں میں خود کو مصروف رکھتے۔ شاہراہ سے جو کچی سڑک بین تک آتی وہ درمیان ہی میں کئی شاخوں میں منقسم ہوکر درجنوں گاؤں تک چلی جاتی تھی۔ ایسی ہی ایک سڑک پر شام کے وقت کلکتہ سے گاؤں آتے ہوئے ایک مسافر کو لوٹ لیا گیا۔ ساتھ ہی چھرا بھی مار دیا گیا۔ وہ تو خیریت ہوئی کہ چھرا کسی نازک جگہ پر نہیں لگا اور پھر اس کی چیخ و پکار سن کے بہت سے لوگ بھی آگئے، اور اسے بروقت طبی امداد بھی مل گئی، جس سے اس کی جان بچ گئی۔

آدمی نہ صرف پیسے والا تھا بلکہ پیسوں کا استعمال بھی جانتا تھا۔ پولیس کی کئی گاڑیاں گاؤں گاؤں گھومنے لگیں اور دھڑ پکڑ شروع ہوئی۔ محمد یسین کا ایک بیٹا بھی گرفتار ہوگیا۔ اس کے ایک دوست کی قبل گرفتاری ہوئی تھی اور اس کے پاس سے چوری کا کچھ سامان بھی برآمد ہوا۔ بہت گہرا دوست ہونے کی وجہ سے محمد یسین کا بیٹا اظہر بھی زد میں آگیا۔ پولیس نے تھانہ میں لے جاکر اس کی اس قدر پٹائی کی، کہ وہ زخمی ہوکر اسپتال میں داخل کیا گیا۔ اس کا دوست ہندو تھا، لٹنے والا بھی ہندو تھا، اظہر مسلمان تھا اور گاؤں میں ہندو مسلمان دونوں تھے۔ جانے اظہر کی پولیس کے ذریعہ پٹائی سے کون سی بات پیدا ہوئی کہ گاؤں میں فرقہ وارانہ کشیدگی نمودار ہوگئی۔ دونوں فرقوں کے درمیان تناؤ پیدا ہوگیا۔ ہندو راتوں میں میدانوں میں جمع ہوکے، بجرنگ بلی کی جے کرنے لگے اور مسلمانوں کی طرف سے نعرۂ تکبیر اللہ اکبر سے جواب دیا جانے لگا۔ دیکھتے ہی دیکھتے فضا ہی بدل گئی۔ اختر حسین گاؤں میں موجود تھے اور یہ سب کچھ انہوں نے اپنی آنکھوں سے دیکھا تھا۔ انہیں شدت سے محسوس ہوا کہ اندر اندر آگ تو دونوں طرف سلگتی رہتی ہے، صرف اک چنگاری کے بھڑک اٹھنے کی کسر ہوتی ہے۔ انہوں نے گاؤں بھر کے ہندو مسلمانوں سے باتیں کیں، انہیں سمجھایا بجھایا۔ انہیں یہ دیکھ کے سخت تعجب ہوا کہ کوئی فرد بھی اس قسم کی کشیدگی کو پسند نہیں کرتا، سبھی چاہتے ہیں کہ امن وامان کی فضا بحال رہے، لیکن اس کے باوجود راتوں میں نعرہ بازی کا سلسلہ جاری رہا۔ کبھی کبھار بم پھٹنے کی آوازیں بھی سنائی دے جاتیں۔ اختر حسین پندرہ روز بین میں رہنے کے بعد بہار شریف لوٹ آئے۔ وہ وہاں کھیتوں کے معاملات دیکھنے اور آرام کرنے گئے تھے لیکن وہ دونوں میں کوئی کام نہیں کرسکے۔

بہار شریف آکر انہوں نے ایس ڈی او اور ڈی ایس پی سے گاؤں کی کشیدہ فضا کے بارے میں باتیں کیں تو وہ لوگ وہاں پولیس بھیجنے کو تیار ہو گئے۔

پندرہ روز کے بعد بہار شریف کے بہت سے لوگ ان سے ملنے بہار شریف آئے۔ پولیس نے دونوں طبقے کے خلاف ان گنت مقدمے دائر کر دیے تھے اور لوگ سب کچھ بھول کے مقدموں میں پھنس گئے تھے۔ صورت حال یہ ہو گئی تھی کہ پانی کی طرح پیسہ بہہ رہا تھا۔ جان اور عزت دونوں کے لالے پڑ گئے تھے۔ اختر حسین کو افسوس ہوا کہ انہوں نے وہاں کیوں پولیس بھیجی۔ اس سے تو لوگ اور بھی ایک دوسرے سے دور ہوتے گئے۔ اختر حسین نے دونوں فرقوں کے افراد کی پیروی شہر میں بھی کی اور گاؤں بھی گئے تاکہ آپس میں مل بیٹھ کے فضا کو درست کیا جا سکے۔ ان کی ان کوششوں کے باوجود مسلمان یہ توقع رکھتے کہ مسلمان ہونے کے ناطے انہیں انہیں کا ساتھ دینا چاہیے جب کہ ہندو یہ سمجھتے کہ وہ ہر حال میں مسلمانوں ہی کی حمایت کریں گے۔ اختر حسین پرانے کانگریسی تھے۔ گاندھی جی کو دنیا سے گئے ہوئے کئی برس ہو گئے تھے لیکن وہ ان لوگوں میں تھے جو گاندھی جی کو اپنے دلوں میں ہمیشہ زندہ رکھنے کا تہیہ کر چکے تھے۔ انہیں جب محسوس ہوا کہ لوگ ان کے بارے میں کیا رائے رکھتے ہیں تو اس وقت ان کے سامنے دو ہی راستے رہ گئے، یا تو وہ چپکے ہو کر گھر میں بیٹھ رہیں یا پھر اپنے اصولوں کی خاطر باہر نکل آئیں۔ ظاہر ہے کہ ان پر وہ ٹھپہ لگنے جا رہا تھا جس کی مخالفت وہ زندگی بھر کرتے رہے تھے۔ سمجھوتہ کرنا انہوں نے سیکھا ہی نہیں تھا۔ انہوں نے بین میں ڈٹے رہنے کا فیصلہ کیا۔ ان کے فیصلے کی خبر سن کے اجودھیا بابو اور ان کے دو چار پرانے کانگریسی دوست بھی آ گئے۔ ان سب نے گاؤں اور سارے علاقہ کے ایک ایک آدمی سے ملاقات کی اور سبھی کے خیالات جاننے کی کوشش کی۔ اس سے فائدہ یہ ہوا کہ جب بھی یہ لوگ کوئی میٹنگ بلاتے تو اس میں دونوں طبقے کے لوگ شریک ہوتے۔ اتنا کچھ کرنے کے بعد اختر حسین اپنے دوستوں کے ساتھ بہار شریف جا کے حکام سے ملے اور انہیں بڑی مشکلوں سے اس بات کے لیے راضی کیا کہ وہ لوگ خود بین آئیں اور سب کو آپس میں گلے ملوا کے مقدمہ واپس لے لیں۔ اس دن بین میں ایک بہت بڑا جلسہ ہوا جس نے شیخ صاحب کے دور کی یاد دلا دی۔ ایس ڈی او اور ڈی ایس پی بھی آئے۔ دونوں طبقے کے لوگ جب گلے ملنے لگے

تو ایسا لگا جیسے ابھی ابھی عید کی نماز ختم کر کے لوگ ایک دوسرے سے مل رہے ہوں۔ مقدمے بھی واپس ہوئے۔ اختر حسین کو اپنی کاوش سے سکون تو تھا لیکن وہ رہ رہ کے سوچ رہے تھے کہ اس قسم کی کوششیں آخر کب تک ہوتی رہیں گی اور کون کرے گا ——— زندگیاں تو بہت لمبی ہوتی ہیں۔

۳۰

کلکتہ میں بہت بڑا فساد ہو گیا۔ راورکیلا، جمشید پور اور رانچی میں آگ لگ گئی۔ سارا مشرقی ہندوستان اس تمازت کی زد میں آ گیا۔ لوگ کہتے تھے کہ مشرقی پاکستان میں اقلیت کو اجاڑا گیا ہے اور وہاں سے ہزاروں رفیوجی ہندوستان آ گئے ہیں اس لیے ان کے ردعمل میں یہ فسادات ہو رہے ہیں۔ فساد کی آگ ہفتوں سلگتی رہی۔ بہار شریف میں عجیب ڈری ڈری سہمی سہمی سی فضا طاری تھی۔ یہاں کے بہت سے لوگ کلکتہ، رانچی اور جمشید پور میں کام کرتے تھے۔ ان کے گھروں میں تو ماتم تھا۔ روز طرح طرح کی افواہیں پھیلتیں ریڈیو اور اخباروں میں جو خبریں آتیں، ان پر لوگوں کا اعتماد نہیں تھا۔ وہ بی بی سی اور پاکستان ریڈیو سننے کی کوشش کرتے۔ فساد زدہ شہروں میں کرفیو لگا ہوا تھا۔ وہاں سے لوگ چھپ چھپا کے بھاگ رہے تھے ان کے آنے سے طرح طرح کی خبریں بھی آ رہی تھیں۔ عدم تحفظ کی ہوا چل پڑی تھی۔ گھروں کے دروازے بند رہتے۔ اختر حسین چند ضروری معاملوں کے سلسلے میں بین جانے والے تھے۔ ان کو کچھ لوگوں نے جانے سے منع بھی کیا لیکن ان کو نہ جانے کی کوئی وجہ نظر نہ آئی۔ بی بی صاحبہ کو پتہ چلا تو وہ بہت گھبرا گئیں۔ گھر میں انڈے والی، سبزی والی، بسکٹ والی عورتیں آتی رہتی تھیں۔ بی بی صاحبہ کو علاقہ کی ذرا ذرا خبر رہتی تھی۔ انہوں نے اختر حسین کو بلا کر پوچھا۔

"بیٹا، سنا ہے تم بین جا رہے ہو ——— ؟"

"ہاں اماں ـــــ بہت سے کام ہیں۔ پٹواری جی سے کہہ آیا تھا۔ جانا ضروری ہے۔"

"بیٹا، اس قدر مار کاٹ ہو رہی ہے اور تم گھر سے باہر نکل رہے ہو ـــــ؟"

"مار کاٹ یہاں تو نہیں ہو رہی ہے ـــــ کلکتہ، جمشید پور میں ہو رہی ہے، یہاں تو لوگ خواہ مخواہ گھبرا رہے ہیں۔"

"لوگوں کا کیا ٹھکانہ ـــــ کس وقت کون کس کو مار دے۔ سنا ہے کہ یہاں بھی بہت تیاری ہو رہی ہے۔ بیٹا تم گھر سے باہر بھی مت نکلو۔"

اختر حسین کو ہنسی آگئی۔

"اماں، یہاں کچھ نہیں ہو گا۔ لوگ خواہ مخواہ گھبرا رہے ہیں۔ اس قسم کی باتیں تو ہوتی ہی رہتی ہیں۔"

"بیٹا، جب پاکستان بن گیا تب پھر کیوں ہوتا ہے جھگڑا ـــــ؟"

"اماں، اگر آپ اور ہم بھی پاکستان چلے جائیں تو جھگڑا ختم ہو جائے گا ـــــ جائیں گی آپ پاکستان ـــــ؟"

"ہم کیوں جانے لگے پاکستان ـــــ ہم لوگوں کا وطن ہندوستان ہے تو پھر پاکستان کیوں جائیں ـــــ؟"

"تو پھر یہیں رہیں ـــــ یہاں رہیں تو پھر ڈر کے کیوں رہیں ـــــ؟"

بی بی صاحبہ کی سمجھ میں نہ آیا کہ اب کیا کہیں۔ وہ بے بس ہو کے بولیں۔

"پھر بھی بیٹا، تم ابھی کہیں نہ جانا ـــــ گھر میں یوں بھی کوئی ہے نہیں۔"

"لیکن اماں۔ اگر میں گھر میں بند ہو کے بیٹھ رہوں گا تو لوگوں کو یقین ہو جائے گا کہ ضرور ڈر کی کوئی بات ہے۔"

بی بی صاحبہ شیخ الطاف حسین کے مزاج کو جانتی تھیں اور انھیں اختر حسین میں اپنے شوہر کی بو باس نظر آتی تھی۔ اختر حسین کی اس بات پر وہ خاموش ہو گئیں۔ اختر حسین ان کی خاموشی سے فائدہ اٹھاتے ہوئے بس میں روانہ ہو گئے۔ ان کو راستہ ہی میں احساس ہوا کہ فضا واقعی اچھی نہیں ہے۔ بس میں مسلمان شکل و صورت کے آدمی نہیں کے برابر تھے۔ ایک شخص کو اختر حسین نے پہچان لیا۔ وہ دھوتی پہنے اور گمچھا اوڑھے تھا۔ اختر حسین کو اس نے ایسی

نظروں سے دیکھا کہ وہ اس کو مخاطب کرنے کی ہمت نہ کرسکے۔ ان کی شکل و صورت البتہ مسلمان جیسی تھی۔ گھنی پکی داڑھی، شیروانی، چست پاجامہ، ٹوپی، ہاتھوں میں ایک نازک سی چھڑی۔ ممکن ہے کہ بس میں بہت سے لوگ انہیں پہچانتے بھی ہوں۔ لیکن کوئی ان سے مخاطب نہیں ہوا اور سب انہیں گھور گھور کے دیکھتے رہے۔ اختر حسین بے نیاز سے بیٹھے رہے۔ اس وقت انہیں لگا کہ ڈر کے احساس پر قابو پانا ہر ایک کے بس کی بات نہیں۔ بس میں خاموشی طاری تھی لیکن یہ خاموشی کراہتی ہوئی سی لگ رہی تھی۔ اختر حسین جیسے خاموش طبع انسان کو بھی یہ کراہ کان کے پردے پھاڑتی ہوئی محسوس ہو رہی تھی۔ انہوں نے بس میں بیٹھنے سے پہلے دو ایک اخبار لے لیے تھے۔ لیکن بس کی فضا نے ان کو اس قدر مصروف کر رکھا تھا کہ وہ اخبار کا ایک لفظ بھی نہ پڑھ سکے۔ اخبار ان کے سامنے کھلا رہا اور ان کی بے جان نظریں اس پر دوڑتی رہیں۔ ایک گھنٹہ کا سفر طویل سے طویل تر ہوتا گیا۔ وقت بہت بھاری ہو گیا تھا۔ جانے کتنی دیر کے بعد بس سڑک پر رکی۔ دو تین مسافر بین جانے والے راستہ پر بھی اترے۔ اختر حسین جب بھی آتے اپنے ملازموں کو خبر کر دیتے، بگھی وغیرہ وہاں آجاتی۔ اس دفعہ وہ خبر نہیں کر سکے تھے۔ سوچا تھا کہ ٹہلتے ہوئے نکل جائیں گے۔ مسافروں کے ساتھ وہ بھی اترے۔ وہ سب انہیں بہت غور سے دیکھ رہے تھے۔ اختر حسین نے ہی گفتگو کی ابتدا کی۔

"آپ لوگ کہاں جائیں گے ——— ؟ مجھے تو بین جانا ہے۔"

وہ لوگ ان کی بات سن کر ہڑبڑا گئے۔

"جی ہم لوگوں کو تو گووند پور جانا ہے ——— آپ کا گھر بین ہے کیا ——؟"

"گھر ——— ہاں گھر بھی کہا جا سکتا ہے۔ دراصل شیخ الطاف حسین صاحب میرے سسر تھے اور ماموں بھی۔"

"اوہ، آپ شیخ صاحب کے داماد ہیں، کہیں آپ وہی تو نہیں جو ڈپٹی منسٹر تھے؟"

شیخ صاحب کا نام اب بھی علاقہ میں احترام کا ضامن تھا۔

"جی ہاں ——— میں ہی ڈپٹی منسٹر رہا ہوں۔"

ان میں سے ایک نے اختر حسین کے ہاتھوں سے ان کا چرمی بیگ لے لیا۔ وہ

نہیں نہیں کرتے رہے۔ لیکن وہ لوگ نہیں مانے۔ پیدل سفر شروع ہوا۔ سفر کاٹنے کا بہترین ذریعہ باتیں ہوتی ہیں۔ اختر حسین نے ابتدا کی۔

" بھئی، یہ کیا سارے علاقے میں کشیدگی پھیلی ہوئی ہے۔ آزادی کو اتنے دن ہوگئے، پھر بھی ہم لوگوں کو عقل نہیں آئی۔ آخر ایسا کیوں ہوتا ہے۔"

" دیکھیے نا —— سب لوگ تو فساد نہیں چاہتے ہیں۔ لیکن چند افراد اپنے مفاد کی خاطر فساد کرانا چاہتے ہیں اور اس قسم کی فضا کو قائم رکھنا چاہتے ہیں۔"

اُن میں سے ایک نے کہا۔

" لیکن جو لوگ امن چاہتے ہیں، ان کا تو یہ فرض ہے کہ وہ آگے بڑھ کے ایسے تھوڑے سے لوگوں کا قلع قمع کریں۔ ورنہ یہ ایک ایسی بیماری ہے جو اندر اندر پھیل کے سارے دیش کو کھوکھلا کردے گی۔"

اختر حسین نے کہا۔

" لیکن حضور —— ہوتا یہ ہے کہ جب ایسی فضا بن جاتی ہے تو پھر اچھے بُرے میں کوئی فرق باقی نہیں رہ جاتا۔ سب ایک ہی رنگ میں رنگ جاتے ہیں۔"

" اب دیکھیے نا —— فساد کلکتہ میں ہوا، رانچی، جمشید پور میں ہوا۔ بہت بُرا ہوا لیکن یہاں کی فضا کشیدہ ہوگئی۔ اس فساد میں قصور چاہے جس کا ہو لیکن یہاں کے ہندو مسلمان کا قصور تو ہرگز نہیں ہے، پھر یہ لوگ آپس کی دشمنی کیوں بھگتیں —— ؟"

" حضور، مسلمان تو بڑے مزے میں ہیں کہ جب چاہیں، پاکستان بھاگ سکتے ہیں۔ ہم لوگ کسی سے ڈر کے کہاں بھاگ سکتے ہیں، ہمیں تو یہیں رہنا ہے۔ یہیں مرنا ہے۔"

" مرنا تو مسلمان کو بھی یہیں ہے۔ پاکستان بن گیا اس لیے بھاگتے ہیں نا —— نہیں بنتا تو کہاں بھاگتے۔ انہیں تو بھاگنے کا ایک راستہ مل گیا ہے، سو وہ بھاگتے رہتے ہیں۔"

" حضور، بھاگنے ہی کے لیے ان لوگوں نے پاکستان بنوایا ہے —— ہندوستان میں رہ کر پاکستان کے خواب دیکھتے رہتے ہیں، اس کا خراب اثر تو پڑے گا ہی۔"

"دیکھیے ـــــ پاکستان نہ ہندو نے بنایا ہے نہ مسلمان نے۔ پاکستان کو سیاست نے بنایا، جس کے شکار ہندو بھی ہوئے اور مسلمان بھی۔"

"پھر بھی اس کا مطالبہ تو مسلمان ہی نے کیا اور اس کے لیے لڑے بھی مسلمان ہی۔"

"وہ تو ٹھیک ہے کہ یہاں کے کچھ مسلمانوں نے غلطی کی، لیکن انہیں اس کی سزا بھی مل چکی ہے بلکہ غلطی دوسروں نے کی، سزا سب نے پائی۔ یہ سزا اتنے برسوں تک تو کسی قوم کو نہیں دی جا سکتی، یہ تو ملک ہی کے لیے خطرناک ہے۔"

اختر حسین کی بات پر وہ لوگ چُپ رہے۔ انہوں نے اپنی بات جاری رکھی۔

"دراصل ہمیں سنجیدگی سے سوچنا چاہیے کہ فساد سے کس کا نقصان ہوتا ہے۔ فساد ہوتے رہیں گے تو کشیدگی بنی رہے گی۔ کشیدگی بنی رہے گی تو لوگ کارخانوں، کھیتوں میں کام نہیں کریں گے۔ گھروں میں بند رہیں گے۔ اس طرح ملک کی ترقی رکے گی۔"

"یہ تو آپ صحیح کہتے ہیں حضور ـــــ کوئی گاؤں، کوئی شہر اور کوئی محلہ ایسا نہیں ہے جہاں مسلمان نہ ہوں۔ کشیدگی رہتی ہے تو ہندو مسلمان دونوں اس سے متاثر ہوتے ہیں۔ آپس میں ایسی دشمنی بنی رہتی ہے جس کا کوئی نام نہیں ہوتا۔ لیکن کیا کیا جائے۔ ہر آدمی کے دماغ میں جو بات جا کے بیٹھ گئی ہے، وہ کیسے نکلے ـــــ؟"

"اس کے لیے آپ اور ہم جیسے لوگوں کو قربانی دینی پڑے گی۔ یہ مادرِ وطن کی پکار ہے جس پر ہم لوگوں کو لبیک کہنا چاہیے۔"

ایک پڑاؤ آ گیا تھا۔ سڑک کے کنارے پھونس کی ایک جھونپڑی تھی جس کے آگے کچھ چارپائیاں اور بینچ بچھے ہوئے تھے۔ یہ لوگ جا کے پلنگوں پر بیٹھ گئے۔ جھونپڑی والا اختر حسین کو پہچانتا تھا۔ وہ جلدی سے ایک تکیہ لے آیا۔ اختر حسین لیٹنا تو نہیں چاہتے تھے لیکن اپنے ہم سفروں کے اصرار پر انہوں نے کمر سیدھی کر لی۔ لیٹتے ہی انہیں نیند آ گئی۔ کافی دیر کے بعد اچانک ان کی نیند ٹوٹی تو انہوں نے سب کو اپنا انتظار کرتے پایا۔ وہ سخت شرمندہ ہوئے۔

"معاف کرنا بھائی۔ لیٹتے ہی آنکھ لگ گئی، اسی لیے میں لیٹنا نہیں چاہتا تھا۔ عمر کا تقاضہ ہے۔"

"کوئی بات نہیں۔ اتنی دیر ہم لوگوں کو بھی آرام کرنے کا موقع مل گیا۔"

چائے تیار تھی۔ تازہ دم ہو کے اختر حسین نے گھڑی دیکھی تو ظہر کی نماز کا وقت جا رہا تھا۔ ان کو شش و پنج میں دیکھ کے ان میں سے ایک نے پوچھا۔

"کیا بات ہے ——— کچھ پریشانی ہو گئی ہے کیا ———؟"

"ارے بھائی، ظہر کا وقت نکلا جا رہا ہے۔ سو کر تو میں نے نماز ہی کھو دی۔"

"ارے نہیں حضور ——— آپ نماز پڑھ لیجیے۔"

ان لوگوں نے جھونپڑی والے سے ایک بالٹی پانی منگا کے ایک چوکی کو فوراً دھو ڈالا، اسے ایک کپڑے سے پوچھا۔ ایک تھیلے میں سے دھلی ہوئی دھوتی نکالی۔

"اس پر نماز پڑھ لیں گے آپ ———؟ دھلی ہوئی ہے۔"

"بالکل بالکل ——— ہمارے یہاں تو خشک جگہ اور خشک چیزیں بھی پاک ہوتی ہے"

اختر حسین نے چوکی پر بچھی دھوتی پر ظہر کی نماز ادا کی۔ نماز کے بعد وہ اپنے راستوں پر پھر روانہ ہوئے۔ اختر حسین اتنی دیر میں ان لوگوں کے قریب آچکے تھے۔ ان کے سامنے انہوں نے اپنا ایک مسئلہ رکھا۔ دراصل وہ لوگ زمیندار طبقہ سے تعلق رکھتے تھے جن کے پاس کاشت کاری کی وراثت تھی۔

"حضور ——— ادھر ہم لوگ ایک بہت ہی گمبھیر مسئلے سے دوچار ہو گئے ہیں۔ ہم لوگوں کے پاس کھیت ہیں۔ ہم ہمیشہ کھیتی کراتے آئے ہیں، ہم نے خود کھیتی نہیں کی ہے یہ پچھڑی جاتی کے لوگ ہریجن، جن کا دماغ ہماری سرکار نے بالکل خراب کر کے رکھ دیا ہے، اب ہمارے کھیتوں میں کام کرنے کی بہت اونچی اجرت مانگتے ہیں۔ بھلا بتائیے، ہم لوگ کھیتی کے لیے اتنی اونچی اُجرت کہاں سے دے سکتے ہیں۔ ہم انہیں کچھ غلہ دیتے آئے ہیں۔ ان کے ایک ایک گھر میں کئی کئی جن کام کرنے والے ہوتے ہیں، ان کی بہو بیٹیاں تک کام کرتی ہیں۔ جب کہ ہمارے ہاں معاملہ بالکل الٹا ہے۔ ایسی حالت میں تو ہم سبھی لُٹ جائیں گے۔"

اختر حسین ان کی بات سنتے رہے۔ بات کے خاتمے پر وہ بولے۔

"دیکھئے صاحب ——— اب ہمارا بھارت آزاد ہو گیا ہے۔ ہم نے اپنے سبھی شہریوں کو چند حقوق دیے ہیں۔ پچھڑی جاتی اور ہریجنوں کو اوپر اٹھانے کی ضرورت ہے۔

اگر سرکار اس کی کوشش کرتی ہے تو ہم سب کو اس کی مدد کرنی چاہیے۔"

"بھلا بتائیے تو یہ لوگ کبھی اوپر آسکتے ہیں اور اگر بھگوان نہ کرے، ایسا بھی ہو گیا تو پھر نہ ہماری عزت بچے گی نہ آپ کی۔ آخر یہ لوگ کام کرنے والے 'جن' ہیں۔ اگر یہ کام نہیں کریں گے تو پھر ہمارا اور ان کا پیٹ کیسے بھرے گا۔ ہم کام کے لیے کیا ولایت سے آدمی لائیں گے۔ ——— انہیں ہمارے کھیتوں میں کام کرنا ہو گا۔"

"بھائی صاحب۔ اس رویّے کو بدلنے کی ضرورت ہے۔ زمینداری اس لیے ختم کی گئی تاکہ امیر غریب سب کو آزادی کا پھل مل سکے۔ آئین نے سب کو برابری کا حق دیا ہے۔ اس حق کا احترام ہونا چاہیے۔"

"پھر بتائیے، ہم لوگوں کے کھیتوں میں اناج کیسے پیدا ہو ——— ؟ ہم لوگ تو خود کام کرنے سے رہے۔"

"کھیتی کے اس اصول کو مانا گیا ہے کہ جو کھیت جوتے اس میں محنت کرے، کھیت اسی کا ہو یا کم از کم اس کی پیداوار کا مالک وہی ہو۔ ابھی تو آپ زمینداری کے خاتمہ ہی سے گھبرا گئے۔ جلد ہی زمین کی حد بندی بھی ہو گی، تب پھر کیا کریں گے آپ ———؟"

"سرکار کا کام تو بس قانون بنانا رہ گیا ہے ——— یہ قانون لاگو کتنا ہوتا ہے، یہ کون دیکھتا ہے۔ اگر زمیندار اور کاشت کار نہیں چاہیں تو قانون ہمیشہ کاغذ ہی پر پڑے رہ جائیں گے۔ ہندوستان کی اصل جگہ تو دیہات ہے جہاں نوّے فی صد آبادی رہتی ہے۔ آپ صرف دس فی صد میں اپنے قانون لاگو کر کے خوش ہوتے رہتے ہیں۔"

"بھئی پڑھے لکھے آدمیوں کو قانون کے احترام کی بات سوچنی چاہیے۔ ورنہ یہ تو سچ ہے کہ قانون صرف کاغذ ہی پر رہ جائیں گے۔ قانون کا احترام نہیں ہو گا تو پھر ملک میں طوائف الملوکی پھیلے گی۔ قانون کے احترام کی بات عام آدمی نہیں سوچے گا، وہ تو پڑھے لکھے باشعور آدمی کو جو کرتے دیکھے گا وہی کرے گا۔"

"آپ قانون کے احترام کی بات کرتے ہیں۔ یہاں حالت یہ ہے کہ اب تو یہ ہر جگہ زمین پر قبضہ کرنے کی سوچ رہے ہیں۔ وہ دن بھی آنے ہی والا ہے جب یہ لوگ گھر پر چڑھ کے قبضہ کریں گے اور اگر آپ مقابلہ نہیں کر سکتے تو پھر 'عزت'، جائداد سب ان کے حوالہ

کر دیجیے۔"

اختر حسین ان کی بات سن کے خاموش ہو گئے۔ یہ بات تو بہت دنوں سے ان کے ذہن و دماغ میں پل رہی تھی۔ وہ بہت قبل اس خطرے کی آہٹ محسوس کر چکے تھے۔

"بھئی قبضہ کرنے کی عادت تو ان لوگوں کو دلائی ہوئی ہے۔ اس سے آپ انکار کر سکتے ہیں کہ ۱۹۴۷ء کے فسادات میں اونچی ذات کے لوگوں نے مکان و زمین پر قبضہ کرنے اور قتل و خون میں ان لوگوں کو استعمال کیا تھا، ان لوگوں کو اپنا حصّہ بھی ملا تھا ——— ؟ بڑے لوگوں کو تو دو طرفہ فائدہ ہوا تھا۔ انہوں نے قبضہ بھی کیا تھا اور اونے پونے داموں بھاگنے والوں کی جائدادیں بھی خریدی تھیں۔ وہ عادت ان پچھڑی جاتی کے لوگوں کو پڑ چکی ہے۔ خون ان لوگوں کے منہ کو لگ چکا ہے تو یہ رنگ تو لائے گا ہی۔"

اختر حسین کی بات سن کے وہ لوگ چپ ہو گئے۔ دیر تک خاموشی چھائی رہی بس انسانوں کی آمد و رفت اور قدموں کی چاپ کی آواز آتی رہی۔ کچھ دیر کے بعد ان میں سے ایک بولا۔

"دیکھیے حضور! ان کو زمین بیچنا تھا تو کسی نہ کسی کو خریدنا ہی تھا۔ اور ہر خریدار اس کی کوشش کرتا ہے وہ جو چیز بھی خریدے وہ سستے داموں پر ——— اور یہ بھی تو ایک حقیقت ہے کہ خریدار سوائے ہمارے تھا ہی کون ——— اور اگر ہم نہ ہوتے تو ان کی چیزیں کون خریدتا ؟"

"بھئی یہ تو آپ اپنے اوپر الزام لگا رہے ہیں کہ اگر ہم نہ خریدتے تو پھر وہ پاکستان کیوں بھاگتے ——— چھوٹے پیمانے پر تو یہ بات ممکن ہے لیکن عام طور سے یہ بات نہیں کہی جا سکتی۔ جن کو جانا تھا، ان کو ہر حال میں جانا تھا، سب کچھ چھوڑ چھاڑ کے جانا تھا۔ اصل چیز یہ ہے کہ ایسے حالات دیدہ دانستہ پیدا کیے گئے وہ یا تو اپنی جائداد ملکیت وغیرہ چھوڑ کر بھاگیں یا پھر سستے داموں فروخت کریں۔ ان کی چھوڑی ہوئی چیزوں پر قبضہ کرنے کے لیے چھوٹی جاتی کے لوگوں کو استعمال کیا گیا اور بعد میں ان سے کاغذ بنوا کے یہ چیزیں خریدی گئیں ——— کہیے میں غلط کہہ رہا ہوں ؟"

"جو کچھ آپ کہہ رہے ہیں، اس میں کچھ تو سچائی ضرور ہے لیکن سو فی صد نہیں۔ آخر اچھے برے تو ہر قوم میں ہوتے ہیں۔"

"اچھے برے کی بات مت کہیے۔ یہ میرا یقین ہی نہیں بلکہ ایمان ہے کہ ہر قوم اور ہر فرقہ میں اچھوں کی تعداد بہت زیادہ ہوتی ہے اور بُروں کی تعداد بہت ہی کم۔ لیکن ہوتا یہ ہے کہ ایک وقت ایسا آجاتا ہے جب بروں کے دکھائے ہوئے راستوں پر اچھے بھی چل نکلتے ہیں، خاص طور پر اس وقت جب بُروں کی حرکتوں سے اچھوں کو فائدہ بھی پہنچے ———"

ان لوگوں نے اثبات میں سر ہلا دیا۔ منہ سے کچھ بولے نہیں۔

"تو میں یہ کہہ رہا تھا کہ آج پچھڑی جاتی کے لوگ زبردستی قبضہ کرتے اور فصلوں کو کاٹ لینے کا جو ارادہ کیے ہوئے ہیں، اس کا چسکا ان کو لگا ہوا ہے، اگر وہ اس کا مزا انہیں اٹھائے ہوتے تو شاید یہ نوبت نہ آتی۔ ان کے اندر دلیری پیدا ہو چکی ہے۔ آج وہ کون سی بات ہے جو انہیں اتنا دلیر بنا رہی ہے ———؟"

"اس میں تو قصور سرکار کا ہے۔ سرکار نے زمینداری کا خاتمہ کرکے ہم لوگوں پر تو ظلم کیا ہی، ان لوگوں کو سر پر چڑھا کے ہماری رہی سہی عزت بھی ختم کر دی۔"

"سرکار تو سب کی بھلائی کی سوچے گی، اس لیے کہ سرکار تو سب کی ہے، وہ کسی ایک طبقہ کی نہیں ہے نا ——— لیکن میں یہ کہتا ہوں کہ سماج کی تعمیر سرکار نہیں کرتی، وہ ہم آپ کرتے ہیں اور سرکار ہمارے بنائے ہوئے اصولوں کے مطابق ہی کام کرتی ہے۔ ہم جس چیز کی بنیاد ڈالیں گے، آگے چل کے اسی کی فصل کاٹیں گے۔ یہ ایک سیدھی سی بات ہے اور آج سب کچھ اسی کے مطابق ہو رہا ہے۔"

"آج کل حد بندی کی بات بہت کی جا رہی ہے۔ حد بندی کا قانون بن گیا تو اس سے ہنگامہ اور بڑھے گا۔"

"اگر ہم قانون کا احترام کریں گے تو کبھی ہنگامہ نہیں ہوگا۔ اس بات کو مان لینے پر اپنے آپ کو تیار کرنا ہوگا کہ جو کھیت جوتے، کھیت اسی کا ہو۔ جس دن سماج میں سب کو حق مل جائے گا سماج سے ہر طرح کا ہنگامہ ختم ہو جائے گا۔ کھیتی وہی کر سکتا ہے نا جو اس کام کو جانتا ہو۔ ہمارے کسان کل کارخانوں میں تو جا کے کام نہیں کر سکتے، صرف جانکار ہی ان میں کام کر سکتا ہے۔ سماج اگر سب کو حق دے دے تو پھر سارا مسئلہ ہی ختم ہو جائے۔"

بین آگیا تھا۔ گاؤں سے باہر باہر جو سڑک چلی گئی تھی، اسی سڑک کو اختر حسین کے

ہم سفروں کو اختیار کرنا تھا۔ اختر حسین نے سڑک ہی پر سے انہیں رخصت کر دینا چاہا۔ لیکن وہ لوگ ان کے ساتھ ساتھ حویلی تک آ گئے۔ تین چار دھوتی بند حضرات کو اختر حسین کے ساتھ آتا دیکھ کر لوگوں کو حیرت بھی ہوئی۔ علاقے کی فضا مکدر ہو رہی تھی۔ گاؤں کے بہت سے لوگ جمشید پور، راور کیلا اور کلکتہ میں کام کرتے تھے۔ ان کے گھروں میں ماتم کی فضا طاری تھی۔ اختر حسین کے ساتھ ان لوگوں کو آتا دیکھ کر چہ مگوئیاں شروع ہو گئیں۔

"ان حضرت کی پرانی عادت ہے کہ جہاں کچھ ہوا، بس یہ قومی یک جہتی کا سبق پڑھانے آ گئے۔"

"بھئی یہ ٹھہرے کانگریسی ———— ہندو کے دوست"

"اب تو کانگریسیوں کا یہ ڈھونگ زیادہ دنوں تک چلنے والا نہیں۔ ان لوگوں نے پاکستان کی مخالفت کر کے مسلمانوں کو صفحۂ ہستی سے مٹا دیا تھا، وہ تو کہیے بزرگوں کی دعاؤں کی بدولت ایک ایسا ملک بن گیا جہاں مصیبت کے وقت پناہ لی جا سکتی ہے۔"

لوگ گھور گھور کے اختر حسین اور ان کے ساتھیوں کو دیکھتے رہے۔ اختر حسین تو ان کے تیور اسی وقت سمجھ گئے جب انہیں دیکھ کے لوگوں نے انہیں سلام بھی نہیں کیا لیکن وہ خراب اور بدتر حالات سے نپٹتے رہے تھے۔ اس لئے بے نیازی سے آگے بڑھتے رہے۔

حویلی میں گماشتہ جی موجود تھے۔ پٹواری جی کی طبیعت خراب ہو گئی تھی اس لیے وہ گھر چلے گئے تھے۔ اختر حسین نے گماشتہ جی اور کچھ دوسرے عملہ کو ان لوگوں کے ساتھ کر دیا کہ وہ سڑک تک ان لوگوں کو چھوڑ آئیں۔ جانے سے قبل ان لوگوں نے اختر حسین سے یہ وعدہ لیا کہ وہ کبھی ان کے گاؤں بھی آئیں گے۔ چند گھنٹوں کی رفاقت نے برسوں کے فاصلے مٹا دیے تھے۔

اختر حسین کو پتہ چلا کہ کشیدہ فضا سے متاثر ہو کر گاؤں کے مسلم نوجوانوں میں پاکستان بھاگنے کا رجحان پھر فروغ پا رہا ہے۔ درجنوں لڑکے جا چکے تھے اور باقی پیسوں کی فراہمی میں لگے ہوئے تھے۔ دو ہزار کا خرچ تھا، پھر نوکری بھی تھی اور حفاظت بھی۔ اختر حسین سے حسب معمول گاؤں کے بڑے بوڑھے ملنے آئے تو انہوں نے انہیں

سمجھایا۔

" ان لڑکوں کو جانے سے منع کیجیے۔ اس طرح سے تو ہندوستان سے مسلمانوں کی ایک پوری نسل ہی درمیان سے غائب ہو جائے گی۔ اس کا بہت خراب اثر پڑے گا۔"

" پھر آپ بتائیے بابو کہ کیا کیا جائے۔ یہاں تو جان اور مال دونوں خطرے میں ہیں۔ اول تو نوکری نہیں ملتی اور اگر ملتی بھی ہے تو بڑی آسانی سے مار لیے جاتے ہیں۔ محلے اور گاؤں میں تو اپنی آبادی میں رہتے ہیں، نوکری پر ان کے رحم و کرم پر ہوتے ہیں۔ اور بڑی آسانی سے قتل کر دیے جاتے ہیں۔"

گھستو میاں بولے۔ وہ پرانے کانگریسی تھے اور مسلم لیگ کی گالیاں سہ چکے تھے۔

" سریزم، رانچی میں تو سارے مسلمانوں کو گھیر گھیر کے اور چُن چُن کر مار دیا گیا۔ گھر کے دروازوں پر قبل سے نشان لگا دیا گیا تھا۔ بڑے افسروں کو بھی نہیں چھوڑا گیا۔ دس دس میل دور سے ان لوگوں کی چیخیں سُنی گئیں، کئی ہزار مارے گئے۔ اب بتائیے کہ مسلمان نوکری سے بھی گئے، تجارت سے بھی گئے، کھیتی سے بھی گئے تو اب کریں کیا ——— ایک پاکستان ہی تو اُن کے لیے رہ گیا ہے۔"

یہ ماموں، دادا تھے۔ چوبیس برس قبل پولیس کی نوکری سے ریٹائر ہوئے تھے۔ اور گاؤں کے پڑھے لکھے اور باشعور لوگوں میں ان کا شمار تھا۔

اختر حسین نے ان سے فوراً پوچھا۔

" اچھا یہ بتائیے کہ ان لوگوں نے حملہ آوروں سے کوئی مقابلہ بھی کیا ——— ؟"

" نہیں، وہ بچارے تو نہتے تھے، مقابلہ کیا کرتے ——— ؟"

" اگر ان فسادیوں کی جگہ پر چور ڈاکو آجاتے تب کیا ہوتا ——— ؟"

" ظاہر ہے کہ مارے جاتے ——— یہ بھی ہو سکتا ہے کہ صرف لوٹ کے چھوڑ دیے جاتے۔"

"اب بھلا بتائیے کہ ہم لوگوں کے پاس سب سامان عیش ہوتے ہیں، لیکن اپنی حفاظت کا کوئی سامان نہیں رکھ سکتے۔ یاد رکھیے کہ یہ ملک آپ کا بھی ویسے ہی ہے جیسے جیسے دوسروں کا ہے، آپ کو یہیں مرنا ہے، یہیں رہنا ہے۔ آپ کو دوسروں کے کہنے اور بھگانے پر ملک چھوڑ کے چلے نہیں جانا ہے۔ یہ تو ملک کا مقدّر ہے کہ وہ آج تک چند برے لوگوں کی مرضی پر چلنے پر مجبور ہوتا رہا ہے۔ آپ ہی بتایئے کیا ہم ان برے لوگوں کو اپنی من مانی کرنے دیں ______ ؟"

سب لوگ خاموش رہے۔ اختر حسین کی صدائے بازگشت سنائی دیتی رہی۔

"ہمیں ان لوگوں کا مقابلہ کرنا ہوگا۔ ان کو کسی بھی طرح راہ راست پر لانا ہوگا۔ اس کے لیے ہمیں ہتھیار بھی اٹھانا پڑے تو اس سے پیچھے نہیں ہٹنا چاہیے۔"

"لیکن حضور، ہم لوگ پھر بھی اقلیت میں ہیں۔ ہم اکثریت سے کتنے دنوں مقابلہ کر سکتے ہیں ____ ؟"

"بھئی دیکھیے، اقلیت اور اکثریت کے تصوّر کو کاغذ پر رہنے دیجیے۔ ذہنوں میں یہ چیزیں آئیں گی تو پھر مشکل ہو جائے گی ______ پھر اکثریت کی اکثریت آپ کی دشمن نہیں ہے، یہ اور بات ہے کہ کبھی کبھی وہ بھی غلط قسم کے جذبوں سے متاثر ہوتے ہیں۔ لیکن آپ کو صحیح راہ نہیں چھوڑنی ہے۔ اگر آپ کو کوئی بُری نظر سے دیکھے تو آپ اس کی آنکھ نکال دیجیے ______ زیادہ سے زیادہ یہی ہوگا نا کہ آپ مارے جائیں گے۔ مارے تو آپ یوں بھی جائیں گے لیکن مقابلہ کر کے مرنے اور بزدلی سے مرنے میں بہت فرق ہے۔ جب آپ ایک بار مقابلہ کر کے مر جائیں گے تو پھر دوسری بار آپ کو مارنے کوئی نہیں آئے گا، اس کے لیے بڑی ہمت کی ضرورت ہوگی۔ یہ کیا ہوا کہ جہاں کسی نے تنگ کیا، کسی نے مارا اور آپ میدان چھوڑ کے بھاگ کھڑے ہوئے۔ جینے کا یہ تو کوئی انداز نہیں ہے۔"

اختر حسین کی باتوں سے وہاں مکمل خاموشی چھا گئی۔ وہ ہمیشہ سنتے رہے تھے کہ دوسرے فرقہ کے لوگوں میں ایک ایسی جماعت پیدا ہو گئی ہے جو اپنے ممبروں کو ورزش کراتی ہے، ہتھیار چلانا سکھاتی ہے اور ہتھیار رکھنے کی ترغیب دیتی ہے اور اگرچہ یہی سب کرنے کو انہیں کسی نے منع نہیں کیا تھا پھر بھی انہیں یہ سوچ ہی کر بڑا اچنبھا لگتا کہ وہ بھی ہتھیار رکھ سکتے ہیں۔ اختر حسین کی باتیں ان کے لئے نئی نہیں تھیں کیونکہ یہ باتیں تو ان کے اندر ——— بہت اندر پلتی رہی تھیں، انہیں سطح پر آنے کا موقعہ البتہ نہیں ملا تھا۔ اختر حسین تو حرف بہ حرف ان کے اندر کی باتوں کی ترجمانی کر رہے تھے۔

۳۱

مشرقی پاکستان میں غم و غصہ کی ایک لہر چل پڑی تھی۔ کلکتہ میں ہفتوں فساد کا سلسلہ جاری رہا تھا اور کئی ہزار افراد وہاں سے سرحد پار کر کے مشرقی پاکستان کے بہت سے علاقوں میں پھیل گئے تھے۔ ان کے پاس طرح طرح کی کہانیاں تھیں۔ جمشید پور کے اسپات کارخانے اور رانچی کے ہٹیا کارخانے سے منظم قتل و خون کی خبریں آئی تھیں۔ دس میل دور رانچی شہر میں لوگ کئی روز تک عورتوں اور بچوں کی چیخیں سنتے رہے تھے اور جب ہمت کر کے وہاں گئے تھے تو وہاں کچھ بھی باقی نہیں تھا۔ خاک و خون کے سوا۔ ان جگہوں سے بہت سے لوگ بھاگ آئے تھے اور یہاں نان شبینہ کو محتاج تھے۔ تقسیم ہند کا ایک نیا باب پھر کھل گیا تھا اور اس دفعہ مشرق کا راستہ آباد ہوا تھا۔ ڈھاکہ، کومیلا، رنگ پور، سید پور، کھلنا اور چاٹگام وغیرہ

میں ریلیف کیمپ کھل گئے تھے جن کے لیے پورے پاکستان میں چندے جمع کیے جا رہے تھے۔

حامد، جوٹ مل میں اب ایک اچھے عہدے پر آگیا تھا۔ ہندوستان وہ بہت پابندی سے خط لکھتا۔ وہاں سے جواب یا تو بی بی صاحبہ دے دیتیں یا پھر اماں کسی سے لکھوا بھیجتیں۔ اختر حسین نے اس کو کبھی کوئی خط نہیں بھیجا تھا۔ حامد نے یہ سوچ رکھا تھا کہ وہاں سے خط آئے یا نہ آئے، اسے ہر ہفتہ خط لکھتے رہنا ہے۔ آنے جانے والوں کی معرفت روپے اور سامان بھی بھیجتا رہتا۔ اسے جانے کی خواہش بھی ہوتی لیکن اس میں قباحت یہ تھی کہ اُسے پاسپورٹ بنوانا پڑتا، ویزا حاصل کرنے کے لیے چکر لگانے پڑتے۔ ان کاموں کے لیے اس کے پاس وقت بھی نہیں تھا۔ دوسرے وہ اپنی زندگی کے اس باب کو پھر کھولنا نہیں چاہتا تھا۔

چاموں ایک دفعہ ڈھاکہ آیا تو بدرالاسلام نے اُسے حامد کا ماموں سمجھ کر اس سے نازیہ سے حامد کے رشتے کی بات کی۔ بعد میں چاموں نے حامد کو تنہائی میں سمجھایا کہ اُسے اس موقع کو ضائع نہیں کرنا چاہیے۔ بدرالاسلام بہت بڑے آدمی ہیں اور پھر اُس پر ان کے احسانات بھی ہیں، ان سے قربت اسے آئندہ بھی بہت کام دے گی۔ یوں ان کو اچھے اچھے لڑکوں کی کمی نہیں لیکن وہ حامد کی شرافت اور نیکی سے متاثر ہیں وغیرہ وغیرہ ——— حامد یہ سب سن کر گھبرا گیا۔ یہ ضرور ہے کہ وہ اپنی مرضی سے پاکستان چلا آیا تھا اور نازیہ کے لیے اپنے دل میں ایک نازک گوشہ بھی محسوس کرنے لگا تھا لیکن اس کے اندر کوئی مضبوط ڈور تھی جو اسے اپنے گھر اور خاندان سے باندھے ہوئے تھی اس نے سوچا بھی نہیں تھا کہ وہ اپنی شادی کے مسئلے پر خود ہی غور کرے گا۔ اسے تو ان لوگوں کو دیکھ کے حیرت ہوتی جو سب کو بھول کے، اپنی مرضی سے یہاں شادیاں کر کے بہت ہی خوش و خرم تھے اور اپنے گھر والوں سے انہوں نے گویا رشتہ ہی منقطع

کرلیا تھا۔ اس نے گھبرا کے چامو سے انکار کر دیا۔ لیکن چامو نے اپنے قیام کی مدت ڈھاکہ میں بڑھالی اور حامد سے روز وہی باتیں کرنے لگا۔

حامد چپ چاپ اس کی باتیں سنتا رہتا۔ اس کی سمجھ میں نہ آتا کہ وہ چامو کو کیا کہے۔ وہ انکار کرتا تھا تو چامو پر اس کا کوئی اثر ہی نہیں ہوتا تھا۔ اپنا پرایا بھی نزدیک نہیں تھا جس سے صلاح مشورہ کیا جاتا۔ ایک عظیم الدّین تھے سو انہوں نے اپنے تعلّقات ہی توڑ لیے تھے۔ شہناز اس فوجی بنگالی کے ساتھ پنڈی بھاگ گئی تھی جو ٹرانسفر پر ڈھاکہ سے جا رہا تھا۔ پنڈی پہنچنے پر اس نے اپنے نکاح نامے کی نقل اپنے گھر بھجوادی تھی جس پر ڈھاکہ ہی کی ایک مسجد کی مُہر اور دو گواہوں کے دستخط تھے عظیم الدّین کے گھر میں ماتم برپا ہوا تھا جو کسی کی اچانک موت پر ہوتا ہے۔ تعلّق کے سبھی لوگ انہیں پرسہ دینے گئے تھے۔ حامد کو یہ خبر ملی تھی لیکن وہ ان کے پاس نہیں گیا تھا۔ اسے شہناز کی دلیری اچھی لگی تھی، اگرچہ اس نے عظیم الدین کو مبارکباد بھی دینے کی ہمّت نہیں کی تھی۔ عظیم الدین نے اس بات پر اس سے ناتہ ہی توڑ لیا تھا۔

تھک ہار کے حامد نے چامو سے کہہ دیا کہ وہ اس وقت تک شادی نہیں کر سکتا جب تک کہ اسے اختر حسین کی اجازت نہ مل جائے، اگر وہ ان کی اجازت منگوا دے تو پھر اسے کوئی عذر نہیں۔ چامو نے اس سے اجازت دلوانے کا وعدہ تو کر لیا تھا ساتھ ہی اس نے حامد کو یہ بھی یاد دلایا تھا کہ جب وہ اپنے مستقبل کی بہتری کے لیے جان جوکھم اٹھا کے یہاں آیا تھا تو اس وقت اس نے کسی کی اجازت کی ضرورت محسوس نہیں کی تھی

حامد چپ چاپ سر جھکا کے اس کی بات سنتا رہا۔ چامو کی باتیں اس کے ذہن و دل میں ایک ایک کر کے اترتی تھیں۔ وہ اس کی باتوں کی سچائی اور تجربے کا بہت پہلے سے قائل تھا۔ وہ تو اندر سے چامو کی تجویز سے سو فی صد متّفق تھا لیکن جب چامو نے اجازت دلوانے کا وعدہ کر ہی لیا تھا تو پھر خود فیصلہ کرنے کی ذمّہ داری سے

اس نے اپنے آپ کو بری کر لیا تھا۔ کوئی ہفتہ دس دن کے بعد چامو نے حامد کو اختر حسین کا اپنے نام خط دکھایا کہ حامد اگر اپنے مستقبل کے سلسلے میں کوئی فیصلہ کرتا ہے تو انہیں اس پر کوئی اعتراض نہیں۔ وہ بس یہ چاہتے ہیں کہ وہ جہاں رہے، خوش رہے اور جینے کا سلیقہ سیکھے۔

اس خط نے حامد کے لیے خوشیوں کے دروازے کھول دیے۔ نازیہ اُسے بہت اچھی لگتی تھی اور نازیہ سے جدائی کا تصور بھی اس کے لیے جان لیوا تھا۔ لیکن چونکہ وہ اتنی دور آ کر بھی اپنے گھر سے اکھڑ نہیں سکا تھا اس لیے وہ بار بار اپنے ماں باپ اور گھر والوں کے پاس پہنچ جایا کرتا۔ اس نے جب چامو سے انکار کیا تب اندر سے اس کے خون کی بوند بوند اس کے انکار کی جھٹلاتی رہی۔ وہ سوچتا تھا کہ اگر نازیہ سے اس کی شادی نہ ہو سکی تو پھر وہ کرے گا کیا ——— چامو کے دیے ہوئے خط کو اس نے سیکڑوں بار پڑھا، وہ بار بار چامو سے اس کے بارے میں دریافت کرتا یہاں تک کہ جواب دیتے دیتے چامو جھنجھلا گیا۔ دراصل حامد کو یہ تعجب تھا کہ اختر حسین نے اتنی آسانی کے ساتھ اسے سبز جھنڈی کیسے دکھا دی تھی۔ وہ تو ان کے ڈر سے ہندوستان کا راستہ ہی بھلا چکا تھا۔ وہ بار بار اختر حسین کے خط کو پڑھ کے اس خوشی کو اپنے ہاتھوں سے چھونا چاہتا تھا جو اچانک اس کی جھولی میں آگرا تھا۔

بدرالاسلام نے جب چامو سے حامد کے سلسلے میں بات کی تھی تو ان کے ذہن میں یہ ہرگز نہیں تھا کہ اپنے خاندان کی اجازت کے بغیر حامد کا داماد بن جائے۔ وہ چاہتے تھے کہ چامو اس سلسلے میں پہل کرے اور سب کی مرضی خوشی سے یہ کام انجام پا جائے۔ چامو نے حامد سے کیا کیا باتیں کیں اور چامو نے حامد کے باپ کی اجازت کیسے حاصل کی، انہیں ان سب باتوں کی کوئی خبر نہیں تھی۔ چامو نے جب یہ خبر دی کہ حامد کے باپ کو یہ رشتہ پسند ہے تو انہیں بہت خوشی ہوئی۔ انہوں نے اختر حسین

کا خط دیکھنے کی ضرورت بھی محسوس نہیں کی۔ ظاہر ہے کہ یہ بات چامو نہیں بلکہ ثمین اللہ کہہ رہا تھا جو حامد کا سگا ماموں تھا۔ چامو ہی کے کہنے پر انہوں نے شادی کی تیاریاں شروع کر دیں۔ ان کے یہاں شادی بیاہ کی رسم سادگی سے انجام پاتی تھی۔ دوسری طرف یہاں حامد کا بھی کوئی نہیں تھا سوائے چامو کے اور چند دوستوں کے، سو بڑی سادگی سے یہ تقریب انجام پا گئی۔

حامد ابھی تک بدر الاسلام ہی کے بنگلہ میں مقیم تھا۔ شادی کے بعد اس نے اپنے فلیٹ جانے کا ارادہ ظاہر کیا تو بدر الاسلام خاموش رہے۔ حامد سے وہ کہہ بھی کیا سکتے تھے، یہ تو حامد کو بھی پتہ تھا کہ اُن ساری جائداد کی جس میں یہ بنگلہ بھی شامل تھا تنہا وارث نازیہ ہی تھی۔ حامد نے ان کی خاموشی کو نیم رضامندی سمجھا اور فلیٹ میں جانے کی تیاریاں شروع کر دیں۔

اب حامد کے لیے ایک نئی مصیبت آکھڑی ہوئی۔ جن لوگوں کو بدر الاسلام نے اس کے فلیٹ میں جگہ دلوا دی تھی، انہوں نے فلیٹ پر قبضہ کر لیا تھا۔ اگر ان میں سے کوئی جوٹ ملز میں نوکر ہو جاتا تب پھر فلیٹ میں رہنے کا جواز نکل آتا، فلیٹ باہر کے لوگوں کو دینا ہی جائز نہیں تھا۔ حامد نے تو محض بدر الاسلام کے کہنے پر چابی ان لوگوں کے حوالہ کر دی تھی۔ وہ لوگ بھی ابھی تک اسی لیے وہاں ڈٹے رہے تھے کہ جوٹ ملز کا منیجر بدر الاسلام کا دوست تھا۔ جب ان لوگوں نے فلیٹ خالی کرنے سے صاف انکار کر دیا تو حامد بہت پریشان ہوا۔ چامو، کلکتہ واپس جا چکا تھا۔ اس نے ساری باتیں بدر الاسلام سے صاف صاف بتا دیں۔ وہ یہ سب سن کے گہری سوچ میں پڑ گئے۔ حامد اگر ان کے بنگلہ میں رہتا تو کوئی حرج نہیں تھا۔ اب تو وہ ان کا داماد بھی بن چکا تھا۔ اس کا ان کے گھر پر پورا حق تھا۔ لیکن حامد کی خواہش تھی کہ وہ الگ رہے تو وہ بھی خاموش رہے تھے۔ مگر اب تو ایک نیا مسئلہ کھڑا ہو گیا تھا۔ کچھ دیر سوچنے کے بعد وہ بولے۔

"دیکھو بیٹے ـــــــ فلیٹ خالی کرانا کوئی مشکل کام نہیں۔ آدم جی جوٹ ملز کے ہاتھ بہت لمبے ہیں۔ لیکن کیا یہ مناسب ہوگا کہ ان خانماں برباد لوگوں کو ایک بار پھر اُجڑنے پر مجبور کیا جائے ـــــــ؟"

"دیکھیے انکل ـــــــ" حامد شروع ہی سے انہیں انکل ہی کہتا آرہا تھا ـــــــ "بنیادی طور پر وہ فلیٹ جوٹ ملز کا ہے جو اس نے مجھے ایک نوکر کے طور پر دیا ہے۔ یہ تو مہربانی ہے کہ انہوں نے اس سلسلے میں مجھ سے کوئی بازپرس نہیں کی۔ اب اگر وہ لوگ فلیٹ خالی نہیں کرتے ہیں تو کیا اس سے میری نوکری پر کوئی آنچ نہیں آئے گی ـــــــ؟"

"آنچ تو خیر نہیں آئے گی ـــــــ اگر تم چاہو تو یہ فلیٹ انہیں لوگوں کے نام الاٹ کرادوں ـــــــ؟"

"بھلا وہ کیسے ـــــــ؟ اور پھر میرا کیا ہوگا ـــــــ؟"

"تمہیں دوسرا فلیٹ مل جائے گا اور اس فلیٹ سے بہت اچھا۔ میں ان کے ایک آدمی کو جوٹ ملز میں ملازم رکھوادوں گا اور پھر فلیٹ ان کے نام الاٹ ہو جائے گا۔ بیٹے حامد، یہ لوگ ہندوستان سے لُٹ پِٹ کر آئے ہیں۔ ان کی آس اور امیدوں پر پانی نہیں پھرنا چاہیے۔"

حامد، بدرالاسلام کا منہ تکتا رہ گیا۔ وہ بہت سے لوگوں سے ملا تھا لیکن اسے بدرالاسلام جیسا کوئی آدمی اب تک نظر نہیں آیا تھا۔ وہ ایک مخلص اور بے لوث انسان تھے، غرور ان کو چھو کر نہیں گیا تھا۔ وہ لوگوں کے اس طرح کام آتے جیسے ان کی زندگی کا یہی مقصد ہو۔ سیکڑوں مہاجرین کی انہوں نے مدد کی تھی، انہیں نوکری اور رہائش دلائی تھی اور اب بھی ان کی مدد پر مستعد تھے۔ یہ الگ بات تھی کہ مہاجرین اپنی موجودہ حالت سے ہرگز مطمئن نہ تھے، وہ تو یہ سمجھتے تھے کہ ـــــــ

جب وہ اپنا گھر بار، وطن، جائداد، چھوڑ کے آئے ہیں تو انہیں ہاتھوں ہاتھ لیا جائے گا یہی وجہ تھی کہ وہ کسی کے احسان کا نام بھی نہیں لیتے تھے۔ اور اگر ان کے پاس کچھ تھا تو ان کا کہنا تھا کہ یہ سب انہوں نے یہاں اپنے قوّت بازو سے حاصل کیا ہے۔ بدرالاسلام سے حامد کی جو گفتگو ہوئی، اس کے بعد پھر وہ ایک لفظ بھی نہ کہہ سکا۔

کچھ دنوں کے بعد بدرالاسلام نے اسے خبر دی کہ جوٹ ملز میں اس کی ترقی ہو گئی ہے اور اسے ایک شاندار فلیٹ الاٹ ہوا ہے۔ اب اگر وہ چاہے تو وہاں جا سکتا ہے۔ بہاریوں کو بھی وہ فلیٹ مل چکا تھا۔ حامد فلیٹ دیکھنے گیا تو اسے محسوس ہوا کہ وہاں تو ضرورت کی ہر چھوٹی بڑی چیز موجود تھی، انہیں کچھ لانے کی ضرورت ہی نہیں تھی چنانچہ وہ لوگ جب اپنے فلیٹ میں منتقل ہوئے تو ان کے ساتھ کپڑوں کے چند ٹرنک، نازیہ کا ستار ہارمونیم اور ٹیگور اور نذرالاسلام کے گیتوں کے ترجمے تھے اور بس۔ حامد کو گھر یلو کام کاج کے لیے ایک نوکر بھی ملا تھا۔ حامد بہت خوش تھا۔ اس نے اتنی اونچی اڑان ہرگز نہیں بھری تھی، جہاں وہ پہنچ گیا تھا۔ نازیہ ایک قابل رشک بیوی ثابت ہوئی تھی۔ زندگی کے بارے میں اس کا تصوّر بہت ہی فنکارانہ اور نازک تھا۔ حامد اس کے مقابلے میں ایک سیدھے سادے نقطۂ نظر کا مالک تھا۔

کلکتہ، جمشید پور اور رانچی کے فساد زدگان کی امداد کے لیے ایک ایسٹ پاکستان رلیف کمیٹی بنی تھی جس کا حامد بھی ایک سرگرم ممبر تھا۔ لاکھوں روپے جمع کیے گئے، جن سے کمبل، دوائیں، کپڑے، جوتے اور مختلف سامان خرید کر مہاجرین میں تقسیم کیے گئے تھے۔ سب سے بڑا مسئلہ ان کی زندگی کی ازسرِ نو تشکیل کا تھا۔ موسم میں ٹھہراؤ آچکا تھا اور سب لوگ ایک ڈھرّے پر اپنی زندگی کی چرخی کو گھمانے میں مشغول تھے، ایسے میں نئے مہاجرین کے لیے مشکلات کا سامنا تھا۔ یوں تو نئے لوگوں کے آنے کا سلسلہ برسوں سے جاری تھا لیکن جب آٹے میں نمک مل جاتے تو دیکھنے والوں کو پتہ بھی نہیں چلتا۔ حالانکہ

نئے مہاجرین کے پاس ایسی ایسی کہانیاں تھیں جنہیں سن کر رونگٹے کھڑے ہو جاتے۔

حامد روز ہی ریلیف کیمپ کے چکر لگا آتا۔ اس کی طرح اور بھی بہت سے لوگ وہاں آتے۔ جو کہانیاں حامد سن چکا تھا، وہ اب روز دوسروں کو سنتے دیکھتا۔ ایک ریلیف کیمپ میں اس کی ملاقات ایک پرانے دوست سے ہو گئی جو بہار شریف میں اسکول سے لیکر کالج تک اس کے ساتھ رہا تھا۔ بی۔اے کرنے کے بعد اس نے چائے کی پتی کی ایک چھوٹی سی دوکان کھول رکھی تھی جہاں اکثر حامد کا اٹھنا بیٹھنا ہوتا اس کو اچانک یہاں دیکھ کے حامد کو حیرت بھی ہوئی اور خوشی بھی۔

"ارے یار، تم یہاں کہاں ——— ؟"

"میں تو بہت دنوں سے یہاں آنے کی کوشش میں تھا لیکن موقع نہیں مل رہا تھا۔ اب مہاجرین میں شامل ہو کے چلا آیا ہوں۔"

"اور تمہاری وہ دوکان ——— ؟"

"وہ دوکان تو چھوٹے بھائی کو دے دی۔ بی۔اے کے بعد وہ بھی بیکار تھا۔"

"تو ایک دوکان اور کھول لیتے ——— دوکان تو تمہاری خاصی چل رہی تھی۔"

"نہیں یار ——— تم تو جانتے ہو کہ ہندوستان میں مسلمانوں کی کیا حالت ہو رہی ہے۔ خرید و فروخت میں بھی ہندو مسلمان دیکھا جاتا ہے۔ مقابلہ میں آنا مسلمان کے لیے بہت مشکل ہے۔"

"ہاں، وہ تو ٹھیک ہے لیکن یہاں بھی حالت کوئی اچھی نہیں ہے، بس ایک انار سو بیمار والی بات ہے۔"

"کم از کم، یہاں یہ تو ہوگا کہ جان کی حفاظت رہے گی اور پھر اپنے لوگوں کے درمیان رہنا ہے۔"

"شرط صرف یہ ہے کہ آدمی جہاں جائے وہاں کی مٹی کی بو باس اپنے اندر محسوس کرے، لیکن ہوتا یہ ہے کہ ایک مٹی کی بو باس بھلا دینے کے بعد آدمی اپنے آپ کو ہر جگہ اکھڑا اکھڑا سا محسوس کرتا ہے، یہی وجہ ہے کہ وہ پھر ایک اجنبی ملک کا انجان شہری بن کر رہ جاتا ہے۔"

"یار تم سے ایک بات کہوں ــــــــ؟"

"کہو ــــــــ میں تمہارا وہی یار ہوں، صاف صاف بتاؤ۔"

"میں نے یہاں سب کو یہی کہانی سنائی ہے کہ رانچی کے فساد میں لٹ لٹا کر آیا ہوں۔ کہیں ایسا نہ ہو کہ تم میری سچی کہانی سنا ڈالو۔"

حامد یہ سن کر گم صم ہو گیا۔ اس نے یہاں بہت سی ایسی کہانیاں سنی تھیں جن پر یقین کرنے کو اس کا جی نہیں چاہا تھا ــــــــ اس نے اپنے دوست سے وعدہ کر لیا کہ وہ اسے ہمیشہ رانچی کا فساد زدہ ہی سمجھتا رہے گا۔ وہ کوئی فکر نہ کرے۔

۳۲

فیاض ماہرِ نفسیات کے ہاں سے واپس آگیا تھا۔ اب وہ زیادہ تر چُپ ہی رہا کرتا اور لیکن بولتا تو بہت بے عقلی کی بات نہ کرتا۔ اختر حسین نے اس کے لیے بجلی کے سامان کی ایک چھوٹی سی دکان کھول دی تھی۔ ایک باقاعدہ نوکر رکھ دیا تھا جو دکان اور سامان کے ساتھ ساتھ فیاض کی دیکھ بھال بھی کرتا۔ فیاض

دن بھر دوکان ہی پر بیٹھا رہتا۔ اس کا کھانا دوکان ہی پر آجاتا۔ روز پندرہ بیس
روپئے کی بکری ہو جاتی۔ حامد کے خط برابر آتے جن سے یہ ظاہر ہوتا کہ وہ وہاں بہت
ہی خوش ہے۔ چامو نے ڈھاکہ سے خاص طور پر ایک آدمی کو بھیج کر اختر حسین سے
حامد کی شادی کی اجازت منگا بھیجی تھی اور انہوں نے اجازت دے دی تھی لیکن پتہ
نہیں کیوں، گھر میں کسی سے اس کا ذکر نہیں کیا تھا یوں بھی وہ گھر میں حامد کے بارے
میں بہت کم باتیں کرتے۔ ساجد بہار شریف کے نالندہ کالج سے فرسٹ کلاس
میں بی۔اے کرنے کے بعد مقابلے کے امتحان میں بیٹھا اور آئی۔اے۔ایس میں کامیاب
ہوگیا۔ ٹریننگ کے بعد اس کی پوسٹنگ بھی ہوگئی تھی اور وہ چمپارن کے ایک
سب ڈویژن میں ایس۔ڈی۔او تھا۔ اختر حسین نے خالدہ کی شادی کر دی تھی، لڑکا
ڈاکٹر تھا اور عرب میں کام کرتا تھا۔ شادی کے بعد خالدہ کو بھی وہ عرب لے گیا تھا۔
اختر حسین یوں تو کچہری جاتے مگر عمر کے تقاضے کے ساتھ ساتھ ان کی وکالت میں بھی
اب وہ بات نہ رہی تھی۔ لیکن ان کے پاس وقت گزاری کا اس سے بہتر اور کوئی دوسرا
ذریعہ بھی نہیں تھا۔ سیاست سے وابستگی تھی مگر صرف نام کی۔ اس میں اب بے شمار
لوگ آگئے تھے اور اتفاق یہ کہ کوئی بھی بدحال نہ تھا۔ سیاست ایک دودھ دینے والی
گائے تھی جس کے پیچھے مُچکّالے کے سبھی دوڑے پھرتے تھے۔ اختر حسین ان لوگوں میں
تھے جو گائے کی سیوا کرنے پر تو کمر بستہ رہتے لیکن اس سے دودھ حاصل کرنے کے آرٹ
سے واقف نہیں تھے، اس لیے وہ تلچھٹ کی طرح خود ہی کنارے آلگے تھے۔ انہیں کسی نے
دودھ کی مکھی کی طرح نکال نہیں پھینکا تھا، رائے مشورہ کے لیے اب بھی لوگ ان کے
پاس آجاتے۔ کبھی کبھار کوئی لیڈر یا منسٹر شہر آدھمکتا تو ضلع کمیٹی کی طرف سے انہیں
شرکت کی دعوت ضرور ملتی۔

اصغر حسین کے گونگے بیٹے نثار نے کپڑا کاٹنے میں کافی مہارت حاصل کرلی۔

گھر بھر کے لوگ اسی سے اپنے کپڑے سلواتے۔ باہر کے لوگ بھی آنے لگے تھے۔ اس نے باہر ہی کے ایک کمرے میں مشین اور دوسرا ساز و سامان رکھ لیا تھا۔ بی بی صاحبہ کافی ضعیف ہو چکی تھیں، پھر بھی ان کی پھرتی برقرار تھی۔ صبح میں وہ نماز اور تلاوت سے فارغ ہو کے باورچی خانہ میں اپنی مخصوص پیڑھی پر جاکر بیٹھ جاتیں۔ ناشتہ عموماً انہیں کی نگرانی میں تیار ہوتا اور سب کا حصہ وہ اپنے ہاتھوں سے لگاتیں۔ وسیم اور شمیم جب اپنی اپنی فیملی کے ساتھ آجاتے تو ان کے لیے باورچی خانہ ہی کے دالان میں فرش لگا دیا جاتا۔ اختر حسین کا ناشتہ اور کھانا البتہ سینی میں سجا کر باہر بھیجا جاتا۔ اختر حسین کی بیوی کا گھر کے معاملات میں کوئی دخل نہیں تھا، وہ اپنی ماں کا ہاتھ بٹاتی رہتیں اور جس کام میں لگا دیا جاتا، اس میں جٹی رہتیں۔ سرور حسین کی بیوی دیوار کے اس حصہ میں اپنی الگ تھلگ زندگی گزار رہی تھیں۔ جب کبھی ان پر دورہ پڑتا تو ان کے چیخنے چلاّنے رونے پیٹنے کی آوازیں سنائی دیتیں۔ اس وقت سب لوگ چُپ چُپ سے ہوتے۔ وہ کسی سے نہیں ملتی تھیں۔ ہفتہ دس روز میں اختر حسین ان کے پاس جاتے اور ضرورت کے پیسے دے آتے۔ پاکستان سے سرور حسین اور اختر حسین کے خط برابر آتے رہتے۔ حامد کا تو ہفتہ میں ایک خط ضرور آتا۔ اصغر حسین کے بچے اب بڑے ہو چکے تھے، ایک لڑکا عرب چلا گیا تھا، بقیہ کراچی میں انگریزی کالجوں میں پڑھ رہے تھے۔ ان لوگوں کی تصویریں اختر حسین نے بھیجی تھیں جنہیں فریم کرا کے باہر کے کمرے میں رکھ دیا گیا تھا۔ تصویروں میں وہ سب ہندوستانی ہرگز نہیں لگتے۔

۱۹۶۵ء کی ہند و پاک جنگ کے بعد خط و کتابت کا سلسلہ بھی مہینوں بند رہا۔ ہندوستان کے مسلمان تو عجیب مصیبت میں پڑے تھے۔ ان کے رشتہ دار پاکستان میں تھے، ان کے خطوط آتے رہتے اور اس طرح ان کا پاکستان سے ایک دور کا رشتہ بنا رہتا۔ اس بنا پر وہ اپنے ملک میں شک و شبہ کی نگاہوں سے دیکھے جانے لگے تھے۔

موضوع پر موقع ان کا دفاع کرنے والے جواہر لال نہرو دنیا سے جا چکے تھے۔ اب مسلمانوں پر جو الزامات لگائے جاتے، ان کا جواب دینے والا کوئی نہیں تھا۔ پاکستانی کہہ دینا مسلمانوں کے لیے ایک بہت بڑی گالی بن گیا تھا۔ مسلمان اس گالی پر اس طرح مشتعل ہو جاتے کہ دیکھنے والے کو ہنسی آجاتی اور گالی دینے والوں کو گالی دینے میں مزا آنے لگتا۔ ملک میں پاکستانی ایجنٹ پکڑے جاتے اور جب ان کے نام اخباروں میں شائع ہوتے، جو مسلمانوں کے نام نہ ہوتے تو، اس وقت مسلمانوں کی خوشی اور جوش و خروش دیکھنے کے لائق ہوتا۔

اختر حسین اس روز صبح ہی صبح بین جانے والے تھے۔ رکشہ لانے کے لیے نوکر جا چکا تھا کہ اچانک پولیس کی ایک جیپ اندر داخل ہوئی۔ اس کے پیچھے پیچھے پولیس کی کئی گاڑیاں اندر داخل ہوئیں۔ پولیس کی اتنی گاڑیوں کو بین ہاؤس میں جاتے دیکھ کر سڑک کے مسافر بھی ٹھٹک گئے، اور بہت سے لوگ تماشہ دیکھنے کے لیے دروازے پر جمع ہو گئے۔ اختر حسین ابھی صورت حال کو ٹھیک سے سمجھ بھی نہ پائے تھے کہ اگلی جیپ سے ڈی ایس پی اور ایک مجسٹریٹ اترے اور انھوں نے اختر حسین کو کنارے لے جا کے کہا کہ سی بی آئی کو کسی نے اطلاع کر دی ہے کہ یہاں کوئی ٹرانسمیٹر نصب ہے جہاں سے پاکستان کو یہاں کی خبریں بھیجی جاتی ہیں، اس لیے ہم لوگ سرکار کے حکم پر مکان کی تلاشی کا وارنٹ لے کے آئے ہیں، ایک ذمّہ دار شہری ہونے کے ناتے آپ اس کام میں مدد فرمائیں ـــــــــــ

اختر حسین یہ سُن کر سَن سے رہ گئے۔ آج تک اس گھر پر کسی نے انگلی نہیں اٹھائی تھی۔ آج بات اس حد تک بڑھ گئی کہ پولیس تلاشی کا وارنٹ لے کر آگئی۔ یہ ضرور ہے کہ اس گھر کے بہت سے افراد پاکستان چلے گئے تھے اور ان سے رشتہ بھی برقرار تھا کیونکہ رشتہ بنانا اور توڑنا، کسی ملک کے بس ہی میں نہیں ہے لیکن اتنا بڑا الزام۔

وقت کچھ سوچنے سمجھنے کا نہیں تھا۔ انہوں نے اندر جا کر بی بی صاحبہ اور سب عورتوں کو ایک کمرہ میں آجانے کو کہا اور پولیس نے بقیہ حصّوں کی تلاشی کا کام شروع کر دیا۔ انہوں نے گھر کا کونا کونا چھان مارا، جہاں جہاں انہیں کچھ شک سا لگا، وہاں کی دیواریں تک انہوں نے کھرچ دیں، ایک ایک کپڑے کو انہوں نے الٹ پلٹ کے دیکھا مرغی کے ڈربے تک کو اکھاڑ پھینکا۔ آخر میں انہوں نے اس خالی کمرے کو بھی دیکھنا چاہا جہاں کوئی سامان نہیں تھا، صرف عورتیں جمع تھیں۔ عورتیں دوسرے کمرے میں چلی گئیں۔ اس کمرے کو بھی انہوں نے سونگھ کر دیکھا۔ تقریباً پانچ گھنٹوں کی کاوش کے نتیجے میں ان کے ہاتھوں میں پاکستان کے دونوں حصّوں سے آئے ہوئے خطوط کے علاوہ اور کچھ بھی ہاتھ نہ آیا جنہیں وہ اپنے ساتھ لیتے گئے۔

اختر حسین سارے عرصے میں باہر بیٹھے اخبار پڑھتے رہے۔ بین ہاؤس کی تلاشی کی خبر جنگل کی آگ کی طرح سارے شہر میں پھیل گئی اور ہمدردوں، جانکاروں کی آمد شروع ہو گئی۔ عدم تحفّظ کا احساس اچانک شدید ہو کر ابھر آیا۔ ہر آدمی اپنی جگہ پر خود کو غیر محفوظ سمجھنے لگا۔ اختر حسین تو گم صم ہو کے رہ گئے تھے۔ ہوا کچھ نہیں تھا، پولیس شرمندہ ہو کر یہاں سے گئی تھی۔ لیکن گھر کا وہ جس میں کچھ بھی پوشیدہ نہیں تھا ایک بھرم کے سوا، سو وہ طشت از بام ہو گیا تھا۔ کوئی ایسی چیز باقی نہیں بچی تھی جس پر کج کلاہی برقرار رکھی جا سکتی۔ تلاشی لینے والے جا چکے، پُرسہ دینے والے بھی اپنے گھروں کو سدھارے لیکن اختر حسین کو ایسا لگ رہا تھا جیسے بین ہاؤس کی پھیلی ہوئی اور شیخ الطاف حسین کے زمانہ سے کھڑی دیواروں میں ہزاروں، لاکھوں چھید ہو گئے ہوں اور ہر چھید سے ایک ایک آنکھ لگی اندر جھانک رہی ہو، کوئی دم ہو گا جب چھیدوں سے جھانکتی ہوئی آنکھیں اندر آجائیں گی، پھر سب کچھ ختم ہو جائے گا۔ برسوں کی جمی جمائی ساکھ، قربانیوں سے لبریز عزت اور وطن دوستی سے معمور دل۔

اختر حسین نے اس حادثہ کے بعد باہر نکلنا چھوڑ دیا۔ ان کے دوست آتے تو وہ گفتگو میں بہت کم حصّہ لیتے۔ اجودھیا بابو کو بین ہاؤس کی تلاشی پر بڑا غم و غصّہ تھا۔ وہ پٹنہ جاکر چیف منسٹر سے ملے اور ان سے پولیس کی اس حرکت کی شکایت کی۔ چیف منسٹر نے بھی اس واقعہ پر اظہارِ افسوس کیا اور اپنی بے بسی ظاہر کی کہ معاملہ ریاستی حکومت کا نہیں، مرکز کا بلکہ سی بی آئی کا تھا۔ انہوں نے اختر حسین کو معذرت کا خط بھی لکھا۔

اختر حسین اس قسم کے واقعات سنتے رہتے تھے۔ اردو اخبارات کی جان یہی خبریں تو تھیں، وہ ان پر بہت کچھ سوچتے بھی رہے تھے لیکن خود بھگتنے کا تجربہ ان کا بالکل نیا تھا۔ سُننے اور بھگتنے میں کیا فرق تھا، وہ اس کرب کو اب محسوس کر رہے تھے۔ ساجد کو تلاشی کی خبر ملی تو وہ رخصت لے کر آگیا۔ اس نے بہت ضد بھی کی کہ اختر حسین اور سب لوگ کچھ دنوں کے لیے اس کے ساتھ چمپارن چلیں۔ لیکن اختر حسین اس کے لیے تیار نہیں ہوئے۔ شاید کوئی دوسرا موقعہ ہوتا تو وہ جانے کو تیار ہو سکتے تھے لیکن اب تو وہ اپنی وجہ سے ساجد کی نوکری کو خطرے میں نہیں ڈالنا چاہتے تھے۔

۳۳

حامد بہت دنوں سے دیکھ رہا تھا کہ پورے مشرقی پاکستان میں ایک بے نام سی بے چینی پھیلی ہوئی ہے۔ لوگ بہت پڑھے لکھے نہیں تھے۔ لیکن سوجھ سمجھ میں کسی سے کم نہیں تھے۔ پاکستان کا یہ حصّہ آبادی اور رقبہ کے اعتبار سے مغربی حصّہ سے بہت بڑا تھا لیکن قومی حکومت میں ان کا بہت دخل نہیں رہا تھا۔ اگرچہ کئی بنگالی پاکستان

کے وزیر اعظم ہو چکے تھے لیکن بیورو کریسی پر چونکہ مغربی حصّہ حاوی تھا اس لیے وہ لوگ اپنی مرضی سے کچھ نہیں کر سکتے تھے۔ ملک میں بہت دنوں سے فوجی حکومت کا قیام تھا جس نے اب تک کئی رنگ بدلے تھے۔ فوج میں بنگالی شروع ہی سے کم تھے اس لیے وہ اقتدار میں اور بھی نزدیک نہیں رہ سکتے تھے۔ مغربی پاکستان کا ہر طرف بول بالا تھا۔ بنگالیوں کو شکایت تھی کہ ان کے ہاں جو بھی پیدا ہوتا ہے وہ سب مغرب والے لے جاتے تھے اور مشرق کا بھوکا پیٹ خالی رہ جاتا تھا۔

جوٹ ملز میں بہت سے لوگ سیاست پر گفتگو کرتے۔ حامد کو ان کی باتیں پلّے نہیں پڑتیں لیکن وہ ان کا مطلب تو نکال ہی لیتا۔ ان کی باتوں کا لب ولباب یہ تھا کہ مشرقی پاکستان میں جوٹ بہت زیادہ مقدار میں پیدا ہوتا، چاول پیدا ہوتا، مغرب والے یہ سب اپنے ہاں لے جاتے۔ فوجی حکومت نے ان باتوں میں مصروف لوگوں کی نقل و حرکت پر پابندی ضرور لگا رکھی تھی لیکن لوگ اس کی سخت حکمت عملی کو خوب سمجھتے تھے۔ ایک فوجی حکومت گئی دوسری آگئی۔ پہلی نے اگرچہ اپنی وراثت کو برقرار رکھنے کی کوشش کی تھی لیکن دوسری حکومت زیادہ عقل مند ثابت ہوئی۔ شاید وہ وراثت کے مسئلے کو زیادہ بہتر طور پر سمجھتی تھی۔ اس نے عوام کو ان کا حق دینے کی کوشش کی۔ اس کوشش میں وہ چیز ابھر کر سامنے آگئی جسے برسوں سے دبا کر رکھا گیا تھا۔ الیکشن ہوا تو مغرب اور مشرق کے خیالات میں آسمان و زمین کا فرق تھا۔ اس کے نتیجہ میں بنگالیوں کا قومی حکومت پر قبضہ ہونے کا اندیشہ پیدا ہوا۔ فوجی حکمرانوں نے اس کا وعدہ بھی کر لیا لیکن اس وقت مغرب کے گھاگ سیاستداں حرکت میں آگئے۔ فوجی حکمرانوں کو انہوں نے سمجھایا کہ بنگالیوں کو حکومت دینے کی غلطی کبھی مت کرنا، وہ سارے ملک میں افراتفری پھیلا دیں گے اور گن گن کے سب سے بدلہ لیں گے، مہاجروں کو سمجھایا کہ یہ بنگالی تمہیں ایک ایک

کر کے نکال باہر کریں گے۔ اس لیے تم وہی کرو جو ہم کہتے ہیں۔ مہاجر تو ان کی آواز پر لبیک کہنے کو تیار رہی تھے۔ انہوں نے یوں بھی بنگالیوں کو کبھی منہ نہیں لگایا تھا۔ انہوں نے سمجھ رکھا تھا کہ وہ جب بھی چاہیں گے ان لوگوں کو پٹوادیں گے۔ لیکن اب تو پوری حکومت ہی ان بنگالیوں کے ہاتھوں میں جارہی تھی۔

مشرقی پاکستان میں اچانک بہت سے فوجی بھیج دیے گئے، اور وحشیانہ قتل عام شروع ہوگیا۔ مہاجروں نے ان فوجیوں کا خوب ساتھ دیا اور چھپے ہوئے لوگوں تک ان کی نشاندہی کی۔ مقامی اور غیر مقامی کا فرق بہت ہی تلخ حقیقتوں کے ساتھ ابھر کر سامنے آگیا۔ پورے مشرقی پاکستان میں کل کارخانے بند ہوگئے، کھیتوں میں کام رک گیا۔ آفسوں اور دفتروں کا کام بھی ٹھپ ہوجاتا لیکن وہاں فوجی بوٹوں کے سہارے کچھ کام ہوتا رہا۔ آدم جی جوٹ ملز میں جو تالا پڑا تو مہینوں کھلنے کا نام نہ لیا۔ وہاں کام کرنے والوں میں مہاجرین کی تعداد زیادہ تھی اس لیے وہ مقامی لوگوں کے نشانہ پر اول درجہ پر تھا ——————

—————— لیکن جب صورت حال بہت نازک ہوگئی اور درجنوں مہاجرین آدم جی ملز کے احاطہ میں قتل کر دیے گئے تو بدرالاسلام حامد اور نازیہ کو اپنے بنگلے پر آئے۔ ان کے ساتھ ان کے دو بیٹے بھی تھے۔ اسی شام کو حامد کے فلیٹ میں کچھ لوگوں نے آگ لگادی، سارا فلیٹ جل کر خاک ہوگیا۔

سب سے زیادہ خراب حالت نواحی علاقوں کی تھی، جہاں بہت ہی منظم طریقے پر قتل و خون کا کھیل جاری تھا۔ ریلوے، بینک اور سرکاری دفتروں میں اونچے عہدے پر کام کرنے والے بہاریوں کو چن چن کے قتل کر دیا گیا۔ رات میں گاڑی آتی اور انہیں ضروری کام کے بہانہ لے جاتی، پھر ان کا پتہ نہیں چلتا۔ کبھی کبھار کسی کی سڑی گلی لاش مل جاتی تو دفن کر دی جاتی تھی۔ ادھر فوجیوں نے

بنگالیوں پر ظلم و ستم کا بازار گرم کر رکھا تھا۔ ہر بنگالی کو چاہے وہ کتنا بڑا پاکستان کا وفادار کیوں نہ ہو، شک و شبہ کی نگاہوں سے دیکھا جاتا۔ کئی لاکھ سرحد پار کر کے ہندوستان چلے گئے تھے جہاں انہیں ملک بھر میں پھیلا کر ریلیف کیمپوں میں رکھا گیا تھا۔ بنگالیوں نے فوجیوں سے لڑنے کے لیے ایک "مکتی باہنی" بنائی تھی جو سرحدوں پر سرگرم عمل تھی۔ پاکستانی کہتے تھے کہ "مکتی باہنی" کوئی اور نہیں ہندوستان کی فوج ہی ہے جنہیں لنگی پہنا کے ہاتھوں میں ہتھیار دیے گئے تھے۔ ادھر پنجابی، سندھی اور بہاریوں پر مشتمل جو تاجروں کے طبقے تھے وہ ہوائی جہازوں میں بھر بھر کے لاہور اور کراچی جا رہے تھے اور اپنی دولت اور روپے وہاں پہنچا رہے تھے۔ فوجی حکمرانوں کا کہنا تھا کہ وہ بنگالیوں کی اکثریت کو اقلیت میں تبدیل کر دیں گے۔ اس بیان سے بہاریوں میں خوشی کی لہر دوڑ گئی تھی۔ ایسے تاجر جنہیں اس بیان پر ہرگز یقین نہیں آیا تھا، وہ خاموشی سے لاہور، کراچی منتقل ہوتے رہے۔ کمال یہ تھا کہ اتنے لوگ جو مر رہے تھے، ان کا کسی کھاتہ میں اندراج نہیں ہو رہا تھا۔ یوں سب کے مرنے کو بہت نیچا کر کے دکھایا جاتا۔ وقت، مسئلے کو حل نہیں کر رہا تھا۔

حامد بہت پریشان تھا۔ جوٹ ملز کے بند ہو جانے پر وہ بھی بیکار ہو گیا تھا۔ نازیہ اور اس کے گھر والے بھی پریشان تھے۔ بنگالی انہیں طعنہ دیتے کہ انہوں نے ایک بہاری کو اپنا رشتہ دار بنا کے گھر میں رکھ چھوڑا ہے۔ اس وقت نازیہ کی حالت اس مرغی کی ہو جاتی جو چیل کے ڈر سے اپنے بچوں کو پروں کے اندر چھپائے رکھتی ہے۔ بدرالاسلام کی فرم بھی تقریباً بند تھی۔ وہ پتہ نہیں کن چکروں میں دن رات گھر سے غائب رہتے اور جب آتے تو اُن کے چہرے بشرے پر پریشانیاں پکار پکار کے کچھ کہتی تھیں لیکن کوئی انہیں سننے والا، پڑھنے والا نہیں تھا۔

ایک رات وہ بہت دیر سے آئے۔ اس وقت آس پاس بہت چیخ پکار مچی ہوئی تھی

بندوق کی آوازیں اور فوجی گاڑیوں کی گڑگڑاہٹ بار بار سنائی دیتی۔ حامد، نازیہ اور اس کی ماں کی آنکھوں سے نیند کوسوں دور تھی۔ گھر کا صدر دروازہ بند کر دیا گیا تھا۔ پہرہ دار کھلی بندوق لیے چوکس کھڑا تھا۔ آتے ہی انہوں نے حامد کو اپنی اسٹڈی میں بُلا لیا۔

"حامد میاں، تم دیکھ رہے ہو، یہاں کیا حالت ہو رہی ہے۔ میری تو سمجھ ہی میں کچھ نہیں آتا۔ کیا پرسکون جگہ تھی یہ ——— شاید کسی کی بُری نظر لگ گئی ہے یہاں۔"

"انکل کہیں میری وجہ سے آپ لوگوں کو کوئی پریشانی نہ ہو ——— میں ——— میں بہاری ہوں نا ——— !

حامد لڑکھڑا گیا اور اس کی آواز بھرّا گئی۔

"کیسی باتیں کر رہے ہو بیٹے ——— تم جانتے ہو کہ میں نے کبھی بنگالی اور بہاری کا فرق نہیں کیا۔ اگرچہ میں یہ اچھی طرح جانتا ہوں کہ بہاریوں نے مجھے کبھی اپنا نہیں سمجھا۔ میں ہمیشہ ان لوگوں کے کام آتا رہا اور یہ لوگ مجھے دشمن سمجھتے رہے۔"

بدرالاسلام کی آواز میں کرب تھا۔ وہ کرب جوان کے لیے آج تک حامد محسوس کرتا رہا تھا۔

"جانتے ہو حامد بیٹے ——— فوج کی بلیک لسٹ میں میرا نام ہے۔ میرے ایک پنجابی دوست نے، جو فوج کا ایک بڑا افسر ہے، مجھے فون پر یہ بات بتلائی ہے۔"

"انکل کیا کہہ رہے ہیں آپ۔ آپ نے تو بربادِ مہاجرین کے لیے وہ کیا ہے جس کے لیے اُن کی نسل در نسل کو آپ کا احسان مند ہونا چاہیے ——— کیا میں جان سکتا ہوں کہ وہ کون سی وجہ ہو سکتی ہے جس سے آپ کا نام بلیک لسٹ میں آیا ہے۔"

"دیکھو، میں عوامی لیگ کا کبھی ممبر نہیں رہا لیکن حق بات کا ہمیشہ حمایتی رہا ہوں۔ اور اس میں کوئی شک نہیں کہ میں نے عوامی لیگ کو ووٹ دیا ہے۔ دراصل لڑائی ہماری کسی فرقہ سے نہیں، مغربی پاکستان کی اس پالیسی کے خلاف ہے جو ہمیشہ مشرقی پاکستان کا استحصال کرتی رہی ہے۔ جو لوگ ہمیں غلط اور ظالموں کا ساتھی سمجھ رہے ہیں، اُن کے لیے میں دعاگو ہوں اور بس۔"

حامد چُپ چاپ ان کی باتیں سن رہا تھا۔ بدرالاسلام کو اس نے اس قدر جذباتی ہوتے بہت کم دیکھا تھا، عقل کا دامن پھر بھی ان کے ہاتھوں سے نہیں چھوٹا تھا۔

"دیکھو بیٹے، وقت کم ہے، ہو سکتا ہے کہ میں گرفتار ہو جاؤں۔ میں روپوش ہو رہا ہوں۔ نازیہ کی ماں بھی میرے ساتھ ہی جائیں گی کیونکہ میری غیر موجودگی میں وہ لوگ انہیں نہیں چھوڑیں گے۔ تم فوجیوں کی حفاظت میں چلے جاؤ کیونکہ بہر حال تم بھی محفوظ نہیں ہو۔ نازیہ کا کیا ہو گا، یہ تمہیں سوچنا ہے۔"

اس وقت نازیہ دیوار سے لگ کر ان لوگوں کی گفتگو سُن رہی تھی۔ بدرالاسلام کی بات ختم ہوتے ہی وہ سامنے آگئی اور مضبوط لہجے میں بولی۔

"بابا، میرے بارے میں سوچنا کیا ہے۔ جہاں حامد رہیں گے وہاں میں رہونگی۔ میں ایک بیوی بھی ہوں نا۔"

"بیٹا، مجھے تم سے یہی امید تھی۔ اب تم لوگ ایسا کرو آج رات ہی میں بیرک چلے جاؤ، اور بیٹی نازیہ اب تمہیں یہ بھول جانا ہے کہ تم ایک بنگالی ہو۔ ہم لوگ دو گھنٹے کے بعد یہاں سے کومیلا روانہ ہو جائیں گے، ایک گاڑی ہمیں لینے آئے گی۔"

بدرالاسلام کی بیوی بھی وہاں آگئی تھی۔ سب کی آنکھوں میں آنسو تھے۔ کسی کی سمجھ میں نہ آ رہا تھا کہ کون کیسے رخصت کرے۔ کون کیوں کر رخصت کرے۔ رات کی تاریکی کچھ اور گہری ہو گئی تھی۔ کتوں کے بھونکنے کی آوازیں، گولیوں کی آوازیں اور

زخمیوں کی چیخ و پکار اس رات کو قیامت خیز بنانے پر تلی ہوئی تھیں۔ اس وقت دو گاڑیاں کمپاؤنڈ میں داخل ہوئیں۔

"ارے بہت سویرے آ گئے، یہ لوگ ——؟"

بدرالاسلام نے چونک کر گھڑی کی طرف دیکھا۔

دیکھتے ہی دیکھتے فوج کا ایک افسر، چند فوجیوں کے ساتھ اسٹڈی میں داخل ہوا۔ اس کے ہاتھ میں ایک کھلا پستول تھا۔

"مسٹر بدرالاسلام تم اب حراست میں ہو۔ اس لیے بھاگنے کی کوشش مت کرنا۔"

یہ پاکستانی فوجی تھے۔ سبھی لوگ ششدر کھڑے رہ گئے۔ ساری اسکیم الٹی ہو گئی تھی۔ افسر نے پستول بدرالاسلام کی پیٹھ سے لگاتے ہوئے کہا۔

"وطن دشمن کارروائیوں میں ملوث ہونے کی باعث آپ کو گرفتار کیا جاتا ہے۔"

حامد نے آگے بڑھ کے کہا۔

"کیپٹن صاحب ——— میں بہاری ہوں جو آپ کے خیال میں اس وقت ایک محب وطن پاکستانی ہونا چاہیے۔ اگر بدرالاسلام انکل وطن دشمن ہو سکتے ہیں تو پھر ہم سب وطن دشمن ہیں۔ کوئی بھی اس الزام سے بچ نہیں سکتا۔"

"سنو مسٹر، تم کوئی بھی ہو۔ ہم تمہاری تقریر سننے نہیں آئے۔ ہمیں مسٹر اسلام کو گرفتار کرنے کا حکم دیا گیا ہے، سو وہ ہم کر رہے ہیں۔"

وہ بدرالاسلام کو لے کر جانے لگے تو ان کی بیوی بھی ساتھ جانے لگیں۔

"آپ مجھے بھی ساتھ لے چلیے۔ مسٹر بدرالاسلام جن وطن دشمن کارروائیوں میں ملوث ہیں، ان میں، میں بھی ان کی شریک کار رہی ہوں۔"

افسر رک کر کچھ سوچتا رہا۔ دونوں گاڑی میں بیٹھ گئے تو بدرالاسلام نے کہا۔

"آپ حامد اور اس کی بیوی کو بھی بیرک لے جائیے، یہ لوگ یہاں محفوظ نہیں ہیں۔"

"آپ کو فکر کرنے کی ضرورت نہیں۔ یہاں آنے کی کسی کی ہمت نہیں ہو سکتی۔ وہ لوگ یہیں ٹھیک ہیں۔"

افسر نے سخت لہجے میں جواب دیا اور گاڑیاں چل پڑیں۔

ان کے جانے کے بعد نازیہ سسک سسک کر رونے لگی۔ حامد بدحواس سا کھڑا تھا۔ کچھ دیر کے بعد جب اس کے حواس بحال ہوئے تو اس کو خیال آیا کہ بدرالاسلام اس کے اوپر ایک بہت بڑی ذمہ داری ڈال گئے ہیں۔ اسے ہر قیمت پر نازیہ کی حفاظت کرنی ہے۔ اس نے نازیہ کو تسلی دی اور صبح کو فوج کے افسرِ اعلیٰ سے ملنے کا پروگرام بنایا۔ نیند کا تو دور دور پتہ نہیں تھا۔ شاید اس رات کے آنچل میں کہیں بھی نیند بندھی ہوئی نہیں تھی۔ صبح تین بجے ایک بکتر بند گاڑی داخل ہوئی۔ حامد اور نازیہ دالان میں کھڑے تھے گاڑی میں سے دو نوجوان نکلے۔

"مسٹر بدرالاسلام کہاں ہیں ——— ؟"

"ان کو تو فوجی گرفتار کر کے لے گئے۔"

"ایں ——— ؟" ان میں سے ایک چونکا، پھر دوسرے سے بنگلہ میں بولا ——— یہ شخص بہاری ہے، ضرور اسی نے کچھ گھپلا کیا ہے، کیوں نہ اسے لے چلیں، چھوکری بھی خوبصورت ہے۔"

حامد بنگلہ اچھی طرح سمجھنے لگا تھا، البتہ بولنے میں وہ روانی نہیں تھی۔ وہ تو چپ رہا لیکن نازیہ ان لوگوں سے بنگلہ ہی میں الجھ پڑی کہ یہ آدمی بہاری نہیں، ایک بنگالی کا شوہر ہے اور یہ کہ خدا کے واسطے وہ اس لڑائی کو بہاری، بنگالی کا رنگ نہ دیں اور اسے ظلم واستحصال کی لڑائی میں رہنے دیں، وغیرہ وغیرہ

وہ لوگ اس کی بات سُن کر ہنستے رہے۔ جب حجت تمام ہوگئی تو ان میں سے ایک بولا۔

"تم بھی چلو ہمارے ساتھ۔ مکتی باہنی کے لیے لڑکیوں اور عورتوں کی بڑی ضرورت ہے، تم کچھ کام آؤگی۔"

حامد اور نازیہ جن کپڑوں میں تھے، انہیں میں انہیں گاڑی پر بٹھایا گیا اور گاڑی چل پڑی۔ جانے کتنی دیر تک اور گاڑی چلتی رہی۔ جب رُکی تو صبح ہو چکی تھی اور دن کا اجالا پھیل چکا تھا۔

۳۴

وہ ایک بہت بڑا احاطہ تھا۔ جیسا بڑے زمینداروں اور کاشتکاروں کے ہاں بیل، بھینس اور گائے باندھنے کے لیے گوشالہ ہوا کرتا تھا۔ اس میں سیکڑوں افراد تھے، عورتیں، مرد اور بچے۔ وہ سب کے سب گوشالہ میں بندھے جانور تھے، مرد میلے کچیلے، داڑھیاں بڑھی ہوئی، بال اُلجھے ہوئے، عورتوں کے جسم خشک اور کپڑے چیتھڑے، چہروں پر خوف اور وحشت کے سائے۔ نوجوان لڑکیوں کو الگ باندھ رکھا گیا تھا۔ حامد نے پہلے پہل تو اسے ایک ریلیف کیمپ سمجھا لیکن پھر فوراً ہی اس کی سمجھ میں سب کچھ آگیا۔ یہ سب کے سب بہاری تھے۔ اس کے بچوں کو اس کے ساتھ رکھا گیا اور نازیہ کو لڑکیوں کے ساتھ الگ۔ نازیہ ہزار چیخی چلائی بُنگالی اور بنگلہ دیش کا واسطہ دیا مگر کسی کا دل نہ پسیجا۔

انہوں نے سبھی قیدیوں کو نعرہ لگانے کو کہا۔

"جے بنگلہ دیش ۔"

قیدیوں نے بہت جوش و خروش کے ساتھ نعرہ لگایا اور اس وقت تک لگاتے رہے جب تک کہ ان کے گلے بیٹھ نہیں گئے ______ جو لوگ انہیں یہاں لائے تھے وہ بہت اطمینان سے ان کی حالت پر ہنستے رہے۔

دن بھر وہ سب بھوکے رہے۔ شام ہونے سے پہلے انہیں کچے پکے چاول اور دہی کھانے کو دیا گیا۔ پتہ نہیں وہ کب کے بھوکے تھے، جانوروں کی طرح وہ کھانے پر ٹوٹ پڑے اور منٹوں میں کھانا ختم ہو گیا۔ حامد سے تو نہ کھایا گیا، البتہ بچوں کی بلبلاہٹ اس سے نہ دیکھی گئی اور اس نے انہیں بہلا پھسلا کے دہی میں سنے چاول کے دو چار لقمے کھلا دیے۔ یہ پھول سے بچے، جنہیں اب تک دنیا کی ساری نعمتیں میسّر تھیں، پلک جھپکتے ہی روکھے سوکھے لقمے کے محتاج ہو گئے تھے۔

آدھی رات کے بعد آٹھ دس آدمی آئے۔ سب کے سب لنگی، گنجی پہنے، کمر میں گمچھا باندھے، ہاتھوں میں بندوق۔ ان لوگوں نے پھر قیدیوں سے 'جے بنگلہ دیش' کا نعرہ لگوایا اور ان میں سے بیس پچیس افراد کو چُن چُن کے اپنے ساتھ لے گئے۔ چند منٹوں کے بعد انہوں نے خوف سے لرزتی آواز میں پہلے 'جے بنگلہ دیش' سنا، اتنی ہی گولیوں کی آوازیں سنیں۔ اس کے بعد سناٹا چھا گیا۔ وہ لوگ بھی نیند سے بدحواس ہو کر اونگھنے لگے۔ دوسری صبح گوشالہ میں کہرام مچ گیا۔ جو افراد رات لے جائے گئے تھے، ان کی عورتیں اور بچے دھاڑیں مار مار کے رونے لگے۔ حامد کی آنکھوں میں بھی بہت ضبط کے باوجود آنسو آ گئے، وہ رونے کی وجہ نہیں جانتا تھا۔ اسی وقت اچانک حامد کی ملاقات عظیم الدین سے ہو گئی۔ وہ بُرے حال میں تھے حامد کو دیکھتے ہی وہ اس سے لپٹ گئے اور چیخ چیخ کے رونے لگے۔ رونا جب تھما تو بولے۔

"حامد میاں، سب کچھ ختم ہو گیا، کچھ بھی باقی نہیں رہا۔ میرے بیٹے کو ان لوگوں

مار ڈالا ۔ مکان، پریس میں آگ لگا دی، سب کچھ لوٹ لیا۔ تمہاری ممانی تو صدمہ سے مر گئیں میں زندہ درگور ہوں۔ ہائے نہ جانے کب تک مجھے زندہ رہنے کی سزا ملتی رہے گی۔ میں تو روزان لوگوں کے پاؤں پڑتا ہوں کہ مجھے گولی مار دو، لیکن یہ کم بخت مانتے ہی نہیں۔"

"یہ لوگوں کو لے کہاں جاتے ہیں ــــــ؟"

"ارے۔ ان لوگوں نے سبھی بہاریوں کو اسی طرح قتل کیا ہے جانوروں کی طرح رکھا ہے۔ قصّابوں کی طرح روز آتے ہیں اور چُن چُن کے لے جاتے ہیں گولی مارنے۔"

"اوہ تو یہ قصّہ ہے۔"

حامد نے سوچا کہ اگر اس موقع پر دوسروں کی طرح وہ بھی اپنے حواس گم کر دے تو پھر زندگی کے معنی ہی ختم ہو جائیں گے۔ اگر مرنا ہے تو پھر اس طرح کیا مرنا۔ اس نے اپنا دل مضبوط کر کے سب کو پُرسکون رہنے کو کہا۔ انہیں سمجھایا کہ جب مرنا ہی ہے تو پھر مسلمان کی طرح مریں۔ مرنا تو یوں بھی برحق ہے۔ اگر موت اسی طرح لکھی ہے تو ہم رو دھو کے اسے ٹال نہیں سکتے۔ اس کے سمجھانے بجھانے پر لوگوں میں بڑی ڈھارس بندھی۔ حامد کو اختر حسین کا سکھایا ہوا یہ سبق ابھی تک یاد تھا کہ موت کبھی بزدلی سے قبول نہیں کرنا چاہیے۔ اگر ہمّت اور طاقت ہو تو اس کا مقابلہ کرے۔ موت زندگی سے طاقتور نہیں ہوتی اور جب موت زندگی پر حاوی ہو جاتی ہے تو دراصل یہ موت کی فتح نہیں ہوتی، صرف اس فرض کی ادائگی ہوتی ہے جو موت کے ذمّہ ہے۔

روز رات میں یہی قصّہ دہرایا جاتا کہ چُن چُن کر لوگ لے جائے جاتے اور ان سے نعرہ لگوا کر گولی مار دی جاتی۔ دن میں بھی کچھ لوگ آتے، وہ لڑکیوں کو چنتے۔ اس کے بدلے میں وہ نوجوں کو ہتھیار، کپڑے اور کھانے کی اشیأ دے جاتے۔ حامد کسی نہ کسی طرح چھپ چھُپا کر جاتی ہوئی لڑکیوں کو دیکھ لیتا اور ان میں نازیہ

کو ٹہ دیکھ کے خدا کا شکر بجالاتا۔ لیکن وہ جانتا تھا کہ بکرے کی ماں زیادہ دیر تک خیر نہیں منا سکتی۔

رات میں جب افراد کا چناؤ ہوتا تو اس وقت وہاں پر ایک عجیب ہی منظر ہوتا۔ سب لوگوں کو ایک لائن میں کھڑا کر دیا جاتا، اس وقت موت کے گہرے سائے چہروں پر منڈلاتے رہتے۔ چننے والے انہیں غور سے دیکھتے اور خوب ٹھونک بجا کر انہیں لے جاتے۔ ایسا وہ کیوں کرتے تھے، شاید انہیں خود بھی یہ پتہ نہیں تھا۔ ان کی نگاہیں جب کسی پر پڑ جاتیں تو وہ وہیں پر اپنی آخری سانسیں گننے لگتا تھا۔ لیکن کبھی کبھی وہ اسے چھوڑ کر دوسرے کو پکڑ لیتے۔ شاید اس کھیل میں انہیں بہت مزا آتا تھا۔ حامد روز اس پریڈ میں حصہ لیتا، اکثر اس پر نگاہیں ٹھہر بھی جاتیں لیکن شاید ابھی اس کا وقت نہیں آیا تھا، اس لیے وہ بچ جاتا اور دوسرے روز کا انتظار اس پر لد جاتا۔

ایک رات کو پریڈ ختم ہونے کے بعد چند افراد آئے۔ وہی لنگی، گنجی اور بندوق والے انہوں نے سارے بہاریوں سے علحدہ علحدہ ان کے نام دریافت کرنا شروع کیے۔ ہوتے ہوتے وہ حامد تک آئے۔ حامد کے نام پر وہ چونکے اور اسے الگ کر لیا۔ اس کے بچوں کو بھی وہیں پر بلا لیا جو اب مارے نقاہت کے ٹھیک سے چل پھر نہیں سکتے تھے۔ حامد نے سمجھ لیا کہ اب اس کا آخری وقت آ گیا۔ اس نے اپنے بچوں کے ہاتھ مضبوطی سے تھام لیے ——— آنے والوں میں سے ایک بولا۔

"جاؤ ——— عورتوں کے کمرے میں جا کر اپنی عورت کو نکال لاؤ۔"

حامد کو دو آدمی عورتوں کے حصہ میں لے گئے۔ وہاں کی حالت دیکھ کر حامد کانپ اٹھا۔ عورتوں کی تعداد بہت کم رہ گئی تھی۔ زیادہ تر نوجوان اور کنواری لڑکیاں وہاں سے لے جائی جا چکی تھیں۔ باقی انتظار میں تھیں اور بہت ہی بری حالت میں۔ اس نے نازیہ کو ایک ہی نظر میں دیکھ لیا، یہ حامد ہی کی نگاہ تھی جس نے اسے پہچان لیا

ورنہ نازیہ ہرگز وہ نہیں تھی ——— وہ تو ہڈیوں کا ڈھانچہ رہ گئی تھی۔ میلے کچیلے گندے کپڑے، بال خشک اور اُلجھے ہوئے اور آنکھیں، سیاہ کٹوریوں میں پڑی بے جان سی، نجانے کس طرف کو دیکھتی ہوئی۔ حامد نے آہستہ سے آواز دی تو اس پر کوئی اثر نہ ہوا، اس کی آنکھیں جہاں پر تھیں، وہیں ٹنگی رہیں۔ حامد نے سمجھا کہ شاید وہ اپنے ہوش وحواس کھو چکی ہے۔ لیکن وقت کچھ سوچنے سمجھنے کی اجازت دینے کو تیار نہیں تھا۔ حامد نے نازیہ کا ہاتھ پکڑا اور اسے باہر لے آیا۔ اس کے دل میں ایک گونہ تشفی تھی کہ سب ساتھ جیے تھے تو اب ساتھ ہی مریں گے۔ وہ لنگی والوں کے ساتھ جانے لگے تو وہاں پر موجود سب لوگ بُری طرح رونے لگے۔ حامد ان کے لیے تسلّی وتشفی کی بارگاہ تھا، وہ بھی اب جارہا تھا۔ ان کا آخری سہارا۔ حامد بھی اپنے آنسو نہیں روک سکا۔ آنسوؤں کے سایہ میں یہ قافلہ چلا۔ وہ لوگ انہیں لے کر اندھیرے میں پگڈنڈیوں پر چلتے رہے۔ ان میں سے ایک سب سے آگے ہاتھ میں ٹارچ لیے ان کی رہنمائی کررہا تھا۔ حامد نے نازیہ کا ہاتھ مضبوطی سے پکڑ رکھا تھا اور وہ بے جان بے حس وحرکت مورت کی طرح اس کے ساتھ چلتی رہی۔ ایک بچہ حامد کا دامن پکڑے تھا اور دوسرے نے پہلے کا ہاتھ مضبوطی سے پکڑ رکھا تھا۔ دونوں بچوں کی ہمّت پر آفریں تھی۔ راستہ میں کہیں کہیں نعرہ بازی اور چیخ پکار کی آوازیں سنائی دے جاتیں۔ سڑکوں سے بھاری گاڑیاں گذر جاتیں اور پھر سناٹا چھا جاتا۔ چلتے چلتے وہ لوگ ایک میدان میں آگئے۔ وہاں ایک ٹرک کھڑا تھا جس کی اگلی سیٹ پر تین چار آدمی بندوق لیے بیٹھے تھے۔ حامد نے سوچا کہ شاید یہی لوگ ان کا خاتمہ کریں گے۔ شاید اس طرح تھکا کر مارنے میں ان کی کوئی مصلحت پوشیدہ ہوگی۔ انہیں ٹرک کے پیچھے چڑھنے کو کہا گیا۔ حامد نے سہارا دے کر نازیہ کو چڑھایا، پھر باری باری سے بچوں کو۔ لنگی گنجی والوں میں سے تین چار ٹرک پر چڑھ گئے اور ٹرک چل پڑی۔ اس وقت ایک بڑی بات یہ ہوئی کہ نازیہ نے اچانک بولنا شروع کردیا۔ اوٹ پٹانگ باتیں۔ لیکن وہ صرف اردو میں بول رہی تھی۔ ٹرک پر بیٹھے سبھی

افراد بنگلہ میں باتیں کر رہے تھے۔ حامد نے نازیہ کو چپ کرانے کی بہت کوشش کی لیکن اُسے کامیابی نہیں ہوئی۔ سب لوگ خاموش ہو کر نازیہ کی باتیں سننے لگے تھے۔ نازیہ کبھی سیاست کی باتیں کرتی، کبھی معاشیات کا کوئی باب پڑھنے لگتی، موسیقی کے رموز و نکات پر گفتگو کرتی، اپنے بچپن کے واقعات سناتی ۔۔۔۔۔۔۔ ۔۔۔۔ دونوں بچے ٹرک کے فرش پر گر کر سو چکے تھے۔ حامد کو اس وقت نازیہ کا اردو بولنا ناگوار ہو رہا تھا۔ اس کا جی چاہ رہا تھا کہ نازیہ اگر کچھ بولے تو بنگلہ بولے۔ وہ جان رہا تھا کہ اس سے 'جے بنگلہ دیش' کا نعرہ لگوایا جائے گا۔ بنگلہ زبان ہمیشہ اسے شیریں لگتی۔ وہ فراٹے سے زبان تو نہیں بول سکتا تھا لیکن ٹوٹی پھوٹی میں اپنا کام چلا لیتا۔ جب وہ رومانی موڈ میں ہوتا تو نازیہ سے بنگلہ گیت سنانے کی فرمائش کرتا۔ نازیہ جب گیت شروع کرتی تو حامد اپنی سدھ بدھ کھو بیٹھتا۔ اسے ایسا لگتا جیسے ساری زمین، سارا آسمان، ساری فضا، ساری کائنات اپنا سدھ بدھ کھو بیٹھی ہے اور نازیہ کے گیت کی طرف اپنا سب کچھ لگا بیٹھی ہے۔ اس کی آواز میں جادو تھا اور بنگلہ میں آواز کا یہ جادو سر چڑھ کر بولتا۔ نازیہ حامد کی فرمائش کبھی ٹالتی نہیں تھی۔ حامد کو یہ بات یاد آگئی اور اس نے نازیہ سے گیت سنانے کی فرمائش کر ڈالی۔ نازیہ چپ ہو کے خالی خالی نظروں سے اسے دیکھتی رہی۔ وہ بار بار اسے گیت سنانے کو کہتا رہا۔ نازیہ سنتی رہی۔ سنتے سنتے اچانک وہ رونے لگی۔ پھوٹ پھوٹ کر، چیخ چیخ کر ــــــ وہ حامد سے گلے مل کر اس طرح رو رہی تھی کہ ٹرک میں خاموشی چھا گئی۔ روتے روتے ہی نازیہ نے ایک نظم چھیڑ دی، بے حد رومانی نظم:

وہ حسن

جس کا بسیرا ــــ کنار راہگذر

ہوا سے کھیلتی زلفیں ــــ کہ ایک پردہ گراتی ہیں اس کی آنکھوں پر

در شکستہ سے ـــــ طوفاں گذرتا رہتا ہے
دیے یہ مٹی کے ـــــ اک بولرزتی رہتی ہے
کہ جس سے سائے بھی لرزاں ہوئے سرِ دیوار

ہوا کے شور میں لیتا ہے کوئی نام اس کا
نہ جانے کون ہے وہ
کہ کشتی لے کے تو ملّاح ـــــ کب کا جا بھی چکا

درمیان میں بار بار اس کی ہچکیاں سنائی دے جاتیں۔ گیت نے ٹرک کی فضا کو مسحور کر دیا تھا۔ ایک گیت ختم ہوا تو اس نے دوسرا شروع کر دیا، دوسرے کے بعد تیسرا۔ گیت تو اسے بے شمار یاد تھے۔ یہ سلسلہ چلتا رہا اور نہ جانے کب تک چلتا رہا کہ ٹرک ایک دھچکے کے ساتھ رُک گئی۔ نازیہ مسلسل گا رہی تھی، جیسے وہ کسی کی بات سن ہی نہیں رہی ہو۔ اور اس پر ایک دھن سوار ہو۔ اگلی سیٹ پر بیٹھے افراد نے انہیں نیچے اترنے کا حکم دیا۔ حامد نے پہلے بچوں کو اتارا، وہ اس وقت بھی گا رہی تھی لیکن جب ان میں سے ایک نے بہت ہی کرخت لہجے میں اسے ڈانٹ دیا تو وہ یکلخت چپ ہو گئی۔ لیکن اس کا رونا بند نہیں ہوا۔ وہ اس طرح پھوٹ پھوٹ کے رو رہی تھی کہ کسی کو اسے چپ کرانے کی ہمت ہی نہیں ہوئی۔ اس کا گیت جیسے شروع ہوا تھا، ویسے ہی ختم ہوا۔ ٹرک سے لگ کر ایک جیپ کھڑی تھی۔ ان لوگوں کو جیپ میں سوار ہونے کا حکم دیا گیا۔ حامد سے اب نہ رہا گیا، اُس نے پوچھ ہی لیا۔

"بھئی ہمیں کہاں لے جا رہے ہو تم لوگ ـــــ؟"

"چپ چاپ چلے چلو ——— ہم تمہارے سوال کا جواب نہیں دے سکتے۔"

سخت لہجے میں جواب ملا۔

حامد، نازیہ اور بچوں سمیت جیپ میں بیٹھ گیا۔ نازیہ روتے روتے بے حال ہو کے چپ ہو چکی تھی۔ جیپ کے اسٹارٹ ہوتے ہی وہ حامد کے کندھے سے لگ کر خراٹے بھر رہی تھی۔ جیپ ویران سڑکوں اور اوبڑ کھابڑ راستوں پر چلتی رہی۔ بہت سی جگہوں پر اسے رکنے کا حکم دیا گیا۔ جیپ میں بیٹھے افراد بنگلہ میں کچھ جواب دیتے، پھر انہیں آگے جانے کا حکم مل جاتا۔ دو چار بار روکنے والوں نے ٹارچ جلا کر اندر جھانکا، تلاشی لی، تب آگے جانے دیا۔

ایک جگہ پر جیپ والوں نے خود ہی جیپ روک دی۔ ان میں سے ایک حامد سے بولا۔

"اگلی بار پاکستانی چوکی آئے گی۔ تمہیں ان سے اردو میں بات کر کے یہ بتانا ہے کہ تم بہاری ہو اور گورنر کے حکم پر سرحد پار جا رہے ہو اور تمہارا دورہ خفیہ ہے"

حامد ان کا منہ تکنے لگا تو دوسرا بولا۔

"تمہیں کچھ سوچنے کی ضرورت نہیں۔ تم سے جو کہا جا رہا ہے بس وہی کرو۔ ورنہ اپنا حشر تم خود سمجھ سکتے ہو۔"

اگلی بار انہیں بہت ہی کرخت فوجی اشارے کے ساتھ رکنے کا حکم دیا گیا۔ جیپ رک گئی تو تین چار ہتھیار بند فوجی جیپ کے پاس آئے۔ ان کے آتے ہی جیپ پر بیٹھا ایک آدمی کود کر نیچے اترا اور انہیں ایڑیاں بجا کر فوجی سلامی دی، پھر کہا۔

"سر، ہم لوگ سیویلین ڈریس میں ایک بڑے افسر کو سرحد پار لے جا رہے ہیں۔"

اتنے میں حامد بھی جیپ سے اتر آیا۔ اس وقت نجانے کہاں سے اس کے اندر کا چھپا ہوا اداکار جاگ اٹھا۔ اس نے اتنے فطری انداز میں فوجیوں کو اپنے بارے میں بتایا کہ

فوجی اس کے سامنے مؤدب ہوگئے، اس سے ہاتھ ملایا اور گاڑی کو آگے جانے کا سگنل دیا۔ گاڑی پھر چل پڑی۔

اب صبح ہو رہی تھی اور ہر طرف اجالا پھیل رہا تھا۔ جیپ، اجنبی راستوں سے گزرتی ہوئی ایک پھوس کی جھونپڑی کے پاس رک گئی۔ جیپ کے رکتے ہی جھونپڑی میں سے چامو دوڑتا ہوا نکلا۔ چامو کو دیکھ کر حامد کے ہاتھوں میں تھمانہ جانے کب کا صبر کا دامن چھوٹ گیا۔ وہ چامو کے گلے مل کر خوب رویا۔ نازیہ گاڑی سے اتر کر خالی خالی نظروں سے انہیں روتے دیکھ رہی تھی۔ حامد سے فارغ ہو کر چامو نے نازیہ کو گلے لگایا۔ وہ بے جان مورتی کی طرح اس سے لگ گئی۔ آنسو بہانے کا فریضہ صرف چامو نے انجام دیا۔ اس عرصہ میں جو لوگ انہیں یہاں تک لائے تھے، وہ دور کھڑے بیڑی پیتے رہے۔ جب رونے دھونے سے فراغت ملی تو وہ قریب آئے۔ ایک چامو سے بولا۔

"دیکھو استاد —— ہم کتنی مشکلوں میں پڑ کر انہیں یہاں تک لائے، اب ہمیں فوراً رخصت کرو۔"

"ہاں بھائی —— تم لوگوں کا بہت بہت شکریہ۔ ابھی تم اسے رکھ لو، بقیہ تمہیں ڈھاکہ میں مل جائے گا، ادھر آنے کی اب ضرورت نہیں۔"

چامو نے نوٹوں کی گڈی جیب سے نکال کر ان کے ہاتھوں میں تھما دی۔ ایک نے کچھ بولنا چاہا لیکن دوسرے نے اسے منع کر دیا۔ وہ دونوں تیزی سے جیپ پر چڑھ کے روانہ ہو گئے۔ چامو، حامد، نازیہ اور بچوں کو جھونپڑی کے اندر لایا۔ ایک ٹوکری پھلوں کی ان کے سامنے رکھی۔ بڑے بڑے دو ٹفن کیریئر کھولے۔ ان میں پراٹھے، مرغ، مچھلی، سالن اور مٹھائیاں تھیں۔ بچے تو کھانے پر ٹوٹ پڑے۔ حامد کی آنکھوں میں اتنے اچھے کھانے دیکھ کر ایک بار پھر آنسو آ گئے۔ نازیہ تھوڑی دیر تک تو کھانے کو گھور گھور کے دیکھتی رہی، پھر جو اس پر ٹوٹ پڑی وہ تماشہ دیکھنے کے لائق تھا۔

حامد سے بمشکل دو چار لقمے کھائے گئے۔ جھونپڑی کے اندر زمین پر پھوس کا فرش لگا ہوا تھا، اس پر دری لگی تھی۔ کھانا کھانے کے بعد وہ لوگ فرش پر گر کر سو گئے۔ حامد کو نیند نہیں آرہی تھی، وہ چامو سے بہت سی باتیں کرنا چاہتا تھا لیکن چامو نے اس سے کہہ دیا کہ باتیں تو بعد میں بھی ہوتی رہیں گی، ابھی تم لوگ آرام کرلو۔

چامو کے ساتھ پانچ چھ آدمی اور تھے جو ان لوگوں سے دور دور تھے۔ غالباً چامو نے انہیں دور ہی رہنے کا حکم دے رکھا تھا۔ وہ انہیں لوگوں کے پاس باہر چلا گیا۔ پتہ نہیں کتنی دیر تک یہ لوگ سوتے رہے۔ نیند ٹوٹی تو صبح کی دھوپ پھیل رہی تھی۔ حامد ہڑبڑا کر اٹھ بیٹھا۔ چامو مسکراتا ہوا اندر داخل ہوا۔

"جانتے ہو ـــــــ کتنی دیر تک سوتے رہے ہو تم لوگ ـــــ؟"

"غالباً بیس گھنٹے۔"

حامد مسکرا کر بولا۔

"ہاں اور کیا ـــــــ میں تو تم لوگوں کا انتظار کر کر کے تھک گیا، لیکن تم لوگوں کی تھکن دیکھ کر اٹھانے کی ہمت نہ ہوئی۔ ایسا کرو کہ جلدی جلدی تیار ہو جاؤ۔ ابھی ایک گاڑی آئے گی اور ہم لوگ روانہ ہو جائیں گے۔"

حامد نے جلدی جلدی سب کو تیار کیا۔ نازیہ کی حالت تو مردہ بدست زندہ سی تھی۔ اسے بھی حامد نے ہی تیار کیا۔ ابھی سب لوگ تیار ہی ہوئے تھے کہ چامو کے آدمیوں میں سے ایک شخص، چوڑا، گڑ اور چائے لے آیا۔ سب نے بڑے شوق سے چوڑا کھایا، چائے پی۔ اتنے میں ایک بکتر بند گاڑی آگئی۔ چامو نے سب کو اس میں بیٹھنے کو کہا۔ سب کے بیٹھنے کے بعد گاڑی کی کھڑکیوں پر دبیز پردے کھینچ دیے گئے اور گاڑی چل پڑی۔ چامو اپنے آدمیوں سے پتہ نہیں کیا باتیں کرتا رہا۔ نازیہ کا دل

بہلانے کے لیے حامد نے اِدھر اُدھر کی بہت سی باتیں چھیڑ دیں۔ نازیہ ٹکر ٹکر اس کا منہ دیکھتی رہی۔ حامد نازیہ کے سلسلے میں بہت فکر مند تھا کہ کہیں اس کے دماغ پر کچھ اثر تو نہیں ہو گیا۔ لیکن وہ کر بھی کیا سکتا تھا۔ ابھی تو زندگی کئی موڑوں پر بے سدھ ناچ رہی تھی اور جب تک وہ ختم نہیں جاتی، تب تک کوئی بات کیسے سوچی جا سکتی تھی۔

۳۵

وہ گاڑی کے اندر بیٹھے ہوئے دن کے ہنگاموں کو سنتے رہے۔ بچوں نے دو ایک بار باہر جھانکنے کی کوشش کی لیکن حامد نے انہیں منع کر دیا۔ گھنٹوں کے سفر کے بعد گاڑی جب رکی تو شام ہو رہی تھی۔ چامو نے گاڑی سے اتر کر کہا۔

"گھر آگیا ـــــــــ خدا کا شکر ہے۔ اب تم لوگ اترو۔"

وہ لوگ گاڑی سے اترے۔ وہ کلکتہ میں چامو کے فلیٹ کا نچلا حصہ تھا۔ گاڑی رُکنے کی آواز سُن کر چامو کی بیوی دوڑی ہوئی آگئی۔ نازیہ کو دیکھتے ہی وہ اس سے لپٹ گئی اور رونے لگی۔ نازیہ تو پہلے پھٹی پھٹی نظروں سے دیکھتی رہی، پھر جو پھوپی کو پہچان کے روئی ہے تو اس نے جیسے دل کا سارا غبار نکال لیا۔ چامو، حامد اور بچوں کو اوپر لے گیا۔ نازیہ یہاں پہنچ کر کسی حد تک اپنے حواس میں نظر آرہی تھی۔ اس سے حامد کو بڑا سکون سا لگ رہا تھا۔ اسے محسوس ہو رہا تھا جیسے انہیں نئی زندگی مل گئی ہو۔ زندگی تو ان کے لیے اپنی کتاب بند کر چکی تھی، امید کی سب راہیں مسدود ہو چکی تھیں کہ اچانک بند کتاب پھر کھل گئی تھی۔ ایک نئی کہانی، ایک نئے باب کے ساتھ۔

حامد، وہ دن، وہ رات بھلا دینا چاہتا تھا جو اس پر گزرے تھے۔ لیکن وہ رات اور دن، سیاہ دھبے کی طرح اس کی زندگی کے سفید کاغذ پر چپک گئے تھے۔ جتنا وہ بھلانے کی کوشش کرتا، اتنا ہی وہ یاد آتے۔ گوشالہ میں تو وہ پرسکون تھا لیکن وہاں سے نکل آنے کے بعد اس کا سکون غارت ہو رہا تھا۔ چامو نجانے کن مصروفیات میں پھنسا ہوا تھا، وہ صبح سویرے ہی چلا جاتا اور رات کو اتنی دیر میں واپس آتا کہ سب لوگ اس وقت تک سو چکے ہوتے۔

دو دن کے بعد چامو، ناشتہ کے بعد اتفاق سے گھر پر موجود رہا۔ حامد نے کمرہ بند کر کے اپنی ساری رام کہانی اُسے کہہ سنائی۔ اس کو بدر الاسلام کے بارے میں بڑی تشویش تھی۔ چامو بولا۔

"مجھے تم نے جو کچھ سنایا، وہ میں اچھی طرح جانتا ہوں۔ ایسے ایسے بیشمار کیمپ وہاں کھلے ہوئے ہیں۔ کئی ہزار بہاری بھاگ کر اس طرف کو آگئے ہیں۔ بہت سے اس کوشش میں مارے بھی گئے۔ یہاں کی حالت تو عجیب وغریب ہو گئی ہے۔ ایک کروڑ کے لگ بھگ بنگالی فوج کے ظلم وستم سے تنگ آکر وہاں سے بھاگ آئے ہیں، دوسری طرف بنگالیوں کی بے رحمی کئی ہزار بہاریوں کو چوری چھپے ادھر لے آئی ہے۔ کیا ہوگا، کچھ سمجھ میں نہیں آتا۔"

"لیکن چامو ماموں، بدرل انکل کا کیا ہوگا، ان کو تو پاکستانی فوجی پکڑ کر لے گئے ہیں، انٹی بھی انہیں کے ساتھ ہیں ــــــــ"

"اگر زندگی کے دن باقی ہوں گے تو بچ گئے ہوں گے، ورنہ بچنے کی کوئی صورت نہیں۔ ابھی پاکستانی فوجی اور مکتی باہنی والے بے گناہوں اور معصوموں کے خون سے ہولی کھیلنے میں مصروف ہیں۔ ابھی کچھ کہا نہیں جا سکتا کہ کیا ہوگا۔"

"نازیہ نیم پاگل ہو چکی ہے۔ ماں باپ کے بچھڑنے کا غم، پھر کیمپ میں موت

کے انتظار کے کرب نے اس کے دل و دماغ پر بہت خراب اثر ڈالا ہے، یہاں تو وہ بہلی ہوئی ہے لیکن آئندہ کیا ہوگا ــــــ؟"

" فی الحال تم لوگ یہیں رہو۔ ابھی صورت حال بہت نازک ہے۔ پورے ملک میں کلکتہ ہی ایک ایسی جگہ ہے جہاں وہاں سے آئے ہوئے بہاری کسی حد تک محفوظ ہیں۔ راستے تو اور مخدوش ہیں۔ تم نازیہ کو ایک ماہر نفسیات کو دکھاؤ۔ یوں بھی وہ کچھ دنوں تک یہاں رہے گی تو ہو سکتا ہے، وہ بالکل ٹھیک ہو جائے۔"

رائے معقول تھی۔ چامو، حامد اور نازیہ کو لے کر ایک ماہر نفسیات کے ہاں گیا۔ جس نے نازیہ کا اچھی طرح معائنہ کیا اور بتایا کہ شدید صدمہ اور بے رحم واقعات کی منظر کشی نے اس کے دل و دماغ پر اثر ڈالا ہے۔ اسے پرسکون اور گھریلو ماحول کی بڑی ضرورت ہے۔ ورنہ پھر یہ ہمیشہ کے لیے پاگل ہو سکتی ہے۔"

حامد یہ سن کر بہت پریشان ہو گیا، اس وقت چامو نے اس سے پھر کہا کہ اُسے فکر کرنے کی ضرورت نہیں، وہ اطمینان سے یہیں رہے۔ حامد کے سامنے اس کے سوا کوئی راستہ بھی تو نہیں تھا۔ حالانکہ وہ چامو کو زیادہ تکلیف نہیں دینا چاہتا تھا۔ وہ قبل ہی سے اس کے احسانوں کے بوجھ تلے دبا ہوا تھا۔ چامو نے شروع ہی سے ہر قدم پر اس کی مدد کی تھی اور اب بھی مدد کرنے کو تیار تھا۔

حامد ڈھاکہ میں ایک بہترین زندگی گزار چکا تھا۔ اب اس کے پاس کچھ بھی نہیں تھا۔ گھر کی آس ضرور تھی لیکن وہ اپنے گھر سے بخوبی واقف تھا۔ ہندوستان میں اب وہ ایک اجنبی تھا۔ جس کا یہاں کوئی مستقبل نہیں تھا۔ وہ دوسروں کی طرح، چاہتے کے باوجود یہاں کی بھیڑ میں کھو بھی نہیں سکتا تھا۔ اگر کہیں یہ خبر ہو جاتی کہ وہ مشرقی پاکستان کا بھاگا ہوا بہاری ہے تو اس کی مٹی اور بھی پلید ہوتی۔ کلکتہ میں اب اس کا ایک لمحہ کو بھی جی نہیں لگ رہا تھا۔ وہ بہار شریف جانا چاہتا تھا لیکن اس کے پاس پھوٹی کوڑی بھی

نہیں تھی۔ آخر بہت سوچ بچار کے اس نے طے کیا کہ اس سلسلے میں بھی اسے چاموہی سے مشورہ کرنا چاہیے۔

ایک رات چامو، کچھ سویرے آگیا تو کھانے کے بعد اس نے اس سے گفتگو چھیڑ دی۔

"چامو ماموں ـــــ یوں تو آپ کے قبل ہی سے مجھ پر احسانات ہیں، ہمیں جو نئی زندگی ملی ہے، وہ بھی آپ ہی کی بدولت۔ لیکن میں سوچتا ہوں کہ کب تک آپ کو تکلیف دوں۔ میں بہار شریف جانا چاہتا ہوں۔ سب سے ملاقات بھی ہو جائے گی اور شاید مستقبل کی کوئی راہ بھی نکل آئے۔"

چامو اس کی بات سن کر کچھ دیر چپ رہا، پھر آہستہ سے بولا۔

"میاں، میں نے کوئی احسان تو نہیں کیا۔ آخر مصیبت کی گھڑی میں اپنے ہی کام آتے ہیں۔ تم مجھے ماموں کہتے ہو تو میرا بھی کچھ فرض ہے۔ پھر ناز یہ میرے ہی گھر کی بچی ہے۔ میں تمہیں بہار شریف جانے سے نہیں روکتا، تم ضرور وہاں جاؤ، لیکن یاد رکھو صورت حال بہت خراب ہو رہی ہے۔ گھر گھر چھاپے پڑ رہے ہیں اور چھپے ہوئے بہاری پکڑے جا رہے ہیں۔"

حامد یہ سن کر پیلا پڑ گیا۔ چامو کی بات جاری تھی۔

"ان بدنصیب بہاریوں کی خبر خود ان کے اپنے بھائی بند، رشتہ دار، پولیس تک پہنچا دیتے اس صدمہ سے کہ یہ خانماں برباد لوگ کہیں یہیں بس نہ جائیں اور ان کی جائداد، مکان اور کھیت میں حصہ نہ بٹوالیں۔ ابھی میں بہار گیا تھا۔ وہاں افراتفری کا وہ عالم ہے کہ بس پوچھو نہیں، یوں سمجھو کہ قیامت کا ایک منظر ہے۔ بہاری چھپتے پھر رہے ہیں، ان کا کوئی پرسان حال نہیں۔"

چامو کی باتوں کا تاثر اتنا شدید تھا کہ حامد کانپ گیا۔

"پتہ نہیں اللہ نے کس جرم کی سزا دی ہے ان لوگوں کو، چامو ماموں۔"

"ان کے لیے سوائے پاکستان جانے کے کوئی چارہ ہی نہیں۔ مشرقی پاکستان وہ جا نہیں سکتے کیونکہ وہاں بنگلہ دیش ہونے والا ہے، ہندوستان میں رہ نہیں سکتے، پاکستان کا راستہ بند ہے، وہاں جائیں تو کیسے۔ مشکل تو اس وقت ہوگی جس وقت ہندوستان اور پاکستان کے درمیان جنگ چھڑ جائے گی اور اس کا شدید خطرہ ہے۔ مشرقی پاکستان کے شرنارتھیوں کے مسئلے کو لے کر دونوں کے بیچ شدید کشیدگی پیدا ہوگئی ہے۔"

چامو کو ہر چہار طرف کی پوری واقفیت تھی، لیکن اس کی جانکاری نے حامد کے سامنے ایک سیاہ چادر تان دی، اس کی سبھی راہیں مسدود تھیں۔ وہ دیر تک سر جھکائے کچھ سوچتا رہا، پھر بولا۔

"کیا ایسا نہیں ہو سکتا کہ میں فی الحال تنہا ہی بہار شریف ہو آؤں۔ دیکھتا ہوں وہاں کیا صورتِ حال ہے، اس کے بعد ہی کوئی فیصلہ کیا جائے گا۔"

"یوں تو میں نے تمہارے گھر میں خبر کر دی ہے، پھر بھی تم جانا چاہتے ہو تو میں تمہیں روک نہیں سکتا۔ میں تمہارے لیے ریزرویشن کروا دوں گا۔"

حامد کو جانے کی تیاری بھی کیا کرنی تھی۔ اس کے پاس کچھ بچا ہی کہاں تھا کلکتہ آنے کے بعد چامو نے اسے دو جوڑ پینٹ اور شرٹ خرید دیے تھے جو یورپی ممالک سے آکر کلکتہ میں سستے داموں میں فروخت ہوتے تھے۔ اس نے نازیہ اور بچوں کو بھی کپڑے دلا دیے تھے۔ نازیہ کبھی کبھار ہنس بول لیتی تھی۔ پھوپی شاید کسی حد تک بدرالاسلام کا نعم البدل ثابت ہوئی تھی۔ وہ ہر وقت اس کی دل جوئی میں لگی رہتی۔ دو ہفتوں میں اس نے اسے کلکتہ کی تقریباً پوری سیر کرا دی تھی۔ پھر بھی نازیہ مکمل طور پر اپنے جون میں واپس نہیں آسکی تھی۔ حامد نے اسے اپنے بہار شریف جانے کی اطلاع دی تو اس نے چپ چاپ سن لیا، منہ سے کچھ نہ بولی۔ تین چار روز کے بعد چامو نے اسے بتایا کہ اس کا ریزرویشن ہو گیا ہے اور آج رات نو بجے اس کی گاڑی ہے جو اسے کل صبح

بختیار پور پہنچادے گی جہاں سے بذریعہ بس وہ بہار شریف جاسکتا ہے۔ وقت مقررہ پر وہ چامو کے ساتھ اسٹیشن پہنچ گیا۔ چامو نے ٹکٹ اس کے ہاتھوں میں دیا اور چند روپے اس کو جیب میں ڈال دیے کہ کام آئیں گے۔ وہ اسے بہت دیر تک سمجھاتا رہا کہ بہت ہوشیاری سے رہنا، کسی کو شک نہ ہونے پائے اور جلد ہی لوٹ کر آجانا۔

گاڑی چلنے لگی تو حامد نے چامو سے التجا کی کہ وہ نازیہ اور بچوں کا پورا خیال رکھے۔ چامو نے اسے تسلّی دی کہ وہ بے فکر رہے، وہ لوگ اپنے ہی گھر میں ہیں۔

ٹرین ہی پر حامد کو احساس ہوا کہ صورت حال واقعی بہت نازک ہے۔ مشرقی پاکستان سے آئے ہوئے شرنارتھیوں کی موجودگی سے ہندوستان بھر میں بڑا غم و غصہ تھا۔ ملک کی معیشت اس سے بُری طرح متاثر ہو رہی تھی۔ سرکار نے بہت سی اشیاء پر شرنارتھی ٹیکس لگا دیے تھے۔ یوں ان شرنارتھیوں کے لیے ملک میں ہمدردی بھی تھی۔ دوسری طرف مشرقی پاکستان سے آئے ہوئے بہاریوں کے لیے کسی کے دل میں کوئی جگہ نہیں تھی۔ سب انھیں اس پاکستانی حکومت کا ہم نوا اور جاسوس سمجھتے جس کے ظلم و ستم سے تنگ آکر ایک کروڑ افراد کو اپنے گھر بار سے محروم ہونا پڑا۔

راستہ میں لوگ عجیب عجیب باتیں کرتے تھے۔ حامد ڈرا ڈرا سا تھا۔ بردوان اسٹیشن پر وہ ایک ہندی اخبار لایا اور اسے اپنے منہ پر پھیلا لیا۔ ہندی، وہ اسکول اور کالج کے زمانہ میں پڑھ چکا تھا۔ حامد کو اخبار کے مطالعہ سے ایسا لگا کہ ہندوستان پاکستان کے درمیان بس اب جنگ ہونے ہی والی ہے۔ دونوں طرف سے الزام تراشیوں کا سلسلہ عروج پر تھا۔ ہندوستان نے ساری دنیا سے کہہ رکھا تھا کہ وہ اس کے ہاں آئے ہوئے ایک کروڑ شرنارتھیوں کے مسئلے کو حل کریں۔ ہندوستان اور

مشرقی پاکستان کے سرحد کے کسی علاقہ میں 'بنگلہ دیش' نام کی ایک حکومت قائم کردی گئی تھی جس کے عہدہ داروں کے بیانات اخبار میں بھرے ہوئے تھے۔ رات کافی گذر جانے کے بعد حامد، بر بتھ پر لیٹا ضرور، لیکن نیند اس کی آنکھوں سے کوسوں دور تھی۔ وہ اس سچویشن پر غور کرنے لگا جس میں وہ آپھنسا تھا۔ اسے سب کچھ ایک ڈراما سا لگ رہا تھا۔ خدا نے اُسے ایک طرف سے سب کچھ دے کر، دوسری طرف سے سب کچھ اس طرح لے لیا تھا کہ ایک پائی بھی اس کے پاس نہ چھوڑی تھی۔ پھر بھی خدا کا شکر اس کے ذمہ تھا کہ اس کی اور اس کے بال بچوں کی جانیں بچ گئی تھیں اور اگر قسمت کی دیوی پھر مہربان ہوگئی تو زندگی کو کھینچ کھانچ کر راستہ پر لگایا جا سکتا تھا۔ ورنہ اتنے لوگوں کی جانیں گئی تھیں کہ اب ان کا کہیں پر حساب بھی نہیں تھا۔ کتنے ہی لوگ دیکھتے ہی دیکھتے آسمان سے زمین پر آگرے تھے۔ کل تک جو اپنے محلوں میں عیش و آرام سے رہتے تھے آج زمانے کی آندھیوں کا سامنا کرنے کے لئے سڑکوں پر پڑے تھے۔ کتنی لڑکیاں اغوا کی گئی تھیں اور کیسی کیسی بربادیاں ہوئی تھیں اور ان سب کا اندراج کسی کھاتے میں نہیں تھا۔

۳۶

گاڑی صبح بختیار پور پہنچی۔ حامد ٹرین سے باہر نکل کر ایک ٹیکسی میں بیٹھ گیا۔ جس کا ڈرائیور پکار پکار کر مسافروں کو بلا رہا تھا۔ بہار شریف آؤ، بہار شریف

آؤ ——— حامد چونک پڑا، وہ تو بہار شریف کی ٹیکسی میں بیٹھا تھا۔ اُسے اچھی طرح یاد تھا کہ اسٹیشن کے باہر بہار شریف کی ٹیکسیاں یہیں پر کھڑی ہوتی تھیں۔ اس نے ڈرائیور سے پوچھا۔

"ارے بھئی، یہ گاڑی کہاں جائے گی ———؟"

ڈرائیور نے غور سے اس کی طرف دیکھا اور بولا۔

"بہار شریف"

اور پھر بہار شری، بہار شری چلاّنے لگا۔

حامد کو اطمینان ہو گیا کہ وہ بہار شریف ہی جا رہا ہے۔

ٹیکسی میں بیٹھے لوگ آلو، پیاز کے بھاؤ اور کولڈ اسٹوریج کی کمی کے بارے میں باتیں کر رہے تھے۔ حامد نے دل ہی دل میں خدا کا شکر ادا کیا کہ ٹرین کی طرح یہاں ہندوستان، پاکستان، بنگلہ دیش سنائی نہیں دے رہا۔ ٹیکسی بختیار پور سے چل کر آدھے گھنٹے میں بہار شریف پہنچ گئی۔ ٹیکسی سے اُتر کر حامد نے ایک رکشہ لیا اور رہین ہاؤس کی طرف چلا۔ اب تک وہ ایک بے جان مورت کی طرح سفر کرتا رہا تھا لیکن رکشہ پر بیٹھتے ہی اس کے اندر زندگی عود کر آئی۔ اس کا دل دھڑکنے لگا کہ وہ اتنے دنوں کے بعد سب کو دیکھے گا۔ وہ تو سب کی مرضی کے خلاف، محض اپنی خواہش سے یہاں سے بھاگ نکلا تھا اور اب وہ پھر پہلے جیسی حالت میں یہاں لوٹ رہا تھا بلکہ بدتر حالت میں۔ وہ جن امیدوں اور اُمنگوں کو لے کر یہاں سے گیا تھا وہ سب دفن کر کے آرہا تھا۔ اس کے سامنے کوئی پروگرام نہیں تھا۔ وہ اپنے گھر کے پروردہ ایک نوکر کے دیے ہوئے روپے کے سہارے یہاں تک آیا تھا جس سے رشتہ داری کی پہچان ———

رکشہ کن راستوں سے گزرا، کون کون سی جانی انجانی راہوں نے اس کا استقبال کیا۔ اُسے کچھ پتہ نہیں چلا۔ بین ہاؤس آگیا۔ اس نے رکشہ والے کو اپنا پتہ خوب ذہن نشیں کرادیا تھا۔ رکشہ اختر حسین کی بوسیدہ سیڑھیوں کے پاس آکر رُک گیا۔ وہاں پر کوئی نہیں تھا۔ اس نے رکشہ والے کو رخصت کیا اور اندر کمرے میں داخل ہوا۔ اختر حسین مسہری پر لیٹے کچھ پڑھ رہے تھے۔ آہٹ پاکر انہوں نے کتاب سے نظریں ہٹائیں۔ سامنے حامد سر جھکائے کھڑا تھا۔

"حامد۔ تم ——؟"

حامد دوڑ کر ان سے لپٹ گیا اور بچوں کی طرح بلک بلک کر رونے لگا۔ اختر حسین اس کی پیٹھ پر اپنے کمزور ہاتھ پھیرتے رہے۔

"ارے بے وقوف، رونے کی کیا بات ہے۔ تمہاری خیریت چاموں کے خط سے ملی تھی۔ تم بچ گئے، بس اللہ کا یہی بہت بڑا احسان ہے۔"

بہت دیر کے بعد حامد کے آنسو تھمے۔ اختر حسین حامد کو لے کر اندر آئے۔ اس کی ماں اُسے دیکھ کر لپٹ گئیں اور بچوں کی طرح بلکنے لگیں۔ بہن، سسرال میں تھی، فیاض اپنی دوکان پر اور ساجد نوکری پر۔ بی بی صاحبہ کافی ضعیف ہو چکی تھیں اور بہت حد تک مخبوط الحواس بھی۔ حامد کو انہوں نے دیکھا تو قریب بُلا کر آہستہ سے پوچھا۔

"پاکستان سے آئے ہو ——؟"

"جی ہاں۔"

"ماموں کو نہیں لائے ——؟"

"جی وہ تو مغربی پاکستان میں ہیں، میں مشرق سے آرہا ہوں۔"

"کتنے پاکستان ہیں بابو ——؟"

حامد سے کوئی جواب بن نہ پڑا۔ سب لوگ خاموش تھے۔ بی بی صاحبہ بھی چپ ہو کر دوسری طرف دیکھنے لگی تھیں۔ بعد میں اس کی ماں نے بتایا کہ سرور حسین کا کراچی میں انتقال ہو گیا۔ اس خبر کو بی بی صاحبہ سے پوشیدہ رکھنے کی کوشش کی گئی تھی، لیکن ایک روز جب وہ سرور حسین کو یاد کر کے خوب روئیں تب لوگوں کو پتہ چلا کہ یہ راز ان پر کھل چکا ہے۔ اُن کے رونے میں سب نے اُن کا ساتھ دیا۔ یہاں تک تو خیر ٹھیک تھا لیکن وہ اس کے بعد کھوئی کھوئی سی رہتیں۔ کبھی پاکستان کو کوستیں، کبھی دعائیں دیتیں۔ ایسا لگتا تھا جیسے پاکستان نے انہیں بالکل توڑ کے رکھ دیا ہے۔ وہ سرور حسین کو بہت چاہتی تھیں۔ شاید پہلی اولاد ہونے کی وجہ سے۔ جس زمانے میں وہ ان سے ناراض تھیں، اس زمانے میں بھی وہ ان کے خلاف نہ سنتی تھیں، نہ خود بولتیں، وہ ہمیشہ ان کے لیے دعاگو رہتیں۔ سرور حسین کی موت سے پاکستان ان پر چھا گیا تھا۔ وہ جب پاکستان کو کوسنے پیٹنے لگتیں تو فوراً ہی انہیں اس بات کا خیال بھی آجاتا کہ سرور حسین پاکستان کی سرزمین میں دفن ہیں، پھر وہ اسی سانس میں پاکستان کو دعائیں دینے لگتیں۔ نفرت اور محبت کے درمیان کا حجاب ان کے سامنے تار تار ہو چکا تھا۔ وہ ایک ہی وقت میں نفرت اور محبت کی سرزمین پر کھڑی تھیں۔ گھر کے کاموں میں وہ مصروف رہنے کی کوشش کرتیں، لیکن جہاں سرور حسین انہیں یاد آجاتے، وہ تھک کر وہیں بیٹھ جاتیں۔ اور سرور حسین تو انہیں ہر وقت یاد آتے۔ کبھی کبھی ان کی یہ کیفیت ہوتی کہ جیسے انہوں نے بیٹے کی موت کو قبول ہی نہیں کیا ہو، وہ ان کو خوب دعائیں دیتیں اور ہر آنے جانے والے سے ان کی خیریت دریافت کرتیں۔ گھر کے لوگ ان کی یہ حالت دیکھ کے بہت پریشان تھے۔ وسیم اور شمیم کئی بار آئے اور انہیں ساتھ لے جانے کی کوشش کی لیکن ابھی اتنا حواس

ان میں باقی تھا کہ انہیں کہیں جانا نہیں ہے، وہی بات کہ اُن کے شوہر انہیں چھوڑ کر گئے ہیں، اگر ان کی روح تلاش میں آگئی تو وہ کیا جواب دیں گی۔

حامد جس گھر کو چھوڑ کر گیا تھا، وہ گھر اب کہیں نہیں تھا۔ وقت کے مہ و سال نے گھر کو کہاں لاکر چھوڑ دیا تھا۔ اختر حسین نے اپنے آپ کو گھر میں قید کر لیا تھا۔ ان کا وقت اب عبادت اور مطالعہ میں صرف ہوتا۔ ان کے بہت سے دوست بوڑھے ہو کر اپنے بال بچوں کے ہاں جا چکے تھے۔ جو یہاں موجود تھے، ان کے لیے اب روز گھر سے باہر نکلنا ممکن نہیں تھا، پھر بھی اجودھیا بابو اور کچھ دوست کبھی کبھار شام کو آجاتے اور ان کی روایتی محفل برپا ہو جاتی۔ لیکن اب ان محفلوں میں وہ گرمی باقی نہیں تھی بلکہ وہاں اتھاہ خاموشی کا احساس ہوتا۔ حامد کی آمد کے دوسرے ہی دن اجودھیا بابو آئے تو اختر حسین نے حامد کو ان سے ملنے کو بلا بھیجا۔ حامد کے لیے اجودھیا بابو، باپ کے برابر تھے۔ پھر بھی وہ جس طریقے سے یہاں آیا تھا، اس کے پیش نظر وہ ان سے ملنا نہیں چاہتا تھا، لیکن اختر حسین کے بُلانے پر اسے جانا پڑا۔ اجودھیا بابو نے دیکھ کر اُسے گلے سے لگالیا۔ وہ مشرقی پاکستان میں بہاریوں کی حالت زار کے بارے میں دیر تک اس سے دریافت کرتے رہے۔ پھر انہوں نے بہت ہی رازدارانہ انداز میں پوچھا۔

"بیٹے حامد، سنا ہے کہ تم نے کسی بنگالی سے شادی کر لی تھی ——— ؟"

حامد، اچانک ان کے اس سوال کو سن کر گھبرا گیا۔ اس سے اب تک یہ سوال کسی نے نہیں کیا تھا۔ اس نے چور نظروں سے اختر حسین کی طرف دیکھا اور آہستہ سے بولا۔

"جی ہاں ——— میرے دو بچے بھی ہیں۔

"پھر وہ لوگ کہاں ہیں ——— ؟"

"جی، میں انہیں کلکتہ میں ان کے ایک رشتہ دار کے پاس چھوڑ کر آیا ہوں۔"

"میں نے تو سنا ہے کہ وہاں بنگالی بیویوں اور بنگالی شوہروں نے اپنی بہاری بیویوں اور بہاری شوہروں کو چھوڑ دیا، بلکہ انہیں مکتی باہنی کے حوالہ کر دیا — ؟"

"میں زیادہ تو نہیں جانتا لیکن میری بیوی بنگالی ہے۔ اس کے باپ کو محض بنگالی ہونے کے جرم میں پاکستانی فوجی پکڑ کر لے گئے، لیکن میری بیوی نے جینے اور مرنے میں میرا ساتھ دیا اور آج بھی میری وفادار ہے۔"

"اچھا ——— ؟ یہ تم پہلے آدمی ہو جس سے میں اس قسم کی بات سن رہا ہوں ورنہ یہاں ایسی ایسی داستانیں سننے میں آئی ہیں کہ ...."

"آپ نے جو کچھ سنا ہے، ہم سب اُسے بھگت کر آرہے ہیں، حقیقت حقیقت ہے، قتل گاہ میں میری بیوی بھی میرے ساتھ تھی اور ظلم و ستم کو دیکھ کر اپنے ہوش و حواس کھو بیٹھی ہے۔"

"بیٹا، تم کو اس دیوی کو یہاں لے کے آنا چاہیے تھا کم از کم میں اس کے درشن تو کر لیتا۔ جس عورت نے اپنے شوہر کے لیے وطن، گھر بار اور اپنے لوگ پریوار کو چھوڑ دیا، وہ کوئی معمولی عورت نہیں ہو سکتی۔"

اختر حسین چُپ رہے۔ حامد نے بھی کوئی جواب نہیں دیا۔

رات کے کھانے کے بعد اختر حسین نے حامد کو اپنے پاس بلایا اور کہا۔

"میاں، مجھے اس پر کوئی اعتراض نہیں کہ تم نے بنگالی سے شادی کر لی ہے یوں بھی یہ تمہارا اپنا مسئلہ ہے۔ اصل بات یہ ہے کہ تم لوگ بنیادی طور پر غیر ملکی ہو، ہندوستانی نہیں۔ اس لیے تم اس وقت تک یہاں باقاعدہ نہیں رہ سکتے ،

جب تک کہ ہندوستان تمہیں پھر سے قبول نہ کرلے اور ظاہر ہے کہ موجودہ صورتحال میں یہ ممکن نہیں۔ اس وقت تمہاری حالت ان ایک کروڑ رفیوجیوں سے مختلف نہیں ہے جو ہندوستان میں پناہ لیے ہوئے ہیں۔ فرق صرف یہ ہے کہ انہیں حکومت ہند نے سر آنکھوں پر بٹھا رکھا ہے اور تمہاری کونے میں تلاش ہے واپس، بہرکیف دونوں کو جانا ہے، اس میں دو رائے نہیں ہو سکتی۔"

اختر حسین کی بات لمبی ہوتی جارہی تھی۔ حامد کی سمجھ میں نہیں آرہا تھا کہ وہ کہنا کیا چاہتے ہیں۔ وہ دم لینے کے لیے رُکے تو وہ چُپ چاپ ان کا منہ تکنے لگا۔

"تم بُرا مت ماننا بیٹے ——— اجودھیا بابو مخلص آدمی ہیں، ان کے جذبات، ان کی اپنائیت سر آنکھوں پر، لیکن تم اپنی بیوی، بچوں کو یہاں ہرگز لے کر مت آنا۔ مشرقی پاکستان میں بہاریوں پر جو کچھ بھی بیتی ہے اس کا یہاں بہت اثر ہے۔ تمہاری بنگالی فیملی یہاں آئے گی تو ہنگامہ ہو جائے گا اور سرکار کی نگاہیں بھی ہم پر پڑیں گی۔ یوں بھی ہم اب وہ نہیں رہے ———"

اختر حسین نے تفصیل سے مکان کی تلاشی کا واقعہ سنایا اور یہ بتایا کہ وہ تو بددل ہو کر گھر سے باہر نکلنا بھی چھوڑ چکے ہیں۔

حامد ان کی باتیں غور سے سنتا رہا۔ تلاشی کے واقعہ کی اُسے مطلق خبر نہیں تھی۔ اختر حسین کی باتوں میں سچّائی تھی۔ تھوڑی دیر کے غور و فکر کے بعد وہ اس نتیجے پر پہنچ گیا کہ اس کا زیادہ دنوں یہاں رہنا خطرے سے خالی نہیں۔ اگر کہیں پولیس اور سی آئی ڈی کی خبر ہوگئی تو اس کی تو اس کی، اس کے گھر والوں کی بھی خیر نہیں۔ اس نے اختر حسین سے دریافت کیا کہ اب اسے کیا کرنا چاہیے۔

اختر حسین نے جواب دیا۔

"بنیادی طور پر تم پاکستان کے شہری ہو اور تمہیں پاکستان چلا جانا چاہیے۔ تمہیں، صرف پاکستان ہی قبول کر سکتا ہے۔ یہاں بہت سے بہاری آئے اور حالات کو سونگھ کر پاکستان چلے گئے۔ پہلے تو پاکستان جانا آسان تھا، گردنیا پاسپورٹ کے سہارے چلے گئے، گردنیا پاسپورٹ کا رواج تو ختم ہو گیا۔ مشرقی پاکستان سے بہاری آ تو سکتے ہیں، جا نہیں سکتے۔ مغربی پاکستان کی سرحد پر دونوں ملکوں کی فوج جمع ہے۔ اس لیے صرف ایک ہی راستہ باقی رہ جاتا ہے یہاں سے نیپال چلے جاؤ اور وہاں سے ہوائی جہاز پر بیٹھ کر پاکستان ——— "

"لیکن اس میں تو روپیوں کا بہت خرچ ہے؟"

اختر حسین اس کی یہ بات سن کر سوچ میں پڑ گئے، تھوڑی دیر کے بعد بولے۔

"دیکھو بیٹے، پیسے تو ہمارے پاس ہیں نہیں، تھوڑی سی جائداد ضرور ہے، اسے فروخت کیا جا سکتا ہے۔ لیکن موجودہ صورت حال میں جائداد کو فروخت کرنے کا مطلب لوگ صاف سمجھ جائیں گے ——— تم جانتے ہو کہ یہاں بہاریوں پر کیا گزری ——— جو لوگ پیسوں اور جائداد کی امید میں یہاں آئے تھے، ان کے سگے بھائیوں اور رشتہ داروں نے انہیں پکڑوا دیا۔ ابھی بھی سیکڑوں افراد جیلوں میں بند ہیں اور ان کا کیا ہوگا، کچھ پتہ نہیں ——— "

چامو نے حامد کو جو کچھ بتایا تھا، اختر حسین نے اس کی تصدیق کر دی۔

"تب پھر کیا ہوگا ——— میرے پاس تو اب پھوٹی کوڑی نہیں ہے۔ جو کچھ تھا، وہ سب گنوا آیا ہوں۔"

"تم نے چامو کی بیوی کے رشتہ داروں میں شادی کی ہے نا ——— وہ لوگ تو بہت بڑے آدمی ہیں۔ سنا ہے کہ چامو بھی بڑا آدمی، ہو گیا ہے۔"

اختر حسین کا لہجہ چامو کے لیے کچھ عجیب سا تھا جسے حامد محسوس کیے بغیر نہیں

رہ سکا۔

"وہ تو واقعی بڑے لوگ تھے۔ مشرقی پاکستان میں، میں جو کچھ بھی تھا وہ محض ان لوگوں کی بدولت۔ لیکن اب تو کچھ بھی باقی نہیں رہا، سب ختم ہو چکا ہے۔ میرے سسر اور ساس کو پاکستانی فوجی پکڑ کر لے گئے۔ میری بیوی نے چونکہ میرا ساتھ دیا اس لیے وہ بنگالیوں کے سامنے بہاریوں کی فہرست میں شامل ہے۔ چاموماموں ہی کی بدولت ہمیں نئی زندگی ملی۔ انہوں نے بنگالیوں سے بھاری قیمت پر ہم لوگوں کو خریدا اور ہمیں وہ قیمت تک نہیں بتلائی۔ انہیں اب کہاں تک زحمت دی جا سکتی ہے ______؟"

"عظیم الدین بھائی نے تو لکھا تھا کہ تم جن لوگوں کے چکر میں ہو، وہ کوئی اچھے لوگ نہیں اور تمہیں ان لوگوں نے پھانس رکھا ہے کہ انہیں ایک گھر داماد کی ضرورت ہے اور ______"

حامد غصّہ سے تلملا گیا۔

"عظیم الدین ماموں نے بالکل جھوٹ لکھا ______ گھر داماد کی ضرورت اُن کو تھی اور جب اس میں انہیں ناکامی ہوئی تو انہوں نے میرے خلاف یہ بات لکھی۔ شادی کے بعد میں اپنے سسر کا شاندار اور تنہا بنگلہ چھوڑ کر اپنے فلیٹ میں رہا ہوں اور اسی روز فلیٹ چھوڑا ہے جس روز وہاں آگ لگی ہے ______"

وہ عظیم الدین کے بارے میں اور بھی بہت کچھ بولتا لیکن یکلخت اسے خیال آیا کہ عظیم الدین تو اب زندہ بھی نہیں ہوں گے۔ وہ انہیں قتل گاہ میں چھوڑ کر آیا تھا۔ اس خیال کے آتے ہی وہ چپ ہو گیا۔

"خیر چھوڑو ______ فی الحال ہمیں دوسری فکر کرنی ہے، دیکھو

ساجد آج کل پٹنہ میں ہے۔ اسے تمہاری خبر ملے گی تو وہ یقینی طور پر آئے گا، شاید وہ کچھ مدد کر سکے۔"

حامد کو ان کی باتوں سے خاصی مایوسی ہوئی۔

ساجد کو اختر حسین نے حامد کے آمد کی اطلاع بھجوادی تھی۔ تیسرے ہی روز وہ آگیا اور حامد سے لپٹ کر خوب رویا۔ حامد اُسے چھوٹا چھوڑ کر گیا تھا، اب وہ حکومت کا ایک ذمّہ دار افسر تھا۔ ساجد نے کہا۔

"آپ جانتے ہیں بھیّا کہ اگر حکومت کو پتہ چل جائے کہ میں آپ سے ملا ہوں تو میری نوکری بھی خطرے میں پڑ سکتی ہے۔ بہاریوں کے مسئلے کو سی بی آئی کے حوالہ کر دیا گیا ہے۔ مسلمان افسروں پر تو اور بھی سخت نگاہ ہے۔ افسوس کہ خواہش رہتے ہوئے بھی، میں آپ کو پٹنہ نہیں بُلا سکتا۔ بھابی کہاں ہیں، بچّے سب کہاں ہیں ــــــ؟"

"وہ سب کلکتہ میں ہیں۔ میں تو تم سب سے ملنے یہاں آگیا اور خدا کا شکر ہے کہ ملاقات بھی ہو گئی۔"

"بھیّا، اب آپ کا کیا پروگرام ہے ــــــ؟"

"کیا پروگرام ہو سکتا ہے۔ میں تو پاکستانی شہری ہوں اور مجھے پاکستان ہی جانا ہو گا۔"

"پاکستان کیسے جائیں گے ــــــ؟"

"شاید نیپال کے راستہ کو اختیار کرنا پڑے، بہت سے لوگ اسی راستے سے گئے ہیں۔"

"لیکن اس کوشش میں بہت سے لوگ پکڑے بھی گئے ہیں۔ آخر یہاں سے نیپال بھی تو پہنچنا ہے۔"

حامد خاموش ہو گیا۔ وہ جس سے بھی بات کرتا، اس کی امید کی کرنیں مدھم ہو جاتیں۔ اس نے ساجد سے مدد وغیرہ کے سلسلے میں بات کرنے کی ہمت نہیں کی، البتہ اختر حسین نے تنہائی میں ساجد سے گفتگو کی۔ ساجد نے وعدہ کیا کہ جہاں تک ممکن ہو سکے گا، وہ ضرور مدد کرے گا۔

دوسرے دن ساجد پٹنہ چلا گیا۔ تیسرے روز اپنے اسٹینو کی معرفت ایک بند لفافہ حامد کو بھیجا۔ لفافہ میں سو سو کے دس نوٹ تھے۔ حامد نے کچھ سوچ کر لفافہ رکھ لیا۔ بلاشبہ رقم بہت کم تھی، اس سے تو نیپال پہنچنا بھی مشکل تھا۔

٣٧

شرنارتھیوں کا مسئلہ جوں کا توں قائم تھا۔ ہندوستان کے ہر غریب آدمی کی روٹی میں ان کا حصّہ لگ رہا تھا۔ ہندوستان پر اندرونی دباؤ بڑھتا جا رہا تھا کہ وہ بنگلہ دیش کی حکومت تسلیم کر لے اور اسے فوجی مدد دے۔ یوں تو یہ ہر شخص جانتا تھا کہ حکومت ہند، بنگلہ دیش کو ایک دن ضرور تسلیم کر لے گی لیکن کب ــــــــــــ

اچانک ایک روز آگرہ، دلی اور جالندھر وغیرہ پر پاکستانی طیاروں نے فضائی حملہ کر دیا۔ اس کے جواب میں حکومت ہند نے فوراً بنگلہ دیش کی سرکار کو تسلیم کر لیا اور اس کی مدد کے لیے اپنی فوج بھیج دی۔

بنگلہ دیش میں اب بھی لاکھوں بہاری پھنسے ہوئے تھے جن کے لیے زمین تنگ اور آسمان دور تھا۔ جنگ سے بہار کے مسلمان دہلے ہوئے تھے کیونکہ ان کا کوئی نہ کوئی رشتہ دار، جاننے والا، تعلق رکھنے والا بنگلہ دیش میں ضرور موجود تھا۔ ہندوستان نے مکتی باہنی کی قبل ہی بہت مدد کی تھی، اب تو باقاعدہ اس کی فوج ہی وہاں جدوجہد میں لگی تھی۔ بنگلہ دیش کی آزادی کا مطلب صاف تھا، ان بہاریوں کی یقینی موت۔

حامد اسی وقت کلکتہ واپس جانا چاہ رہا تھا کہ جنگ چھڑ گئی اور اختر حسین نے اسے جانے سے منع کر دیا۔ پھر بھی وہ کلکتہ جانے کا کوئی پروگرام بنا لینا چاہتا تھا۔ جنگ چھڑ جانے سے اس کی بے چینی میں اضافہ ہی ہوا۔ اس کی راتوں کی نیند حرام ہو گئی۔ پاکستانی طیاروں نے کلکتہ پر بھی بم برسانے کی کوشش کی، وہاں بلیک آؤٹ کا حکم دے دیا گیا۔ اسی درمیان چاموکا خط آیا کہ وہ ابھی آنے کی کوشش نہ کرے، یہاں سب خیریت ہے۔ اس خط سے حامد کی پریشانی کچھ دور ہوئی۔

سردیوں کے دن تھے۔ اختر حسین شام ہی سے اپنے کمرے میں بند ہو جاتے، ان کو کچھ پتہ بھی نہ چلتا۔

اختر حسین کے منع کرنے کے باوجود اُن کے گھر میں ریڈیو پاکستان سُنا جاتا اور اس کارِ خیر میں فیاض کے بہت سے دوست اور آس پڑوس کے لوگ تواتر اور جوش و خروش سے حصّہ لیتے۔ مقررہ وقت پر سبھی فیاض کے کمرے میں جمع ہو جاتے اور دروازہ اندر سے بند کر کے دھیمی آواز سے خبریں سن جاتیں۔ اختر حسین کی یہ عادت کبھی نہیں رہی تھی کہ وہ دوسروں کے کمرے میں جھانکتے پھریں۔ انہیں اگر کچھ شک بھی ہو جاتا تب بھی وہ اپنے آپ کو ایسا کرنے سے مجبور پاتے۔ حامد اگرچہ اس محفل میں شریک نہیں ہوتا تھا لیکن وہ بغل کے کمرے سے ساری خبریں اور تبصرے سنتا رہتا۔ یوں ان میں زیادہ تر افراد سے وہ ذاتی طور پر واقف تھا۔

راشٹر پتی، پتہ نہیں یہ کیسی اُردو چلائی جا رہی ہے۔"

"اجو دھیا بابو ـــــــــ بھائی آپ کو جس وجہ سے بھی پاکستان ریڈیو سُننا ہو، آپ گھر ہی میں سُنا کریں۔ مجھے کیوں بدنام کرتے ہیں۔"

اجودھیا بابو خاموش ہو گئے۔

جنگ شروع ہوتے ہی حامد گھر میں مقید ہو گیا تھا۔ دن میں تو وہ اپنے کمرے سے باہر بھی نہ نکلتا کہ کسی کی نظر نہ پڑ جائے۔

اخباروں میں خبریں آئیں کہ پاکستانی جاسوسوں کی تلاش گھر گھر کی جا رہی ہے۔ بہت سے اس الزام میں پکڑے بھی گئے۔ اس وقت تو کوئی بھی کسی بھاگے ہوئے بہاری کو پاکستانی جاسوس کہہ سکتا تھا۔ ان کے پاس پاسپورٹ، ویزا قسم کی کوئی چیز بھی نہیں تھی جس کی مدد سے وہ اپنی بے گناہی ثابت کر سکتے۔ ان خبروں سے حامد دہلتا رہتا۔ اس نے اپنے بارے میں ایک بار غور کیا تو اُسے پتہ چلا کہ وہ اندر سے بالکل ٹوٹ چکا ہے، اس کا اعتماد نجانے کب کا گُم ہو چکا تھا۔

جب وہ یہاں بی۔ اے کر کے بیکار بیٹھا تھا اور اختر حسین ڈپٹی منسٹر ہوتے ہوئے بھی اس کو کچھ مدد نہیں کر سکے تھے پھر بھی اُسے اختر حسین برگد کا وہ پیڑ نظر آتے جسے اکھاڑنا بہت ہی مشکل تھا۔ لیکن اب اختر حسین اُسے ایک کمزور پودے کی طرح دکھائی دیتے جسے ہوا کا ایک ہلکا سا جھونکا بھی اکھاڑ کر بہت دور لے جا سکتا تھا۔ بین ہاؤس کی تلاشی کے واقعہ نے انہیں توڑ ڈالا تھا، ان کی جڑیں کھود ڈالی تھیں پوری دنیا میں اُسے صرف چامو ایک ایسا پیڑ نظر آتا جسے دنیا کی کوئی طاقت بھی اکھاڑ نہیں سکتی تھی۔ خراب سے خراب حالات میں بھی اس کے پاؤں ثابت قدم رہنا جانتے تھے۔ اگر چامو نہ ہوتا تو ـــــــــ

دراصل چامو کا وجود ہی اس کے اندر زندگی کی رمق پیدا کرتا تھا، وہ

اگر چامو کے تصور سے بھی دور ہوتا تو پھر بداعتمادی اور شکست خوردگی کا ایک نمونہ بن جاتا۔ چامو کے دو خطوط اُس کے پاس آئے تھے، دونوں ہی میں اس نے حامد کو اس وقت تک کلکتے آنے سے منع کیا تھا جب تک وہ وہاں سے ہری جھنڈی نہ دکھا دے۔

۳۸

گھر کا ماحول کچھ عجیب سا ہو گیا تھا۔ بی بی صاحبہ ہر وقت بہکی بہکی باتیں کرتیں۔ انہوں نے کہیں سُن لیا تھا کہ ہندوستان پاکستان کے درمیان لڑائی ہو رہی ہے۔ وہ ہندوستان کی کامیابی کی دعائیں مانگتیں اور جس دم انہیں اُس زمین کا خیال آتا جس کی مٹّی میں سرور حسین دفن تھے، اسی دم وہ پاکستان کی فتح کی دعائیں مانگنا شروع کر دیتیں۔ دن بھر میں گھر کے افراد کئی بار ان سے ہندوستان اور پاکستان کے لیے دعائیں سُنتے۔ حامد کی سمجھ میں نہ آتا کہ ان کی دعائیں سُن کر خدا کیا فیصلہ کرے گا؟ وہ کون سی دعا قبول کرے گا اور کون سی رد۔

سرور حسین کی بیوی پر شوہر کے موت کی خبر سُن کر کوئی اثر نہیں ہوا تھا، چوڑیاں وہ بہت قبل توڑ چکی تھیں اور رنگین کپڑے پہننا ترک کر چکی تھیں۔ حامد ان سے ملنے گیا تو وہ اس سے ڈھنگ سے ملیں، اس کی خاطر کی اور آتے وقت اس کے ہاتھوں میں دس روپے کا ایک نوٹ تھما دیا۔ فیّاض دن بھر دوکان پر رہتا اور گھر پر رہتا بھی تو کسی سے اس کی بول چال کم ہی ہو پاتی۔ خالدہ عرب سے

لوٹ کر اپنے سسرال میں آ گئی تھی اور زچگی کی وجہ سے وہ حامد سے ملنے نہیں آ سکی تھی
نثار بے چارہ گونگا ہی تھا۔ اس سے اشاروں کنایوں میں بات ہو سکتی تھی۔ جب
حامد یہاں موجود تھا تو وہ ان اشاروں کی زبان خوب سمجھتا، اب تو اس کی پریکٹس
ہی چھوٹ چکی تھی اس لیے وہ نثار کی بہت سی باتیں نہیں سمجھ پاتا اور اپنی بہت سی باتیں
اس سے نہیں کہہ پاتا۔ نثار کپڑے کی سلائی سے اچھا خاصا کمانے لگا تھا۔ باہر کے جس
کمرے میں وہ بیٹھتا، وہاں بے شمار کترن بکھری ہوتی۔ اختر حسین نے اپنی دنیا الگ
بسالی تھی، وہ عبادت میں مشغول رہتے یا پھر اپنے چند دوستوں میں۔ گھر سے نکلنا تو
ان کا بند ہی تھا۔ حامد کی ماں بہت ہی نیک اور سیدھی تھیں، ان سے کسی موضوع پر
بات نہیں کی جا سکتی تھی۔ اُن سے جو کہا جاتا وہ اُسے بے چوں چراں مان لیتیں چاہے
وہ سچ ہو یا جھوٹ۔ انہوں نے جب حامد کی شادی کی خبر سُنی تو اس پر انہوں نے یقین
ہی نہیں کیا اور اس کی شادی کی تیاریاں بھی شروع کر دیں۔ حامد نے بڑی مشکلوں
سے انہیں اس کام سے باز رکھا، انہیں ہزار سمجھایا کہ وہ شادی کر چکا ہے اور اس
کے بچے بھی ہیں، لیکن انہیں اس پر بھی یقین نہیں آیا۔ اُن کا کہنا تھا کہ حامد ایسا کر ہی
نہیں سکتا کہ ماں باپ کی مرضی کے بغیر شادی کر لے، اس خاندان میں کسی نے ایسا نہیں
کیا۔ مجبور ہو کے حامد کو یہ کہنا پڑا کہ ابھی وہ بیکار ہے، شادی کے بعد بیوی کو کھلائے گا
کیا اور پھر ابھی بڑے بھائی فیاض کی شادی ہونی ہے۔ بڑے بھائی کی نہیں ہوئی تو پھر
چھوٹے بھائی کی کیسے ہو سکتی ہے۔ وہ بڑی بڑی مشکلوں سے رکی تھیں اور فیاض کے لیے
لڑکی کی تلاش شروع کی تھی۔ اختر حسین کا کہنا تھا اس کے لیے ایک غریب اور شریف
خاندان کی لڑکی چاہیے تاکہ وہ گھر میں آسانی سے رچ بس جائے۔

ہندوستان ریڈیو کی باتیں ایک ایک کر کے سچ ثابت ہو رہی تھیں اور پاکستان
ریڈیو پر ہر کسی کا یقین اٹھتا جا رہا تھا۔ ساتواں امریکی بحری بیڑے اور چین کی طرف سے

فوجی مدد کی خبریں بھی اب دھندلا رہی تھیں، اگرچہ ابھی تک اُن میں اُمید کی چنگاریاں باقی تھیں ———— صبح و شام اب بھی انتظار ہوتا کہ امریکی بحری بیڑے کی حرکت نہ جانے کیا رنگ لائے لیکن خدا معلوم امریکی بحری بیڑے کو کیا ہو گیا تھا کہ اس کا کوئی چمتکار نظر ہی نہ آتا' دوسری طرف چین کی فوجیں بھی اپنی طویل دیوار کو پار نہ کر سکیں۔

اچانک ۱۶ دسمبر آگیا۔ اس روز صبح سے ہندوستان ریڈیو کے جوش و خروش کا کچھ اور ہی عالم تھا۔ مشرقی پاکستان کا بڑا حصّہ تو بنگلہ دیش بن ہی چکا تھا۔ رنگ پور، سید پور، کھلنا، نواکھالی، کومیلا وغیرہ وغیرہ پر مکتی باہنی کو قبضہ دلایا جا چکا تھا اور کوئی دم میں ڈھاکہ کا فال ہونے ہی والا تھا۔ حقیقت یہ ہے کہ خود ہندوستانی فوج اور مکتی باہنی کو بھی یہ یقین نہیں تھا کہ بس دو ہی ہفتوں کی جنگ میں بنگلہ دیش کا وجود حقیقت بن جائے گا اور مشرقی پاکستان کا تصور، خواب و خیال بن کر رہ جائے گا۔ یوں امید کی ایک رمق اب بھی باقی تھی کہ شاید ساتواں امریکی بحری بیڑہ مکتی باہنی والوں کو چاروں طرف سے گھیر رہا ہے اور ڈھاکہ میں سب کو جمع کر کے وہ چار چوٹ کی مار مارے گا کہ بس۔ آخر امریکہ ایک بہت بڑی طاقت ہے جس سے روس تک ڈرتا ہے۔ کنیڈی کی ایک گھرکی پر خروشچیف کیوبا سے کیسا دم دبا کر بھاگا تھا کہ آج تک یاد کر کے ہنسی آتی ہے۔ دن بھر لوگوں کو بحری بیڑے کی اصل حرکت کا انتظار رہا۔ شام ہوئی، رات ہوئی۔ ہندوستان ریڈیو نے خبروں کے درمیان ایک ڈرامہ کھیلا۔ اعلان کر دیا کہ اندرا گاندھی بولیں گی۔ سچ مچ اندرا گاندھی بولیں کہ ڈھاکہ کا فال ہو گیا ہے۔ پاکستانی افواج کے مشرقی کمانڈر لفٹنٹ جنرل اے اے کے نیازی نے نوّے ہزار سے زائد فوجیوں کے ساتھ ہندوستانی افواج کے مشرقی کمانڈر لفٹنٹ جنرل جگجیت اروڑہ کے سامنے ہتھیار ڈال دیے ہیں۔

اس کے ساتھ ہی ہتھیار ڈالنے کی پوری تفصیل بتائی گئی۔ پاکستان ریڈیو اس "

سلسلے میں مکمل خاموش رہا۔ یوں اس نے گھمسان کی لڑائی جاری رہنے کی خبر دی۔
لیکن اب پاکستان ریڈیو کی سچائی کا بھرم ختم ہو چکا تھا۔ خبروں کے درمیان اندرا گاندھی
کے غیر معمولی اعلان نے پانسہ ہی پلٹ دیا تھا۔

مشرقی پاکستان کا خاتمہ کوئی معمولی بات نہ تھی۔ اب وہاں پھنسے ہوئے کئی لاکھ
بہاریوں کو کوئی نہیں بچا سکتا تھا سوائے خدا کے۔ مسلمانوں کے ساتھ ایک ایسا مذاق
ہو گیا تھا جس پر نہ وہ ہنس سکتے تھے، نہ رو سکتے تھے جیتنے والے بھی مسلمان تھے اور ہارنے
والے بھی مسلمان۔ نوّے ہزار سے زائد فوجیوں نے جگجیت سنگھ اروڑہ کے سامنے ہتھیار
ڈال دیے تھے اور یہ بنگلہ دیش کے قیام سے زیادہ بڑا ——— بہت بڑا حادثہ
تھا۔ مسلمانوں کی چودہ سو سالہ تواریخ اس بات کی شاہد تھی کہ انہوں نے شکست
ضرور کھائی تھی لیکن انہوں نے اتنے فوجیوں کے ساتھ ہتھیار کبھی نہیں ڈالے تھے۔
یہ ان کی تواریخ کا ایک المناک باب تھا۔ اس رات مسلمانوں کے گھروں میں مکمل
خاموشی چھائی رہی۔ اکثر گھروں میں کھانا نہیں پکا اور اگر پکا تو کھایا نہیں گیا، آنکھوں
سے نیند اُچاٹ تھی۔ ہتھیار ڈالنے کا واقعہ دلوں میں ایک خنجر کی طرح چبھ گیا تھا جو
اپنا کام تمام کر کے نکلتا ہی نہیں تھا۔ جنرل نیازی کے بارے میں طرح طرح کی باتیں ہو
رہی تھیں۔ کوئی کہتا تھا کہ وہ غیر ملکی ایجنٹ ہے اور اس نے روپیہ لے کر مسلمانوں کے
منہ پر کالک پوت دی ہے۔ کسی کا خیال تھا کہ وہ بے حد شرابی اور عیاش ہے ا
شراب کے نشہ میں اس نے ہتھیار ڈالے ہیں۔ کچھ لوگ یحییٰ خاں کو بھی گالیاں دے
رہے تھے کہ اس نے مسلمانوں کی تواریخ میں ذلت و رسوائی کے باب کا اضافہ کیا۔ اخباروں
میں ہتھیار ڈالنے اور نئے ملک کے قیام کے بارے میں ذرا ذرا تفصیل آ رہی تھی۔
بنگلہ دیش حکومت کے عہدہ داران جو پتہ نہیں کہاں سے چھپ کر حکومت چلا رہے
تھے، ڈھاکہ پہنچ چکے تھے اور انہوں نے نظم و نسق کو سنبھال لیا تھا۔ اب لوگوں کو

انتظار تھا تو بس اس بات کا کہ وہ کب بہاریوں کے قتلِ عام کا حکم دیتے ہیں۔ سب سے زیادہ ملال اب اس کا تھا کہ جو بہاری وہاں پھنسے تھے، وہ کسی طرح بھاگ کر ہندوستان کیوں نہیں آ گئے، بلا سے یہاں سڑتے رہتے، کم از کم جان تو بچ جاتی۔ بنگلہ دیش کی حکومت تو اب انہیں کسی حال میں نہیں چھوڑے گی۔

حامد کو ان تمام باتوں سے کوئی بہت بڑا اچنبھا نہیں ہوا تھا، اس وقت جب وہ مشرقی پاکستان میں خوشحالی کے دن گزار رہا تھا، اس کے ذہن میں موجودہ صورتحال کا ایک دھندلا دھندلا سا خاکہ ابھرا تھا جسے اس نے فوراً جھٹکنے کی کوشش کی تھی۔ اب مطلع صاف ہو گیا تھا اور وہ جلد سے جلد کلکتہ چلا جانا چاہتا تھا۔ اُسے یہ بھی ڈر تھا کہ کہیں اس زیادہ تاخیر سے نیپال کا راستہ بھی بند نہ ہو جائے۔ اس نے اختر حسین سے جانے کے بارے میں بات کر لی تھی اور وہ خاموش رہے تھے۔

۳۹

وہ بس آج ہی کل میں جانے والا تھا کہ اچانک ایک بڑا حادثہ رونما ہو گیا۔ اس کی ماں کا انتقال ہو گیا ———— دوپہر میں وہ کھانا لے کر بیٹھی ہی تھیں کہ بے ہوش ہو کر گر گئیں۔ ڈاکٹر کو بلایا گیا تو اس نے انہیں مردہ قرار دیا۔ دل کا شدید دورہ پڑا تھا۔ گھر کے افراد پر اس حادثہ سے جو گزری سو گزری، سب سے بڑی مشکل خود بی بی صاحبہ تھیں، وہ بہت حساس تھیں، اُن سے اس واقعہ کو ہر حال میں پوشیدہ رکھا جانا تھا۔ سرور حسین کی موت نے انہیں زندہ درگور کر دیا تھا، بیٹی

کی سناؤنی نجانے ان پر کیا اثر ڈالتی ۔ وہ ہمیشہ ان کے ساتھ رہی تھیں ۔ شادی گھر ہی میں ہوئی تھی اس لیے دونوں میں سے کسی کو جدائی کا صدمہ بھی نہیں سہنا پڑا تھا ۔ وہ ماں کی بہت خدمت گزار تھیں اور ان کے حکم کو بے چوں چرا مان لیتیں ۔ اپنی ہوش مندی کے زمانہ میں بی بی صاحبہ انہیں اپنا دایاں ہاتھ کہتی تھیں ۔ بیٹی کی موت کی خبر انہیں یکلخت ختم کر سکتی تھی ۔ اختر حسین نے سب کو ایک کمرہ میں بُلا کر سمجھایا کہ جو ہونا تھا وہ تو ہو گیا ۔ اب رونے دھونے کا کوئی فائدہ نہیں ، اس طرح بی بی صاحبہ کو پتہ چل جائے گا ۔ ان سے ہر قیمت پر راز داری برتی جائے ، ایک علیحدہ کمرے میں لاش کو غسل و کفن دے کر باہر روانہ کر دیا جائے ، اگر بی بی صاحبہ ان کے بارے میں کچھ پوچھیں تو کوئی بہانہ کر دیا جائے یوں وہ خود بدحواس ہیں ۔ انہیں کسی بات کا ہوش ہی کہاں ہے ۔

اندرون حویلی میں کئی کمرے تھے ۔ درمیان میں ایک بڑا ہال تھا ، جس میں ایک طرف بی بی صاحبہ کا پلنگ بچھا تھا ، اس کے ساتھ ہی ان کی چوکی لگی تھی جس پر مستقلاً اُن کی جائے نماز بچھی رہتی ۔ وظائف کی کتاب اور تسبیح اسی پر رہتیں ۔ گھر کی تقریباً سبھی عورتیں بشمول نوکرانیاں اسی ہال میں سوتیں ۔ فیاض اور نثار وغیرہ علیحدہ کمروں میں سوتے ۔ ہال سے الگ ہٹ کر ایک خالی کمرہ تھا جس میں حامد کی ماں کی لاش کھڑکی سے لائی گئی تاکہ غسل اور کفن وغیرہ کے فریضے انجام دیے جا سکیں ۔ کمرے کے اندر جانے کا ایک ہی دروازہ تھا جسے اندر سے بند کر دیا گیا کیونکہ یہ دروازہ ہال سے نظر آتا تھا اور اتفاق سے بی بی صاحبہ کے پلنگ سے تو صاف نظر آتا ۔ عورتیں کھڑکی کے ذریعہ آجا رہی تھیں ۔

اختر حسین کی ہدایت کے مطابق گھر کے سب لوگوں نے اپنے لب سی لیے تھے اور آنسوؤں کو کسی اور وقت کے لیے اٹھا رکھا تھا ۔ بی بی صاحبہ کا زیادہ تر وقت اپنے بستر ہی پر گزرتا ۔ باورچی خانہ جانا انہوں نے تقریباً چھوڑ ہی رکھا تھا ۔ ایک دائی ان کی

خدمت پر مامور تھی جو وقت پر انہیں کھانا، ناشتہ کھلا دیتی۔ اس دن جب انہوں نے دیر تک کمرے کا دروازہ بند دیکھا اور گھر کے لوگوں کے برتاؤ میں فرق دیکھا تو انہیں پتہ نہیں کیا شک سا لگا۔ وہ اٹھ کر دروازے تک گئیں اور اسے کھولنے کی کوشش کی لیکن دروازہ تو اندر سے بند تھا ــــــــ وہ آکر اپنے بستر پر لیٹ گئیں۔ اُن کے اندر ایک نامعلوم قسم کی بے چینی بھر چکی تھی۔ سامنے سے جو گزرتا، وہ اس سے دریافت کرتیں۔

"بابو، یہ کمرہ بند کیوں ہے ــــــــ؟"

"کوئی ایسی بات نہیں۔ بین سے غلّہ آگیا تھا نا، جلدی میں اُسے یہیں رکھوا دیا گیا ہے۔"

بہانہ کرنے والے کو جلدی میں کوئی بات ہی نہ سوجھی۔

"بھنڈار میں مٹی کی کئی کوٹھیاں خالی پڑی ہیں، وہاں کیوں نہیں رکھوایا گیا ــــ؟"

بی بی صاحبہ اس حالت میں بھی گھر کی پوری خبر رکھتی تھیں۔ جب ان سے دو چار اوٹ پٹانگ قسم کے بہانے کیے گئے تو انہیں یقین ہو گیا کہ دال میں ضرور کچھ کالا ہے کچھ دیر تک تو وہ چُپ چاپ لیٹی رہیں، پھر جانے ان کو کیا خیال آیا، انہوں نے گھر گھر کے ایک ایک فرد کو بلانا شروع کیا، سب آتے گئے، جس کی تلاش تھی، جس کو آنا تھا نہ آیا۔ انہوں نے پوچھ ہی لیا۔

"آمنہ کہاں ہے ــــ؟"

آمنہ، حامد کی ماں کا نام تھا۔ اس سوال کا جواب دینے کے لیے اختر حسین کو بُلایا گیا۔ وہ اطمینان سے ان کے پاس آکر بیٹھ گئے۔ بی بی صاحبہ نے ان کو دیکھ کر اُٹھنا چاہا۔ لیکن انہوں نے ان کے پیر دابتے ہوئے اُٹھنے سے منع کیا۔ بی بی صاحبہ

تھوڑی دیر تو چپ رہیں، پھر اُن سے بھی پوچھا۔

"بابو، آمنہ کہاں ہے ــــــ؟ بہت دیر سے دیکھا نہیں ہے۔"

"جی، وہ ایک ضروری کام سے گئی ہیں۔"

"کہاں گئی ہے ــــــ؟ مجھ سے پوچھے بغیر تو کہیں جاتی نہ تھی، بغیر پوچھے کیسے چلی گئی ــــــ؟"

"آپ شاید سوئی ہوئی تھیں۔ مجھ سے پوچھ لیا تھا۔"

بی بی صاحبہ یہ سُن کر خاموش ہو گئیں۔ اختر حسین جانے لگے تو انہوں نے ان کا کان نزدیک لاکر بہت ہی آہستہ سے راز دارانہ انداز میں پوچھا۔

"بیٹا، کہیں پاکستان تو اُسے نہیں لے گیا ــــــ؟"

"جی ــــــ جی نہیں۔"

اختر حسین اس اچانک حملے سے گھبرا گئے۔

"میں اس لیے کہہ رہی ہوں بابو کہ پاکستان بہت دنوں سے میرے پیچھے پڑا ہوا ہے، میرا سب کچھ وہ لوٹ چکا ہے۔ ہو نہ ہو وہ پھر آیا ہے اور آمنہ کو اٹھا کر لے گیا ہے۔"

اختر حسین چپ چاپ باہر چلے گئے۔ لاش کو غسل دیا جا چکا تھا اور اب کفن پہنایا جا رہا تھا۔ اچانک بی بی صاحبہ اٹھیں اور کمرے کے دروازے کو پیٹنے لگیں۔

"پاکستان ــــــ ارے او نامراد، تو میرے بچے کو کھا گیا، میرے خاندان کو برباد کر دیا۔ اب میری بچی کو تو نہ کھا۔ خدا کے لیے یہاں سے واپس چلا جا۔ تجھ پر خدا کی مار ــــــ میں تیرے ہاتھ جوڑتی ہوں پاکستان، اب تو میرا پیچھا چھوڑ دے۔ میں نے تیرا کچھ نہیں بگاڑا، آخر تو مجھے کون سے گناہوں کی سزا دے رہا ہے ــــــ پاکستان ــــــ اے پاکستان ــــــ"

اختر حسین دوڑے دوڑے پھر آئے اور انہیں پکڑ کر بستر پر لے گئے۔ بیٹھتے بیٹھتے بی بی صاحبہ بے حال ہو گئیں۔ اختر حسین نے جلدی سے کورامین کی چند بوندیں پانی میں ملا کر پلائیں اور پاؤں دبا دبا کے انہیں سلانے کی کوشش کی۔ انہیں کچھ غنودگی سی آگئی تو جلدی سے لوگ لاش کو لے کر باہر گئے۔ ایک مختصر سی نمازِ جنازہ ہوئی اور حامد کی ماں کو خاموشی کے ساتھ قبرستان لے جا کر دفن کر دیا گیا۔

اس اچانک افتاد سے حامد اس قدر بوکھلا گیا کہ اس کا دماغ ماؤف ہو گیا۔ ماں کی موت اور وہ بھی اچانک چلتے پھرتے، ہنستے بولتے کوئی معمولی بات نہیں تھی یہاں کے مرنے کے بعد حامد کو ان کی قدر شدت سے معلوم ہوئی۔ انہوں نے زندگی بھر شوہر، بیٹے یا بھائیوں سے کبھی کوئی فرمائش نہیں کی تھی اور ہر حال میں راضی بہ رضا رہی تھیں۔ حامد کو رہ رہ کر ان کی خواہش کا خیال آتا، حامد کی شادی کا، اور اس کا سر جھک جاتا۔ نہ جانے کیا سوچ کر۔

اُن کے انتقال سے گھر کا نقشہ ہی بدل گیا۔ اختر حسین تو گم صم ہو کے رہ گئے تھے۔ وہ ان کی رفیقِ حیات تھیں لیکن بظاہر دونوں میں کوئی ایسی قربت نہ تھی۔ اختر حسین کو دیکھ کر وہ گھونگھٹ نکال لیتیں، ان سے براہ راست کوئی بات نہ کرتیں، ضرورت کی بات کہلوا دیتیں اور بس۔ مرنے کے بعد اختر حسین محسوس کر رہے تھے کہ وہ تو اُن سے اتنا قریب تھیں کہ اُن کے بغیر ان کی زندگی ہی بے معنی تھی۔ حامد کو انہیں دیکھ دیکھ کر اور بھی کوفت ہو رہی تھی۔ ادھر بی بی صاحبہ کی حالت یہ تھی کہ وہ اٹھتے بیٹھتے بیٹی کو تلاش کرتیں، اس کے بعد پھر پاکستان کو کوسنا پیٹنا۔ یہ ان کا روزانہ کا معمول بن گیا تھا۔ ماں کی موت حامد کے پاؤں میں بیڑیوں کی طرح جکڑ گئی تھی حالانکہ اس کا جانا بہت ضروری تھا۔ وہ صرف ایک ہفتہ کے لیے یہاں آیا تھا؛ اب دو ماہ ہو رہے تھے۔ وہ صرف ایک جوڑا کپڑا پہن کر آیا تھا اور اب وہ پھٹ چکا تھا۔ اختر حسین نے اسے

کھادی کے دو جوڑے کرتے پاجامے نکال کر دیے تھے۔ چامو کا خط برابر آتا اور وقتی طور پر اس کی تسلی ہو جاتی۔ وہ اختر حسین کی دل جوئی میں لگا رہتا۔ کانگریس ان کا محبوب موضوع گفتگو تھا، وہ ان سے کانگریس کے بارے میں طرح طرح کے سوالات کرتا اور وہ بڑی تفصیل سے اس کی ایک ایک بات کا جواب دیتے۔ اس وقت اُن کی آنکھوں میں روشنی چمک اٹھتی، لیکن اس کے بعد وہی سناٹا چھا جاتا جو ان کی زندگی پر چھایا ہوا تھا۔ اب ایک کانگریس کو وہ اور حامد کہاں تک کھینچتے۔ اجودھیا بابو اور کچھ قریبی دوست آجاتے تو وہ کچھ بہل سے جاتے۔ اچانک حامد کو چامو کا خط ملا کہ وہ فوراً کلکتہ چلا آئے ——— خط پاکر حامد بے چین ہو گیا، وہ جانتا تھا کہ اب اس کا یہاں ٹھہرنا خطرے سے خالی نہیں۔ چامو وقت کی پہچان کا ایک سلیقہ رکھتا تھا۔ حامد جانتا تھا کہ چامو اُسے وقت کے سمندر میں گم ہونے کے لیے نہیں چھوڑ سکتا، اگر ایسا ہو بھی گیا تو وہ متھ کے نکال کر لے جانا بھی جانتا ہے۔ حامد کے پاس چامو کے دیے ہوئے روپیوں میں سے ابھی اتنے باقی تھے کہ وہ آسانی سے کلکتہ جا سکتا تھا، پھر ساجد کے بھیجے ہوئے ایک ہزار روپے تھے جن کے بارے میں ابھی اس نے اس نے کوئی فیصلہ نہیں کیا تھا۔ ساجد نے اس کے بعد اُس کی کوئی خبر ہی نہ لی تھی۔ ماں کی موت کا سُن کر وہ ضرور آیا تھا لیکن بہت جلد واپس چلا گیا۔ دراصل اسے دلّی جانا تھا اپنے منسٹر کے ساتھ۔

جانے سے ایک روز قبل اس نے ساجد کے دیے ہوئے روپے بند لفافہ میں اختر حسین کی پڑھنے کی میز پر رکھ دیے۔ وہ بستر پر لیٹا آنکھیں بند کر کے کچھ سوچنے میں مصروف تھا کہ ایک آہٹ سے اس کی آنکھیں کھل گئیں۔ سامنے نثار کھڑا تھا۔ اس نے اشارے سے اُسے قریب بلایا۔ نثار نے اُسے اپنے کمرے کی طرف چلنے کا اشارہ کیا۔ حامد کی سمجھ میں نہ آیا کہ نثار اس سے کیا کہنا چاہتا ہے۔ ڈھاکہ جانے

سے قبل نثار کی اس سے خوب دوستی تھی۔ وہ نثار کی زبان ــــــ یعنی اشاروں کنایوں پر اتھارٹی مانا جاتا تھا۔ وہ نثار کو چاٹ کھلانے اور سینما دکھانے لے جاتا۔ نثار کے بس یہی دو شوق تھے، ان کی تکمیل کے لیے اسے ایک مددگار کی ضرورت تھی، سو حامد سے اس کی دوستی کی ایک مضبوط بنیاد موجود تھی۔ لیکن اب حامد وہ تمام اشارے کنائے بھلا چکا تھا۔ یوں وہ نثار سے اسی کی زبان میں دو چار باتیں کر چکا تھا۔ لیکن اب نثار اس سے کیا کہنا چاہتا تھا ــــــ؟

وہ اس کے ساتھ، اس کے کمرے میں آیا۔ نثار نے کمرے میں داخل ہو کر دروازہ بند کر دیا، پھر الماری کا تالا کھول کر ایک چھوٹی سی پٹاری نکال کر میز پر رکھی۔ پٹاری کا تالا کھول کر اس نے اس کا ڈھکن اُٹھایا۔ پٹاری میں بے شمار نوٹ اور ریزگاریاں تھیں۔ سوسو، دس دس اور پانچ پانچ کے بہت سے نوٹ۔ حامد یہ سب دیکھ کر حیرت زدہ رہ گیا۔ اس نے اشارے ہی میں نثار سے پوچھا۔

"یہ سب کیا ہے ــــــ کہاں سے آیا ــــ؟"

"کپڑے سی سی کر جمع کیا ہے۔"

نثار نے کچھ اشاروں اور کچھ گونگی زبان میں جواب دیا۔

"کیا کروگے اتنے روپیوں کا ــــ؟"

"جب بہت روپے ہو جائیں گے تو سب کو لے کر اماں، ابا کے پاس چلا جاؤں گا۔"

حامد حیرت زدہ ہو کر اس گونگے کی طرف دیکھنے لگا۔

"تم ان میں سے جتنے روپے چاہو، نکال لو۔"

نثار نے ہاتھ سے پٹاری کی طرف اشارہ کیا۔

"کیوں ــــــ؟"

"میں تمہارا بھائی ہوں نا، اور دوست بھی ہوں۔ میں جانتا ہوں کہ تمہیں روپیوں کی بڑی ضرورت ہے۔"

نثار نے کہا۔

حامد کی آنکھوں میں آنسو آگئے۔ نثار دوڑ کر اپنا رومال اٹھالیا اور اس سے نہیں نہیں کہتے ہوئے آنسو پونچھ کر خاموش ہو جانے کی التجا کرنے لگا۔

"تم یہ سب روپے رکھ لو۔ مجھے ضرورت نہیں ہے۔"

حامد نے نثار سے کہا۔

"تم بھی مجھے اپنا نہیں سمجھتے ہو نا ——— ؟"

نثار کی زبان ضرور بند تھی، لیکن اس کا چہرہ کھلی ہوئی کتاب تھا۔ حامد اس سے بے ساختہ لپٹ گیا اور کہنے لگا۔

"مجھے غلط نہ سمجھو میرے بھائی۔ تم مجھے غلط نہ سمجھو میرے بھائی۔ تم مجھے بے حد عزیز ہو۔ لیکن یہ روپے تم ایک مقصد کے پیش نظر جمع کر رہے ہو، اللہ تمہیں اس میں کامیاب کرے۔ میرے پاس ضرورت بھر کے روپے ہیں اور ......"

یک بیک خیال آیا کہ یہ سب باتیں وہ کس سے کہہ رہا ہے ——— ؟

نثار تو زبان سے ادا کی ہوئیں ——— باتیں نہیں سمجھتا۔ اس نے نثار کو الگ کر کے یہ تمام باتیں اشارے سے سمجھائیں۔ نثار نے جواب دیا۔

"میرے پاس بہت روپے ہیں اور تم جانتے ہو کہ روپے کمانا میرے لیے کوئی مشکل کام نہیں۔ روپے کم ہو جائیں گے تو میں مشین چلا کر بہت کما لوں گا۔ لیکن تم روپے ضرور لے لو۔"

حامد مشکل میں پڑ گیا۔ معاملہ صرف روپیہ لینے کا نہیں تھا بلکہ نثار کے جذبات کا بھی تھا جن کے بارے میں ابھی ابھی حامد کو پتہ چلا تھا کہ وہ بہت نازک ہیں لیکن

اس نے فیصلہ کرنے میں دیر نہیں لگائی۔ چھوٹے چھوٹے نوٹوں کو خوب گن کر اس نے پانچ سو روپے نکالے اور نثار سے بولا۔

"اب تو خوش۔"

نثار کی آنکھیں چمکنے لگیں۔ اس نے پٹاری میں تالہ لگایا اور اسے الماری میں بند کر دیا۔ حامد اٹھتے ہوئے بولا۔

"اچھا میں چلتا ہوں۔ کل صبح پھر ملاقات ہو گی۔"

وہ چپ چاپ اپنے بستر پر آ کر لیٹ گیا۔ اس کے تجربات میں اچانک صدیوں کا اضافہ ہوا تھا۔ صدیوں کے تجربات اس پر سے گذر گئے تھے۔ آنکھوں میں آنسو بار بار آجاتے اور وہ انہیں رومال سے خشک کرتا جاتا۔ نثار کی شخصیت نے اس کی بصیرت میں بے پناہ اضافہ کیا تھا جب کہ نثار کے بارے میں اس نے کبھی کوئی بات نہیں سوچی تھی۔ وہ دیر تک بستر پر پڑا کروٹیں بدلتا رہا اور اپنے آنسو خشک کرتا رہا۔ بہت دیر کے بعد جب وہ اپنے حواس میں واپس آیا تب اُسے محسوس ہوا کہ تجربے کے اس بوجھ کو بھی وہ برداشت کرلے گا۔

دوسری صبح اُسے جانا تھا۔ فیاض سے ابھی تک اس کی کوئی خاص بات نہیں ہو سکی تھی۔ فیاض دن بھر کے بعد تھکا ہارا گھر واپس آتا تو خود حامد کی ہمت نہ ہوتی کہ اُسے تنگ کرے۔ دکان پر جا کر اس سے گفتگو ہو سکتی تھی لیکن حامد گھر سے نکلنا موقوف کر چکا تھا۔ وہ صبح ہی اس کے بستر پر جا دھمکا۔ فیاض کی آنکھیں اب بھی کھلی ہوئی تھیں۔ نیند کے ڈورے اُن میں تیر کر اپنی زندگی پوری کر رہے تھے۔

"بھیا، آپ سے تو میری کوئی بات ہی نہ ہو سکی اور آج میں واپس بھی جا رہا ہوں ـــــــ"

فیاض آنکھیں ملتا ہوا اُٹھ بیٹھا اور حامد کو حیرت سے تکتے ہوئے بولا۔

"میاں، تم تو باہر سے آئے ہو، جو لوگ یہاں ہیں، وہ مجھ سے بات نہیں کرتے۔"

"ایسی بات نہیں۔ آپ خود مصروف رہتے ہیں اور پھر یہاں ہے بھی کون' ابا ہیں تو ان کی الگ ہی دنیا ہے۔"

"حامد، ایک نانی اماں تھیں اس گھر میں، جو کسی کی کمی محسوس نہیں ہونے دیتی تھیں۔ ان کی بدحواسی کے بعد تو ہم لوگوں کا یہاں کوئی پرسان حال نہیں رہا۔ اماں بے چاری تو شروع ہی سے خاموش تھیں۔ جب تک نانی اماں زندہ رہیں تب تک تو خیر ہم لوگ رہ لیں گے، خدانخواستہ وہ نہ رہیں تب کیا ہوگا، سوچ سوچ کے دل دہلتا ہے۔"

"بھیا، یہ بات تو آپ صحیح کہہ رہے ہیں کہ نانی اماں نے ہم لوگوں کو کبھی کوئی کمی محسوس نہ ہونے دی۔ اللہ ان کی حیات کو جاودانی کر دے۔ لیکن پھر بھی آپ کو اس طرح نہیں سوچنا چاہیے۔ آخر آپ گھر کے بڑے ہیں اور آپ پر ذمہ داریاں ہیں۔"

"میاں، یہ باتیں تو صرف تم کہتے ہو، اور کوئی نہیں کہتا اور تم بھی کیا____ تم تو خود یہاں سے جا رہے ہو اور پھر نہ جانے کب آؤ۔"

"بھیا، یہ باتیں کوئی کسی کو نہیں کہتا، اپنے آپ یہ باتیں سمجھ میں آجاتی ہیں بات چھڑی اس لیے یہ باتیں میری زبان سے نکل گئیں ورنہ میں بھی آپ سے نہیں کچھ کہتا۔"

فیاض خاموش ہو گیا، دوسری طرف منہ پھیر کے کچھ سوچتا رہا، پھر آہستہ سے بولا۔

"کیا اب تک میری شادی نہیں ہو جانی چاہیے تھی____؟ میرے سبھی دوستوں کی شادیاں ہو گئیں۔"

"بالکل ہو جانی چاہیے تھی بلکہ اس میں کافی تاخیر ہو چکی ہے۔ ابا اور اماں

کو اس کی فکر تھی لیکن دراصل آپ کے لائق کوئی لڑکی ہی نہ ملی۔ میں ابا سے پھر ذکر کروں گا۔"

"تمہیں اب ابّا سے کچھ کہنے کی ضرورت نہیں۔ میں اب اپنی شادی خود کرونگا، آخر ابا چاہیں گے تب بھی کیسے کریں گے، اماں رہتیں تو اور بات تھی۔"

"شادی تو آپ ہی کو کرنی ہے، لیکن ابّا کو آپ پھر بھی درمیان میں رہنے دیں تو بہتر ہے۔ آخر ہم لوگ انہیں آج تک کوئی خوشی نہ دے سکے۔"

"ہم سب کی کمی ساجد پوری کر دے گا، تم اطمینان رکھو ______"

"پھر بھی بھیا، آپ سے میری درخواست ہے کہ کوئی ایسا کام نہ کریں جس سے ابا کو تکلیف پہنچے۔"

"بھائی صاحب ______ میں صرف پیسے جمع کر رہا ہوں اور جب خوب پیسے ہو جائیں گے تو شادی کرلوں گا بس۔ ابا کو تکلیف پہنچانے کا کیا سوال ہے۔ میں پڑھا لکھا نہیں، لیکن اتنا تو جانتا ہی ہوں کہ جس کے پاس پیسہ نہ ہو، اس کی کوئی عزت نہیں ہوتی، دنیا میں اسے کوئی نہیں پوچھتا۔ اس لیے میں عزت حاصل کرنے کی کوشش میں لگا ہوں ______"

"جیسی آپ کی مرضی۔ لیکن خاندان پر کوئی دھبہ نہ آنے دیجیے گا۔"

"حامد بابو ______ میں جانتا ہوں کہ آپ کو بھی اس وقت پیسوں کی بڑی سخت ضرورت ہے۔ افسوس کہ میں آپ کی کوئی مدد نہیں کر سکتا۔ دراصل میں اپنے جمع کیے ہوئے پیسوں میں سے اپنے خرچ کے لیے بھی کچھ نہیں نکالتا۔"

"بھیا، میں نے تو آپ سے یا اور کسی سے پیسوں کے لیے تو کچھ نہیں کہا۔ پھر آپ کو افسوس کرنے کی ضرورت ______؟ آپ کے ذہن میں یہ بات آئی ہی کیوں کر ______؟"

"تم نے کہا تو نہیں، لیکن میں نے اس لیے کہہ دیا کہ کسی قسم کے شک و شبہ کی گنجائش نہ رہے"

"نہیں، آپ ذہن سے اس قسم کی بات نکال دیجیے۔ میرے لیے آپ لوگوں کی محبت اور ہمدردی ہی بہت ہے۔ میں کسی کے پیسوں پر نظر کیوں رکھنے لگا۔ خدا کرے کہ آپ اپنے پیسوں سے اپنے لیے خوشیاں خرید سکیں۔"

فیاض کچھ نہ بولا، چپ چاپ اس کی باتیں سنتا رہا۔ وہ حامد کی آنکھوں میں امڈتے ہوئے اس طوفاں کو بھی نہیں دیکھ سکا جس کا گلا حامد نے اندر ہی اندر گھونٹ دیا تھا۔

۴۰

دن کی تمازت شروع ہونے سے قبل حامد نے بہار شریف چھوڑ دیا۔ اختر حسین نے ڈبڈبائی آنکھوں سے اُسے رخصت کیا۔ بی بی صاحبہ سے وہ جاتے وقت ملا ضرور، لیکن ان کی بدحواسی کے باوجود اس کی ہمت نہیں ہوئی کہ وہ ان سے جانے کے بارے میں کوئی بات کرے۔ نثار اور فیاض کو اس نے جاتے وقت گلے لگایا۔

واپسی کا سفر پچھلے سفر سے مختلف تھا۔ نوّے ہزار پاکستانی فوجیوں کے ہتھیار ڈالنے کا ہر جگہ ذکر تھا۔ ایک کروڑ شرنارتھی (جن کو اب یہاں مہمان کا درجہ مل گیا تھا) کی واپسی کے بارے میں خیال آرائیاں ہو رہی تھیں۔ ایک خیال یہ تھا کہ ان میں بہت سے لوگ واپس نہیں جائیں گے اور ہندوستانیوں کی بھیڑ میں کھو جائیں گے۔

حامد اس دفعہ بھی چپکا بیٹھا رہا۔ وہ اپنی ہی نگاہ میں ایک ایسا غیر ملکی تھا۔ جو لوگوں کی نظروں سے بچتا پھر رہا تھا۔ یہ بات اور تھی کہ اس کے پاس کسی غیر ملک کی شہریت بھی نہیں تھی، اگر تھی تو صرف ہندوستان کی۔ ہوڑہ اسٹیشن پر چامو موجود تھا۔ وہ بڑی گرم جوشی سے ملا اور حامد کو ایک طرف لے جا کر بولا۔

"تم لوگوں کے نیپال جانے کا انتظام ہوگیا ہے۔ وہاں سے پاکستان جانے کے لیے ہوائی ٹکٹ کا بھی انتظام ہو جائے گا۔"

حامد کے لیے یہ ایک بڑی خوش خبری تھی، لیکن نجانے کیوں چامو کی بات سُنکر وہ بے حس سا ہوگیا۔ اس کے انداز بیان سے لاتعلقی جھلک رہی تھی۔ چامو کو بھی اس کے رویّے پر کچھ حیرت ہوئی، لیکن وہ کچھ بولا نہیں۔ دونوں گھر واپس آئے۔ حامد کو دیکھ کر نازیہ کی آنکھیں چمک اٹھیں اور اس کا چہرہ روشن ہوگیا، دونوں بچّے اس سے لپٹ گئے۔ نازیہ کافی حد تک سنبھلی سنبھلی نظر آرہی تھی، بچّے بھی صاف ستھرے اور صحت مند تھے۔ حامد سب کو خوش دیکھ کر بہت خوش ہوا۔ نازیہ تو اس کے گھر والوں کو زیادہ جانتی ہی نہ تھی، حامد نے اسے اپنی ماں کی موت کی خبر دی تو وہ بہت غم گین ہوگئی۔

چامو نے حامد کو بتایا کہ پاکستان تک جانے میں کئی ہزار روپے خرچ ہوں گے جن کے لیے اس نے یہ انتظام کیا ہے کہ اس کے ایجنٹ نے اس کے کہنے پر بدرالاسلام کا ڈھاکہ والا بنگلہ فروخت کردیا ہے کیونکہ بدرالاسلام کے زندہ بچ رہنے کی یوں بھی کوئی امید نہیں ہے۔ حامد کو اس خبر سے ایک دھچکا سا لگا۔ چامو اس کی کیفیت کو پہچان گیا اور بولا۔

"وہاں تو حالت یہ ہے کہ اندھے کی گائے بیاتی ہے اور لوگ چُھکالے لے کر دوڑ رہے ہیں، جس کے جو ہاتھ لگ رہا ہے، وہ ہتھیا رہا ہے، کوئی کسی کو پوچھنے والا

نہیں ہے۔ بنگلہ پر تو قبضہ ہو ہی گیا تھا، میں نے بہت دِقت اور کوششوں سے اُسے ٹھکانے لگایا ہے۔ یوں سمجھو کہ ڈوبی ہوئی رقم میں سے کچھ مل گیا ورنہ بنگلہ تو گیا ہی تھا اور پیسہ بھی نہ ملتا۔

بات تو ٹھیک ہی تھی۔ اس نے بنگلہ بیچ کر اُن لوگوں کا کام چلا دیا تھا۔ یہ کوئی ایسی بُری بات بھی نہیں تھی۔ چامو نے اُسے بتایا کہ اس کا ایک خاص آدمی ان لوگوں کو بحفاظت کٹھمنڈو لے جائے گا اور ہوائی جہاز پر سوار کر کے واپس آئے گا۔ اس نے کچھ ضروری سامان کے خرید و فروخت کے لیے اس کو کچھ روپئے بھی دیے۔ تیسرے روز یہ لوگ بذریعہ ٹرین روانہ ہوئے۔ اسٹیشن پر چامو، حامد اور اس کے بچّوں سے لپٹ کر خوب رویا۔ اس کی بیوی بھی بھتیجی کی جدائی پر آنسو بہاتی رہی۔ وہ تو سب کو کلکتہ ہی میں روکنا چاہتی تھی۔ کلکتہ میں نازیہ کو اس نے ایک اسکول میں ملازمت بھی دلا دی تھی۔ لیکن چامو اس کا مخالف تھا۔ اس کا کہنا تھا کل کلاں کو اگر کسی نے کہہ دیا کہ یہ لوگ بنگلہ دیش سے بھاگے ہوئے بہاری ہیں تو پھر لینے کے دینے پڑ سکتے ہیں۔

چامو نے اپنے جس آدمی کو ان لوگوں کے سامنے کیا تھا، وہ ایک پُر اسرار شخصیت کا مالک تھا۔ وہ کسی دوسرے ڈبّے میں بیٹھا لیکن ہر اسٹیشن پر ان کی خیریت دریافت کرنے ان کے ڈبّے میں آجاتا۔ راستہ بھر اس نے ان لوگوں کا بہت خیال رکھا۔ صبح میں یہ لوگ پٹنہ پہنچے۔ اسٹیشن پر غسل وغیرہ سے فارغ ہو کر یہ لوگ بذریعہ بس رکسول روانہ ہوئے۔ نو بجے رات رکسول پہنچے۔ رات بھر ایک ہوٹل میں رہے۔ دوسری صبح رکشوں پر بیراٹ نگر پہنچے۔ بیراٹ نگر غیر ملکی سامانوں کا دوسرا ہانگ کانگ ہے۔ وہاں سے نیپال روڈ ویز کی بس کٹھمنڈو تک جاتی ہے شام میں یہ لوگ کٹھمنڈو پہنچے۔ کٹھمنڈو میں وہ ایک معمولی ہوٹل میں ٹھہرے۔

جہاں ان کی طرح بے شمار بہاری ٹھہرے ہوئے تھے۔ نیپال کے ہندوؤں کو بہاریوں کا ہمدرد پاکر حامد کو بڑا تعجب ہوا۔ کئی ہزار بہاری نیپال کے راستے پاکستان جا چکے تھے اور اب کئی ہزار جانے کے انتظار میں تھے۔ مقامی لوگ ان کی بڑی مدد کر رہے تھے۔ جامو کے آدمی نے، جس نے اپنا نام راجو بتایا تھا، حامد کو بتایا کہ یہاں کچھ دن انتظار کرنا پڑے گا۔ ہوائی جہاز پاکستان سے آتے ہیں اور بہاریوں کو لے جاتے ہیں۔ لیکن اتنے چھوٹے ہوتے ہیں کہ زیادہ افراد اُن میں جا ہی نہیں سکتے۔ سبھی لوگ جانے کے انتظار میں اپنا وقت کاٹ رہے تھے۔ حامد کے لیے یہ وقت بہت کٹھن تھا۔ وہ کسی وقت بھی اُڑ کر پاکستان پہنچ جانا چاہتا تھا۔ اُسے درمیانی لمحے بہت گراں گزرتے ——— اور اتفاق یہ کہ اس کی

———

ساری زندگی ہی درمیانی لمحوں کے درمیان اٹکی ہوئی تھی۔ وہ دن بھر ہوٹل کے کمرے میں بند رہتا۔ راجو ان کے لیے کھانے پینے کا سامان لے آتا اور بچوں کو باہر گھمانے بھی لے جاتا۔ نازیہ یوں تو پُرسکون تھی لیکن حامد اچھی طرح جانتا تھا کہ اُس کی یہ کیفیت نارمل نہیں ہے۔ اس کے اندر روح اور جسم نے الگ الگ اپنے ڈیرے جما لیے تھے اور ان دونوں میں کوئی رشتہ باقی نہیں رہا تھا۔ ایسا لگتا جیسے وہ وقت کی لہروں کے ساتھ بہی جا رہی تھی۔ حامد نے سوچ رکھا تھا کہ کراچی پہنچنے کے بعد وہ اُسے کسی بڑے ڈاکٹر سے دکھائے گا اور اس کا باقاعدہ علاج کرائے گا۔

حامد، وہاں دوسرے بہاریوں کو دیکھ دیکھ کے حیرت زدہ ہوتا رہتا۔ وہ دن بھر سیر سپاٹے میں مصروف رہتے، فلمیں دیکھتے، رنگین کپڑے، گھڑیاں اور ریڈیو خریدتے اور رات میں اتنی دیر تک خوش گپیاں کرتے کہ وہاں ٹھہرے ہوئے لوگوں کی نیند خراب ہو جاتی۔ ان کی لڑکیاں بناؤ سنگھار میں لگی رہتیں۔ کٹھمنڈو میں جب یوں ہی پانچ چھ روز بیت گئے تو حامد نے بھی کوشش کی کہ وہ بھی

ان لوگوں کی طرح خوش و خرم رہے اور گزرے ہوئے ایام اور آنے والے وقت سے بالکل بے پروا ہو جائے ——— لیکن ہزار کوشش کے باوجود وہ ایسا نہیں کر سکا تھا۔ شاید یہ چیز کوشش کر کے حاصل نہیں کی جاتی تھی۔

وہ روز راجو سے دریافت کرتا کہ آخر ان کے جانے کا وقت کب آئے گا اور راجو اسے تشفّی دے دیتا کہ وہ کوششوں میں لگا ہوا ہے کہ وہ جلد سے جلد یہاں سے روانہ ہو جائیں۔ چامو نے حامد کو چار ہزار روپے ڈالر میں منتقل کرا کے دیے تھے، بنگلے کی کیا قیمت اس نے وصول کی تھی، نہ چامو نے اسے بتایا تھا نہ حامد نے اس سے پوچھا تھا۔ سارا خرچ بشمول ہوائی ٹکٹ راجو کے ذمہ تھا، حامد کو ان باتوں کی فکر نہیں کرنی تھی۔ اس نے چامو کے دیے ہوئے ڈالر بہت حفاظت سے رکھ چھوڑے تھے۔ اسے یہ احساس بہت شدّت سے تھا کہ وہ ایک بالکل نئے ملک میں جا رہا ہے اور پتہ نہیں وہاں کیسے حالات اس کے منتظر ہیں۔ وہ وقت سے آنکھیں ملانے کا حوصلہ کھو چکا تھا کہ پتہ نہیں اس کا یہ حوصلہ اسے کب کون سی سزا دلوا دے۔

ایک رات راجو دیر سے آیا۔ نازیہ اور بچّے تو سو چکے تھے۔ حامد یوں بھی نیند کی لذّت کھو چکا تھا، وہ سوتا ضرور تھا لیکن صرف دوسروں کے لیے۔ راجو نے دروازہ تھپتھپایا تو حامد فوراً باہر نکل آیا۔

"بھیا، آپ لوگوں کے جانے کا انتظام ہو گیا ہے۔ کل صبح سات بجے فلائٹ ہے۔ میں پانچ بجے صبح میں آؤں گا ٹیکسی لے کر۔ آپ تیار رہیے گا۔ میں نے ٹکٹ لے لیا ہے۔"

حامد کو محسوس ہوا جیسے اس کا دل اُچھل کر حلق تک آ گیا۔ راجو تو اتنا کہہ کر چلا گیا لیکن وہ دیر تک یوں ہی کھڑا رہا۔ ہوش ٹھکانے آنے کے بعد وہ اندر

آیا تو اس کا جی چاہا کہ بے خبر سوتی ہوئی نازیہ اور بے سدھ پڑے ہوئے بچوں کو اٹھا دے کہ رات بھر ایک نئے ملک میں جانے کا جشن منا سکیں، لیکن اس نے اپنے آپ کو اس ارادے سے باز رکھا۔ وہ اپنی بیوی بچوں کو ابھی سے نئے ملک کے معنی نہیں بتانا چاہتا تھا۔

وہ اپنی جگہ پر لیٹ کر آگے کی باتیں سوچنے لگا۔ کراچی میں اصغر حسین موجود تھے، ان کا پتہ بھی اس کے پاس تھا۔ لیکن اصغر حسین کو اس کے آنے کی کوئی خبر نہیں تھی۔ اصغر حسین کو اس نے برسوں قبل دیکھا تھا، ان کا چہرہ بھی اسے صاف صاف یاد نہیں تھا۔ کراچی میں اور کوئی ایسا نہیں تھا جس کے ہاں وہ جاتا۔ اس نے بہت سوچ سمجھ کے یہ فیصلہ کیا کہ وہ وہاں پہنچتے ہی اصغر حسین کے ہاں جائے گا اور ان کے مشورہ ہی سے آگے کا کوئی پروگرام بنائے گا۔ اُسے یہ پتہ نہیں تھا کہ اصغر حسین اس سے کس طرح ملیں گے، لیکن اس کے پاس ان کے ہاں جانے کے سوا اور کوئی چارہ ہی نہیں تھا۔ وہ رات بھر طرح طرح کی باتیں سوچتا رہا' یہاں تک کہ صبح ہو گئی۔ اس نے نازیہ کو آہستہ سے اٹھا کر تیار ہو جانے کو کہا۔ اُن کے پاس زیادہ سامان تو تھا نہیں۔ ایک سوٹ کیس تھا جو چامو کی بیوی نے دیا تھا اس میں ان لوگوں کے وہ کپڑے تھے جو کلکتہ میں خریدے گئے تھے۔ پانچ بجے راجو ٹیکسی لے کر آگیا اور وہ سب ہوائی اڈہ روانہ ہو گئے۔ وہاں پہنچ کر پتہ نہیں راجو کیا بھاگ دوڑ کرتا رہا۔ جہاز میں بیٹھنے کا اعلان ہوا تو وہ حامد سے لپٹ گیا۔ اس نے راجو سے وعدہ کیا کہ کراچی سے وہ کلکتہ آئے گا اور راجو کو بھی کراچی لے جائے گا۔ جہاز اڑنے لگا تو ٹیرس پر راجو کا سفید رومال سب سے بلندی پر لہرا رہا تھا۔

۳۱

نذر محمد ایک بنگالی افسر تھا۔ سکنڈ لفٹننٹ کے عہدے تک وہ مشرقی پاکستان میں تعینات رہا لیکن عہدے کی ترقی کے ساتھ ہی اُسے مغرب کی طرف تبادلے کا پروانہ بھی مل گیا۔ یہ گویا شہناز کے لیے خدائی امداد تھی۔ وہ نذر محمد سے محبّت کرتی تھی اور اس کے لیے سب کچھ کرنے، سب کو چھوڑ دینے کو تیار تھی لیکن اس کے اندر حوصلہ کی بڑی کمی تھی۔ گھر کے تقریباً سبھی افراد بنگالیوں کے بڑے مخالف تھے۔ دن رات ان کے خلاف زہر اگلا کرتے۔ خود شہناز کا بھی بنگالیوں کے بارے میں کوئی بہت اچھا خیال نہیں تھا۔ اب یہ الگ بات ہے کہ کیوپڈ نے اپنی ستم ظریفی کی مشق کے لیے صرف شہناز ہی کو چُنا۔ نذر محمد شہناز کی ایک سہیلی کا بھائی تھا اور سہیلی ہی کے گھر پر اُن کی محبت پروان چڑھی پھلی پھولی۔ شہناز کے گھر والوں کو اس کی ذرا بھنک نہ مل سکی۔ اگر وقت نے اپنے دامن میں ایسا کوئی ٹائم بم چھپا کر رکھا تھا جو شہناز کی زندگی برباد کر دیتا تو اس کے پھٹنے سے قبل ہی نذر محمد کا تبادلہ مغربی پاکستان ہو گیا۔ اسے فوراً جانے کا حکم ملا تھا۔ اس لیے ان لوگوں کے لیے اِس کے سِوا اور کوئی راستہ نہیں رہا کہ

—— ڈھاکہ کی ایک چھوٹی سی مسجد میں نکاح کا رجسٹر رہتا تھا۔ مسجد کے امام نکاح پڑھا دیتے اور گواہوں کا انتظام بھی کر دیتے۔ نذر محمد اور شہناز نے مسجد جا کر ایجاب و قبول کیا اور نکاح نامہ لے کر مغرب کی طرف پرواز کر گئے۔

شہناز کبھی کبھار اپنی سہیلی کے ہاں رات میں رہ جایا کرتی تھی۔ ایسی صورت میں وہ اپنے گھر فون ضرور کر دیا کرتی۔ اس روز وہ دیر تک نہیں آئی تو اس کی ماں نے سہیلی کے گھر فون کیا اور یہ اندوہناک خبر سُن کر غش کھا گئی۔ اتفاق سے عظیم الدین وہیں پر موجود تھے، گھبرا کر انہوں نے جو فون کا چونگا کان سے لگایا تو اس خبر پر انہیں دیر تک یقین ہی نہیں آیا کہ شہناز ایسا بھی کر سکتی ہے ــــــــ؟ لیکن حقیقت، حقیقت ہوتی ہے، جس پر یقین نہیں آتا۔ ہرگز نہیں آتا، پھر بھی یقین کرنا ہی پڑتا ہے۔

عظیم الدین نے اس سانحہ کے بعد گھر سے نکلنا ہی چھوڑ دیا۔ ان کی بیوی اور دوسرے بچے بھی ہفتوں منہ لپیٹے گھر میں پڑے رہے۔ لیکن اس طرح آخر کب تک کام چل سکتا تھا۔ عظیم الدین تو باہر آنے کا حوصلہ ہی کھو چکے تھے، لیکن ان کے داماد اور بیٹے جب باہر آئے تو باہر کی فضا اور رنگ میں رتی برابر بھی فرق نہیں آیا تھا۔ ہوا ویسے ہی بہہ رہی تھی اور ندیوں میں حسب معمول بہت سارا پانی بہہ چکا تھا۔

نذر محمد کے مغربی پاکستان آتے ہی ملک میں انتخابات ہوئے اور بنگلہ دیش کا نام سطح پر آیا۔ مشرقی پاکستان میں حکومت نے اپنے ہی عوام کے خلاف زبردست جنگ چھیڑ دی۔ آٹھ دس مہینے کے بعد اس جنگ کا نتیجہ سامنے آنے لگا۔ عوام کا پلڑا بھاری تھا۔ اس وقت مغربی پاکستان کے انتظامیہ اور فوج میں گھسے ہوئے بنگالیوں کے درمیان بے چینی شروع ہوئی۔ حکومت کی نگاہ اور نگرانی کے باوجود ہند و پاک جنگ کے دوران بہت سے بنگالی افسروں نے دوسرے ملکوں میں پناہ لی، کچھ طیاروں پر بیٹھ کر دشمن کے علاقے میں بم برسانے گئے اور سب کچھ پھینک پھانک کر وہیں کے ہو رہے۔ ملک کے اندر کئی دیکھے ان دیکھے محاذ کھل گئے تھے لیکن حکومت صرف اسی محاذ پر جُٹی تھی جو اس نے خود کھولا تھا۔ نذر محمد ان افسروں میں تھا

جو ملک سے وفاداری کی رسم کو اپنی قسم بنا چکے تھے۔ اس نے مشکل لمحوں میں کئی بار اس کا ثبوت بھی دیا۔ حکومت نے اس کے جذبۂ وفاداری سے خوب خوب فائدہ اٹھایا۔ اسے بڑے عہدوں پر جلدی جلدی ترقی دی گئی۔ ریڈیو اور ٹی وی پر اس کے انٹرویو نشر کیے گئے، انعامات سے نوازا گیا۔ یہ سلسلہ اس وقت تک جاری رہا جب تک کھیتوں میں چڑیاں چگنے میں مصروف رہیں۔ ادھر چڑیاں کھیت چگ کر اڑ گئیں، ادھر میاں نذر محمد پر مہربانیوں کا سلسلہ رک گیا۔ پہلے پہل تو اسے دفتر کے کمروں میں غیر اہم عہدوں پر رکھا گیا، پھر مختلف الزام لگا کر اسے نوکری سے برخواست کر دیا گیا۔ وہ تو کہیے کہ اس کے نام کے آگے کرنل لگ چکا تھا اور عرب ممالک میں پاکستانی فوج کا نجانے کیوں ابھی تک احترام باقی تھا جس کے صلے میں اسے سعودی عربیہ کی ایک امریکی فرم میں ایک بہت اچھا عہدہ مل گیا۔

مشرقی پاکستان میں جب بہاریوں کے لیے باقاعدہ مقتل کُھلے تو نذر مُحمّد نے بڑی کوششوں سے اپنی جان پر کھیل کر شہناز کے والد عظیم الدین کو بچایا۔ اس کی محنت اور کاوش کی ایک الگ داستان ہے۔ عظیم الدین اتنے دنوں تک دماغی اور اعصابی تناؤ میں رہنے کے بعد اپنا دماغی توازن کھو چکے تھے۔ چنانچہ جب وہ فوج کے ہوائی جہاز کے ذریعہ کراچی آئے تو شہناز کو نہ پہچان سکے۔ شہناز نے انہیں بڑے بڑے ڈاکٹروں کو دکھایا۔ اس کا پورا جتن کیا کہ وہ اپنے حواس میں لوٹ آئیں۔ لیکن ایسی دیوانگی کی حالت میں چند ہی ہفتوں کے بعد عظیم الدین اللہ کو پیارے ہو گئے۔ شاید مغربی پاکستان کی زمین کی پکار ہی انہیں یہاں کھینچ لائی تھی ورنہ موت تو ان کی مشرقی پاکستان ہی میں ہو چکی تھی۔

کراچی بہت بڑا شہر تھا۔ لیکن حامد کلکتہ جیسے وسیع شہر سے آرہا تھا اس لیے اس پر کراچی کا کوئی رُعب نہیں پڑا۔ وہ تو وہاں کی اجنبیت سے گھبرا رہا تھا اور بیوی بچوں کے سامنے گھبراہٹ پر قابو رکھنے کی کوشش میں اس کی یہ کیفیت اور بھی ظاہر ہو رہی تھی۔ اس نے بظاہر بڑے سکون کے ساتھ ایک ٹیکسی پر سب کو بٹھایا ٹیکسی والے کو اصغر حسین کا پتہ بتایا۔ ٹیکسی بارونق سڑکوں سے گزرتی رہی۔ اس کے بچے شہر دیکھتے رہے اور وہ اس دیوار پر لکھی تحریر کو پڑھنے کی کوشش کرتا رہا جو اس کے سامنے کھڑی تھی۔ ٹیکسی ایک عمارت کے نیچے رک گئی۔ عمارت کی پیشانی پر اصغر حسین کے نام کا بورڈ لگا تھا۔ اس نے پاس کھڑے ہوئے ایک شخص سے پوچھا۔

"کیوں بھئی ــــــــ اصغر حسین صاحب یہیں رہتے ہیں نا ــــ؟"

"ہاں جی ــــ ہاں جی ــــ وہ دوسرے نمبر والی گھنٹی بجالو۔"

"سیڑھیوں کے پاس دروازے پر کئی گھنٹیاں لگی تھیں جن پر نمبر لکھے تھے۔ اس نے تھرتھراتے ہاتھوں سے دو نمبر کی گھنٹی بجائی۔ دوسری منزل سے ایک گورے سے لڑکے نے، جس کی شکل و شباہت پر لڑکی کا شبہ ہوتا تھا، نیچے جھانکا۔

"کون ہے۔ کس سے ملنا ہے ــــ؟"

"اصغر حسین صاحب ہیں ــــ؟"

"ہیں جی ــــ آپ کا نام ــــ؟"

"آپ ان سے کہہ دیجیے کہ حامد آیا ہے، بہار شریف سے۔"

لڑکا اندر چلا گیا۔ کچھ دیر کے بعد ایک معمر شخص سیڑھیوں سے اترا اور حامد سے لپٹ گیا۔

"ارے حامد بیٹے ــــ تم یہاں کیسے آگئے ــــ؟ آنے کی خبر تو دی ہوتی۔ میں گاڑی بھیج دیتا۔"

اگر اصغر حسین کے نقوش اس کی ماں سے ملتے نہ ہوتے تو وہ انہیں پہچان بھی نہ پاتا۔ اصغر حسین کو اس نے بہت بچپن میں دیکھا تھا اور اس اصغر حسین کا دور دور تک پتہ نہیں تھا۔ اصغر حسین دیر تک حامد کی ماں کے انتقال پر اظہار افسوس کرتے رہے۔ پھر اچانک انہیں کچھ خیال آیا۔

"ارے، تم لوگ ابھی تک یہیں کھڑے ہو، چلو چلو، اوپر چلو ——— شبنم آؤ ان لوگوں کو لے جاؤ۔"

انہوں نے آواز دی اور ایک بے حد فیشن زدہ لڑکی بال جھلاتی ہوئی نیچے آگئی۔ ایک نظر حامد، نازیہ اور بچوں پر ڈالی اور پھر جیسے کچھ سمجھ سی گئی۔ لیکن منہ سے کچھ بولی نہیں۔

"بیٹا یہ تمہارے حامد بھیا ہیں، تمہاری بڑی پھوپھی کے لڑکے اور یہ ——— شاید تمہاری بیوی اور بچے ہیں ———؟"

"جی ہاں"

حامد نے جواب دیا۔ لڑکی نے نازیہ کا ہاتھ تھام لیا اور سب لوگ اوپر آگئے۔ ایک بے حد سجا سجایا ڈرائنگ روم ——— بے حد فیشن زدہ اور دنیا بھر کی سجاوٹ سے معمور۔ حامد کو بدرالاسلام کا ڈرائنگ روم یاد آگیا، سادگی کا نمونہ، ان کے ہاں کتابوں سے سجاوٹ کا کام ایسا لیا جاتا کہ پھر مصنوعی چیزوں کی ضرورت نہ ہوتی۔ اصغر حسین کی بیوی بھی عمر کی تیز و تند سرحدوں کو پار کر چکی تھیں۔ وہ حامد سے محبت کے ساتھ ملیں۔ غسل وغیرہ سے فارغ ہو کر سب لوگ کھانے کے ٹیبل پر آبیٹھے۔ اصغر حسین کے کل ملا کر نو بچے تھے۔ ایک نثار۔ دو لڑکے ان کے عرب میں ڈاکٹر تھے اور چوتھا شمشیر بزنس کرتا تھا۔ تین بیٹوں کی وہ شادی کر چکے تھے ان میں صرف ایک ہی داماد سابق بہاری تھا، باقی دونوں پنجابی تھے۔ دو بیٹیاں کالجوں

میں پڑھ رہی تھیں۔ اصغر حسین کا سینما ہال خوب چل رہا تھا۔ اس کے علاوہ اُن کا ایکسپورٹ امپورٹ کا بزنس بھی تھا۔ ان کا بہاری داماد ان کے بزنس کا منیجر تھا اور ان سے علٰحدہ رہتا تھا۔ دونوں پنجابی داماد فوج کے افسر تھے۔

کھانے پر جاپانی کاروں، امریکی ٹی وی اور کوریا سے درآمد کیے گئے کپڑوں کا خوب ذکر رہا۔

اصغر حسین کا بیٹا ٹونکل کہنے لگا۔

"ہندوستان والے ابھی تک اپنی ایمبیڈر میں اُلجھے ہوئے ہیں۔ انہیں یہ پتہ ہی نہیں کہ جاپان اور امریکہ نے کیسی کیسی کاریں بنا لی ہیں۔ کس قدر بدشکل ہے آپ لوگوں کی ایمبیڈر۔"

"ارے بھئی، تم انہیں ہندوستانی سمجھ رہے ہو۔ یہ تو ڈھاکہ سے آرہے ہیں۔" اصغر حسین نے بیٹے کو ٹوکا۔

"اچھا خیر، کوئی بات نہیں، وہ بھی تو ہندوستان ہی ہے، فرق صرف یہ ہے کہ وہاں جاپانی کاریں پائی جاتی ہیں اور اصل ہندوستان میں نہیں۔"

"میاں، کیوں دوسروں کو کہتے ہو۔ خود تمہارے ہاں کون سی کار بنتی ہے ______؟"

اصغر حسین بولے۔

"ہمیں اس کی ضرورت ہی نہیں۔ ماشاءاللہ ہمارے ہاں اتنا سامان باہر سے آجاتا ہے کہ ہمیں خود تیار کرنے کی ضرورت نہیں ہوتی۔"

"واہ بھائی، یہ تو آپ خود اپنی ہی کمزوری پر فخر فرما رہے ہیں۔"

حامد، باپ بیٹے کی گفتگو میں بالکل خاموش رہا۔

"بھابی، میں نے کھدر کا ایک سوٹ ہندوستان سے منگوایا تھا۔ اگر

معلوم ہوتا کہ آپ لوگ آرہے ہیں تو دو سوٹ اور منگوا لیتی۔ یہاں ان کا بہت کریز ہے۔"

اصغر حسین کی چھوٹی بیٹی ڈولی بولی اور اٹھ کر اپنا کھدر کا سوٹ نکال لائی۔ رنگین سوٹ تھا، ہر جگہ پر مور بنے تھے۔ نازیہ سوٹ کو ہاتھ سے چھو چھو کر محسوس کرتی رہی۔

"تمہاری دلہن کہاں کی ہیں ——— ؟ یہ تو کچھ بولتی ہی نہیں۔"

حامد کی ممانی نے پوچھا۔

"جی ——— جی، وہ بنگالی ہیں۔"

"ایں ——— !"

سبھی چونک پڑے۔

"تمہاری دلہن اور بنگالی ——— پھر تم انہیں یہاں کیسے لیتے آئے ——— ؟"

اصغر حسین نے عجیب سے لہجے میں کہا۔

"جی ——— وہ وہاں رہنے پر تیار نہیں ہوئیں اور ہر حال میں میرے ہی ساتھ رہنا چاہتی تھیں۔"

"پھر تو ضرور کلکیشین (Calcacian) بنگالی ہوں گی۔"

"جی ہاں ——— اِن کا اصل مکان کلکتہ ہی تھا۔"

"وہی میں کہوں، ورنہ ڈھاکہ کے بنگالیوں کو پاکستان سے کیا مطلب۔ وہ تو مسلمان ہی نہیں ہیں۔"

حامد خاموش رہا۔ ٹیبل پر اب خاصی خاموشی تھی۔ اصغر حسین پھر بولے۔

"پھر بھی تمہیں انہیں لے کر یہاں نہیں آنا چاہیے تھا ———

اچھا یہ تو بتاؤ، اردو بولتی ہیں یہ ــــــ؟"

"جی ہاں ــــ بہت اچھی طرح ــــــ"

"پھر دیکھو ــــ کسی کو پتہ نہ چلے کہ یہ بنگالی ہیں۔ ٹوئنکل، ڈولی اور لیزا، تم لوگ بھی اس کا خیال رکھنا۔"

"بہت اچھا ڈیڈی ــــــ پھر تو ڈیڈی ہماری بھابی گاتی بھی ہوں گی اور ناچتی بھی ہوں گی۔"

"چھی بیٹے ــــــ یہ سب مسلمانوں کے شیوے نہیں۔ یہ اگر ایسا کرتی بھی ہوں گی تو اب یہ سب انہیں بھول جانا ہوگا، یہ مملکتِ خداداد ہے۔"

اتنے میں لیزا کا سفید بالوں والا کتا اس کی گود میں چڑھ آیا اور وہ اسے چمچے سے کھیر کھلانے لگی۔

"لیزا، تمہیں کتنی بار منع کیا ہے کہ کھانے کے چمچے سے شوشو کو نہ کھلایا کرو، لیکن تم مانتی ہی نہیں، آخر ہمارے ساتھ دوسرے مہمان بھی تو کھاتے ہیں، اگر انہیں پرہیز ہوا تو ــــــ؟"

اصغر حسین کی بیوی نے لیزا کو ہلکے سے ڈانٹا۔

"آپ حامد بھائی کے بارے میں کہہ رہی ہیں ممی ــــــ؟ ان بچارے کو تو ناچ گانے سے پرہیز نہیں تو پھر بچارے شوشو سے کیا پرہیز ہوگا ــــ؟"

"پھر ناچ گانے کا نام لیا تم نے ــــ؟"

اصغر حسین نے لیزا کو ڈانٹا۔

"سوری ڈیڈی۔"

لیزا شوشو کو چمکارتی ہوئی، گود میں بھر کر اٹھ گئی۔ ڈولی شاپنگ کو جا رہی تھی۔ اس نے نازیہ کو بھی ساتھ چلنے کو کہا لیکن قبل اس کے کہ نازیہ کچھ بولتی حامد

بول پڑا۔

"ابھی ان کو کہاں لے جاؤ گی ڈولی۔ ابھی تو یہ بہت تھکی ہوئی ہیں۔ ہم لوگ تو پاکستان آ ہی گئے ہیں، اب تو شاپنگ ہوتی رہے گی۔"

ٹوئنکل بھی اپنی جاپانی موٹر سائیکل پر بیڈمنٹن کھیلنے چلا گیا تو اصغر حسین اور ان کی بیوی حامد سے پوچھنے لگے۔

"میاں، یہ تو بتاؤ کہ نثار میاں تو خوش ہیں ــــــ کتنا کما لیتے ہیں ــــ؟"

"اتنا ضرور کما لیتے ہیں کہ انہوں نے کئی ہزار روپے جمع کر لیے ہیں۔"

"ارے واہ ــــــ اب کیا بتائیں، بچارہ گونگا ہے اس لیے اُسے یہاں نہیں بلاتے۔ یہاں کی زندگی میں تو وہ فِٹ ہو نہیں سکتا۔ یہاں تو وہ سب پر بوجھ بن جائے گا۔ یہاں اس کا کام بھی نہیں چلے گا۔ یہاں تو درزی بھی ولایت سے کام سیکھ کے آتے ہیں۔"

"آپ لوگوں کے لیے نثار وہاں بہت تڑپتا ہے۔"

"دیکھنے کی خواہش تو ہم لوگوں کی بھی بہت ہوتی ہے، لیکن میں نے ملٹری کو کپڑے سپلائی کرنے کا ٹھیکہ لے رکھا ہے، اس لیے ہندوستان تو جا ہی نہیں سکتا کیونکہ پھر لاکھوں سے ہاتھ دھونا پڑے گا اور پھر شک الگ مول لو۔ سوچتا ہوں کہ اس کی شادی ہو جاتی تو بہتر تھا۔"

"لیکن ماموں جان، اس بچارے سے شادی کون کرے گا ــــ؟"

"میاں، شادی تو ہو جائے گی لیکن اُس کے لیے تھوڑا نیچا اترنا پڑے گا ــــــ کوئی بھی بنگالی، اُڑیا شادی کر لے گا، بس پیسہ ہونا چاہیے اور نثار میاں کے پاس بقول تمہارے، پیسے کی کمی نہیں۔ ارے اُس کے پاس اب ابھی لاکھوں کی جائداد ہوگی۔ اسی لیے تو میں نے اُسے وہاں چھوڑا تھا۔ تمہارے والد نے میرے

مقدمے میں دلچسپی ہی نہ لی۔ کیا وہ کسی کو پیسے دے کر وہاں اصغر حسین یعنی مجھے دکھا نہیں سکتے تھے، پیسوں سے کیا نہیں ہو جاتا ہے۔ وہ بڑے تھے، گھر کے سرپرست تھے لیکن انہیں وہاں کبھی ہندوؤں کی خوشامد ہی سے فرصت نہ ملی۔ گھر کے کام کاج کو وہ کیا دیکھتے ـــــ؟"

حامد چپ چاپ اُن کی باتیں سنتا رہا۔ اس وقت اُن سے بحث کرنے کا کوئی موقع ہی نہ تھا۔ تھوڑی دیر کے بعد اصغر حسین نے اس سے پوچھا۔

"میاں، تم وہاں کرتے کیا تھے ـــــ؟ آئی مین ڈھاکہ میں ـــــ؟"

"جی، میں آدم جی جوٹ ملز میں سیلس منیجر تھا۔"

"اوہ ـــــ تمہارے پاس اس کا کوئی ثبوت ہے ـــــ؟"

"جی نہیں، ثبوت تو نہیں۔ لیکن آدم جی کی فائلوں میں میرا نام ضرور درج ہوگا۔"

"پھر کیا ضروری ہے کہ وہ تم ہی ہو ـــــ آئی مین سیلس منیجر۔"

"اس کی تصدیق کی جا سکتی ہے۔"

"دیکھو بیٹے، میں تمہیں بتا چکا ہوں کہ ملٹری کا ٹھیکہ دار ہونے کی وجہ کر میرے ہاتھ بہت بندھ گئے ہیں۔ ویسے میں کوشش کروں گا کہ تمہیں کہیں رکھوا دوں۔ تمہاری کوالی فیکیشن کیا ہے؟"

"جی، بی۔اے پاس کیا تھا بہار شریف سے۔"

"میاں صرف بی۔اے کو یہاں کون پوچھتا ہے۔ آئی مین کوئی ٹیکنیکل ڈگری ہوتی تو اور بات تھی۔"

"اب تو آپ ہی کا سہارا ہے ماموں جان ـــــ کوئی نوکری بھی مل جائے میں کر لوں گا۔"

"بیٹے، اب یہاں صورت حال بہت بدل گئی ہے۔ مشرقی پاکستان سے

اتنے لوگ آگئے ہیں کہ سب کو نوکری دلانا اور بسانا بہت مشکل ہے ۔ بے شمار لوگ تو دیہاتوں میں جاکر مزدوری کر رہے ہیں، اور کیا کر سکتے ہیں بچارے ۔ سندھی الگ سر اٹھا رہے ہیں ۔ انہیں یہ فکر سوار ہوگئی ہے کہ کہیں مہاجرین آبادی میں مقامی لوگوں سے بڑھ نہ جائیں ۔ کسی دن بھی یہاں کوئی ہنگامہ کھڑا ہو سکتا ہے ——— پھر بھی تمہارے لیے کوئی دقیقہ اٹھا نہ رکھوں گا ——— میری ایک رائے مانو تو کہوں ———؟"

"آپ کا جو حکم ہوگا، بجا لاؤں گا ۔"

"تم مشرقی پاکستان میں تو اچھی خاصے پوسٹ پر تھے، وہ اب بھول جاؤ ۔ یہاں تمہیں کوئی ایسی نوکری تو نہیں مل سکتی، لیکن جو مل جائے، اسے غنیمت سمجھتے ہوئے قبول کرلینا ۔"

"میں نے آپ سے کہا ناماموں جان کہ بس ایسی نوکری مل جائے کہ اپنا اور بال بچوں کا پیٹ پال سکوں اور سر چھپا سکوں ۔"

اصغر حسین کچھ سوچنے لگے اور بات ختم ہوگئی ۔

۴۳

حامد جانتا تھا کہ اس کے بڑے ماموں سرور حسین کی فیملی بھی اصغر حسین ہی کی بلڈنگ کے ایک فلیٹ میں رہتی ہے، لیکن جب اسے بہت دیر تک ان لوگوں کی سن گن نہ ملی تو اس نے ممانی سے پوچھا ۔

"بڑی ممانی بھی تو شاید ساتھ ہی رہتی ہیں ———؟"

اصغر حسین کی بیوی خاموش رہیں اور اصغر حسین نے جواب دیا ۔

"وہ الگ فلیٹ میں رہتی ہیں ———

آنا جانا نہیں ہے۔"

"کیوں ______ کیا ہوا ______؟"

"ہونا کیا تھا بھئی، بھائی صاحب آئے تو ہم لوگوں نے انہیں یہاں پناہ دی۔ ان کی وکالت نہیں چلی تو روپے پیسے سے بھی مدد کرتے رہے۔ کسی طرح سے نبھا دیا۔ اب ان کی صاحبزادی پڑھ لکھ کر ہم لوگوں کی مرضی کے خلاف ایک اسکول میں ٹیچر ہو گئی ہیں تو ہم کہتے ہیں کہ فلیٹ خالی کر دو ___ کرایہ پر مکان لے لو، لیکن کانوں پر جوں نہیں رینگتی۔ مجھے اس فلیٹ کا ایک ہزار آفر ہے اور پگڑی الگ۔"

حامد، اس سلسلے میں کیا بول سکتا تھا، خاموش ہو گیا، کچھ دیر کے بعد بولا۔

"اگر آپ اجازت دیں تو میں اُن لوگوں سے مل آؤں ____؟"

اس کا لہجہ ایسا تھا کہ اگر اصغر حسین منع کر دیں گے تو پھر وہ ہرگز نہیں جائیگا۔ اصغر حسین نے جواب دیا۔

"مجھے اس میں کیا اعتراض ہو سکتا ہے۔ بلکہ تم ان لوگوں کو سمجھاؤ کہ فلیٹ خالی کر دیں۔ تم خود ہی بتاؤ حامد میاں کہ ان لوگوں کی وجہ کر میرا کتنا نقصان ہو رہا ہے، اور وہ تو میں شرافت سے کام لے رہا ہوں ورنہ میں تو ان لوگوں کا سامان سڑک پر پھنکوا سکتا تھا۔"

فلیٹ کے اندر کا دروازہ بند تھا اور ان لوگوں کے یہاں باہری دروازہ سے ہی جایا جا سکتا تھا۔ حامد نے جس وقت اُن کے دروازے کی گھنٹی بجائی، اس وقت سرور حسین کی بیٹی عالیہ اسکول سے واپس آ چکی تھی اور دونوں ماں بیٹی چائے پی رہی تھیں۔ عالیہ نے دروازہ کھولا تو سامنے ایک اجنبی کو دیکھ کر پیچھے ہٹنے لگی ______

"میں حامد ہوں، آپ کی بڑی پھوپی کا بیٹا، ہندوستان سے آیا ہوں۔"

حامد نے بہ آوازِ بلند کہا۔ اس کو عالیہ میں سرور حسین کی جھلک صاف دکھائی دے گئی تھی۔ سرور حسین کی شکل اسے اچھی طرح یاد تھی۔ وہ اس کی یادداشت میں زندہ تھے۔ ان کا آنا جانا ہندوستان میں لگا رہتا تھا۔ سن کر دونوں ماں بیٹیاں دوڑ کر سامنے آگئیں۔ اُن کے چہرے پر خوشیاں لپک اٹھیں۔ اس کی ممانی نے خوشی سے بھرپور لہجے میں کہا۔

"آؤ بیٹے، اندر آجاؤ ———"

حامد اندر چلا گیا۔ بہت ہی سادہ اور معمولی سجاوٹ تھی فلیٹ کی، لیکن خوبصورتی تھی اور سادگی بھی۔ حامد ان کے ساتھ ڈرائنگ روم میں بیٹھ گیا۔ ممانی نے عالیہ سے اس کا تعارف کرایا۔ عالیہ ایم۔ اے کر چکی تھی اور ٹیچرس ٹریننگ لے کر ایک ہائی اسکول میں پڑھا رہی تھی۔ اس کی ممانی اُسے دیکھ کر بہت خوش تھیں۔ پہلی بار ان کے شوہر کا کوئی رشتہ دار ان سے ملنے آیا تھا۔ انہوں نے فرداً فرداً سب کی خیریت دریافت کی، یہاں تک کہ بڑی ممانی کی بھی۔ انہیں حامد کی ماں کی موت کی خبر نہیں تھی، پتہ چلا تو بہت مغموم ہوئیں۔ حامد چائے ناشتہ سے فارغ ہو چکا تو وہ بولیں۔

"کیا بتاؤں بیٹے ——— منجھلے بھائی نے تو بھائی کی موت کے بعد تعلقات ہی توڑ لیے۔ اُن کے جانے کے بعد ہم لوگ بالکل بے سہارا ہو گئے۔"

کہتے کہتے وہ آبدیدہ ہو گئیں۔ عالیہ نے بھی اپنی آنکھوں پر دوپٹے کا پلّو رکھ لیا۔

"ممانی، آپ لوگ الگ کوئی فلیٹ کیوں نہیں لے لیتیں، جھگڑا خود بخود ختم ہو جائے گا اور آپ لوگوں کو ایک سہارا بھی مل جائے گا ——— یوں سب سے بڑا سہارا تو خدا ہی کا ہوتا ہے۔"

"بیٹے، عالیہ کو کل ملا کر ایک ہزار روپئے ملتے ہیں۔ بس یہی ہم لوگوں کے گزر بسر کا واحد ذریعہ ہے۔ دوسرا مکان تو ہم لوگ بہت زمانے سے تلاش کر رہے ہیں۔ میں تو منجھلے بھائی سے کہتی ہوں کہ وہی مکان ڈھونڈ دیں لیکن ہم لوگوں کی حیثیت کے مطابق۔ ہم لوگ فوراً ان کا فلیٹ خالی کر دیں گے۔"

"ممانی، اس پورے ملک میں چند ہی تو اپنے ہیں اور ان کے درمیان بھی یہ نااتفاقی دیکھ کے بڑا افسوس ہوتا ہے۔ ملک تقسیم ہوتے ہوتے تین حصّوں میں بٹ گیا لیکن ہمارا خاندان تین تیرہ، نو اٹھارہ ہو گیا۔"

"بیٹے، تمہارے بڑے ماموں نے بھائی اور ان کے بچّوں کی محبت میں اپنا کیریر خراب کر لیا۔ زبردست پریکٹس چھوڑ کر کراچی آ گئے کہ بھائی تنہا کیسے رہے گا یہاں آکر کوئی ان کا پُرسان حال نہ تھا۔ منجھلے بھائی نے یہ مہربانی ضرور کی کہ مُفت میں یہ فلیٹ دے دیا۔ تمہارے بڑے ماموں کو یہاں آکر کیا کیا تکلیفیں اُٹھانی پڑیں، ٹیوشن تک کرنے پڑے، لیکن وہ زبان سے اُف نہ کرتے تھے۔ خدا کا شکر ہے کہ ہماری فیملی بہت چھوٹی تھی اس لیے نباہ ہو گئی، ورنہ کیا حشر ہوتا، خدا کو معلوم۔"

حامدؔ وہاں سے واپس آیا تو اصغر حسین کی بیوی نے اس سے پوچھا۔

"کیا کہا ممانی نے ـــــ فلیٹ خالی کر رہی ہیں ـــــ؟"

"وہ لوگ نئے مکان کی تلاش میں ہیں، ملتے ہی چھوڑ دیں گے۔"

"یہ بات تو میں برسوں سے سُن رہی ہوں۔ اصل میں لڑکی کی کمائی سے وہ اس کا جہیز جمع کر رہی ہیں، مکان کیوں تلاش کرنے لگیں۔ کرایہ نہیں دینا پڑے گا انہیں۔"

"ایسا نہ کہیے ممانی جان ـــــ وہ لوگ تکلیف میں ہیں اور ضرور آپ کا

فلیٹ خالی کر دیں گی۔"

"تمہارے منہ میں گھی شکر، خدا کرے کہ ایسا ہی ہو، لیکن مجھے تو نہیں لگتا۔"

حامد کو اصغر حسین کے وسیع فلیٹ میں ایک علیحدہ کمرہ مل گیا تھا۔ دن بھر نازیہ اس میں بند رہتی۔ ڈولی اور لیزا نے اسے 'بور' ڈیکلر کر دیا تھا۔ وہ لوگ اپنی ہمہ وقت قسم کی مصروفیتوں میں صبح سے شام تک جٹی رہتیں۔ ٹونکل بھی پتہ نہیں کہاں غائب رہتا، البتہ کھانے کے وقت یہ لوگ ضرور اکٹھے ہو جاتے۔ اصغر حسین بھی کھانا سب کے ساتھ ہی کھاتے۔ اس وقت نازیہ، حامد اور بچے بھی کھانے پر بلا لیے جاتے۔ اصغر حسین تو حامد سے ادھر ادھر کی باتیں کرتے رہتے لیکن ڈولی، لیزا اور ٹونکل اکثر ایسی اوٹ پٹانگ اور بے سروپا باتوں میں الجھے رہتے کہ نازیہ اور بچے بس ٹکر ٹکر ان کا منہ ہی تاکتے رہ جاتے۔ فیشن پر تو وہ لوگ اتھارٹی تھے۔ دنیا کے کس خطے میں ابھی کون سا فیشن کس طریقے سے اختیار کیا جا رہا ہے، انہیں سب خبر تھی۔ گھر میں بھی فیشن کے بہت سے رسالے آتے جن میں چھپے مضامین بھی موضوع گفتگو بن جاتے۔ حامد کو اپنے بچوں کی فکر کھائے جا رہی تھی۔ ان کا بہت وقت ضائع ہو چکا تھا اور اب بھی ان کی پڑھائی کا دور دور پتہ نہیں تھا۔ وہ دو ایک بار اصغر حسین کو اپنی نوکری کے بارے میں یاد دہانی کرا چکا تھا اور ہر بار اُسے ایک ہی جواب ملا تھا۔

"کوشش میں لگا ہوا ہوں ــــــ نوکری ملنا اتنا آسان نہیں ہے نا۔ پھر تمہیں کیا فکر ہے، اپنے ہی گھر میں ہو، جب خدا چاہے گا تو نوکری بھی ہو جائے گی۔"

چند روز کے بعد اصغر حسین نے حامد کو بتایا کہ حبیب بینک میں اتفاق سے ایک بہاری افسر آگیا ہے، اس کے پاس کل چلنا ہے۔

دوسرے روز وہ دونوں بینک کے بڑے افسر کے پاس گئے۔ اصغر حسین نے اپنا وزیٹنگ کارڈ اندر بھیجا تو انہیں اندر بلا لیا گیا۔ بینک کا افسر الہ آباد کا رہنے والا تھا۔

اصغر حسین نے اسے بتایا کہ یہ میرا رشتہ دار ہے، اس کے سب لوگ بنگالیوں کے ہاتھوں مارے گئے، گھر بار لوٹ لیا گیا۔ یہ بہت مشکلوں سے جان بچا کر ہندوستان بھاگا، وہاں بھی اس کا پیچھا کیا گیا تو کسی نہ کسی طرح نیپال کے راستے سے یہاں پہنچا ہے بے چارہ یہاں دانے دانے کو محتاج ہو رہا ہے وغیرہ وغیرہ ــــــ کہانی خاصی دردناک تھی۔ حامد کو اس وقت اپنے اُس دوست کی یاد آگئی جو اسے ڈھاکہ کے ریلیف کیمپ میں ملا تھا اور جس نے اس سے درخواست کی تھی کہ اس کے جھوٹ کو جھوٹ نہ کہے۔ حامد چپ چاپ اپنی کہانی سنتا رہا۔

بینک کا افسر کہانی سے خاصا متاثر ہوا۔ اصغر حسین خاموش ہوئے تو اس نے جیب سے رومال نکال کر اپنی آنکھوں کے گوشوں کو خشک کیا۔ ان لوگوں کے لیے کافی منگوائی، اپنے دو ایک ماتحتوں سے انٹرکام پر باتیں کیں اور بولا۔

"ایسا ہے شیخ صاحب کہ ہمارے بینک میں ایک کلرک کی جگہ خالی ہے۔ تنخواہ ایک ہزار ملے گی، بڑھ بھی سکتی ہے۔ اگر یہ چاہیں تو جوائن کرلیں۔ بائی دی وے، یہ وہاں کرتے کیا تھے ـــــ؟"

"ارے صاحب، ان کا وہاں بہت بڑا بزنس تھا۔ آئی مین، لاکھوں میں کھیلتے تھے۔ بنگالیوں نے سب لوٹ لیا، تباہ کر دیا ـــــ"

"بہت افسوس کی بات ہے، خیر خدا کی جو مرضی ـــــ ہاں میاں صاحب، آپ پرسوں جوائن کرلیں۔"

"جی، بہت اچھا۔"

دونوں رخصت ہو کے باہر نکلے تو حامد کا چہرہ خوشی سے رنگین ہو رہا تھا۔ اصغر حسین نے کہا۔

"یہ تمہاری خوش قسمتی ہے کہ تمہیں اتنی جلدی نوکری مل گئی اور وہ بھی اتنی

اچھی۔ ورنہ یہاں حالت بہت خراب ہو چکی ہے۔ سندھی، سندھی کو پوچھتا ہے اور پنجابی صرف پنجابی کو۔ وہ تو اتفاق کہیے کہ بینک کا افسر بہاری آگیا اور اس سے میری جان پہچان نکل آئی ورنہ یہ کام اتنا آسان نہ تھا۔"

حامد نے بینک جوائن کرلیا اور پہلی ہی تنخواہ پر وہ نازیہ کو ایک اچھے ڈاکٹر کے پاس لے گیا۔ ڈاکٹر نے نازیہ کی جانچ کرنے کے بعد بتایا کہ اسے کوئی بیماری نہیں، وہ خاصی بھلی چنگی ہے۔ حامد نے ڈاکٹر کو بتایا کہ وہ بہت خوش تھیں لیکن بنگلہ دیش کے واقعات نے ان کی خوشی چھین لی۔ ایسا لگتا ہے کہ انہیں کسی بات کا احساس ہی نہیں، ایک طرح کی بے حسی ان پر طاری ہے ــــــ ڈاکٹر سن رسیدہ اور عقل مند تھا، اس نے حامد سے کہا کہ ایسے کئی کیس اس کے پاس آچکے ہیں، اس بیماری کا اس کے پاس کوئی علاج نہیں ۔ اگر اچھا اور خوشیوں بھرا ماحول ملا تو شاید پھر سے اپنی پرانی حالت پر لوٹ آئیں، ویسے کچھ کہنا مشکل ہے۔

حالات کچھ درست ہو جانے پر حامد نے کراچی کے مضافات میں بسنے والی بہاریوں کی ایک تازہ کالونی میں کرایہ پر فلیٹ لے لیا۔ اصغر حسین نے سُنا تو بہت بگڑے کہ اپنا مکان رہتے ہوئے کرایہ پر جا رہے ہو۔ لیکن حامد نے انھیں کسی نہ کسی طرح راضی کرلیا۔ در اصل اس گھر میں ان کی حالت دوسرے درجے کے شہریوں جیسی ہو گئی تھی جب کہ نازیہ کے لیے اچھا اور پرسکون ماحول بہت ضروری تھا۔

اس نے جو فلیٹ لیا، اس میں تین کمرے تھے، دو چھوٹے اور ایک بڑا۔ اس نے بڑی ممانی سے کہا کہ اس کے لیے تو دو ہی کمرے کافی ہیں۔ اگر وہ اور عالیہ ان کے ہاں آجائیں تو اُسے بڑی خوشی ہوگی۔ دونوں طرف کمپنی مل جائے گی اور گھر کی خوشیاں پھر لوٹ آئیں گی۔ ممانی تو بخوشی تیار ہو گئیں لیکن عالیہ نے شرط لگا دی کہ وہ اسی وقت وہاں جائے گی جب حامد فلیٹ کا نصف کرایہ قبول کرے۔ پہلے تو حامد نے

صاف انکار کر دیا لیکن عالیہ اپنی بات پر اڑی رہی۔ فلیٹ کا کرایہ چار سو روپے تھا اور وہ نصف کرایہ بخوشی دے سکتی تھی۔ مجبوراً حامد کو ہامی بھرنی پڑی۔ دونوں اس کے فلیٹ میں آ گئے۔ اصغر حسین نے جب سُنا کہ عالیہ اور اس کی ماں حامد کے ساتھ رہنے جا رہی ہیں تو وہ ایک دن حامد سے ملنے بینک میں آ گئے۔

"میاں سُنا ہے کہ عالیہ اور بھابی تمہارے ساتھ رہ رہی ہیں۔"

"جی ہاں ماموں جان ——— اور خوشی کی بات یہ ہے کہ آپ کا فلیٹ خالی ہو گیا۔"

"وہ تو خیر ٹھیک ہے، لیکن یہ بات سُن لو کہ پھر ہم لوگ تمہارے ہاں نہیں آئیں گے البتہ تم ہمارے ہاں آ سکتے ہو۔"

"کیوں ماموں جان ——— آپ ناراض ہیں کیا ——— ؟"

"اور نہیں تو کیا ——— وہ لوگ اس قابل ہیں کہ انہیں منہ لگایا جائے۔ بھابی سے شادی کرنے کے بعد ہی بھیا مصیبتوں میں مبتلا ہوئے۔ مرد کو ہمیشہ عورت کی قسمت سے آرام ملتا ہے۔ ان کے مرنے کے بعد اس عورت نے ہم لوگوں کو کس طرح پریشان کیا۔ میں بھیا کی ہمیشہ مدد کر دیا کرتا تھا، اس عورت نے میری مدد قبول کرنے سے صاف انکار کر دیا۔ بیٹی نوکری کرنے لگی اور اتنے ہی پیسوں میں ان لوگوں کا دماغ آسمان کو چھونے لگا۔ میں تو اب ان لوگوں کی شکل دیکھنے کا روادار نہیں ہوں۔"

"ماموں جان، عورتیں ناسمجھ ہوتی ہیں۔ ان کی باتوں سے کیا لینا دینا۔ آپ انہیں معاف کر دیجیے۔ میں ان کی طرف سے معافی مانگ رہا ہوں۔"

"آپ کون ہوتے ہیں ان کی طرف سے معافی مانگنے والے۔ میاں صاحبزادے، آپ ان لوگوں کی زیادہ وکالت مت کیجیے۔ میں نے اپنے بال دھوپ میں سفید نہیں کیے، لوگوں کو پہچانتے ہوئے عمر گزری ہے۔"

حامد کچھ نہ بول سکا۔ اصغر حسین چلے گئے اور سچ مچ اس کے ہاں نہیں آئے۔

حامد کی سمجھ میں یہ بات نہیں آرہی تھی کہ آخر اصغر حسین ان لوگوں سے اتنے نالاں کیوں ہیں۔ اس نے بڑی ممانی سے دریافت کیا۔

"ممانی جان، بات کیا ہے، آخر ماموں جان آپ لوگ سے کیوں بگڑے ہوئے ہیں ــــــ؟"

"تم نے انہیں سے پوچھ لیا ہوتا۔ بھیا، ہم لوگ تو خود ہی نہیں جانتے کہ وہ کیوں بگڑے ہوئے ہیں۔ ہم لوگ تو بس یہی جانتے ہیں کہ انہوں نے ہمیشہ ہم لوگوں کی عزّت کے ساتھ سر اٹھانے کی ہمّت کو بری نظروں سے دیکھا۔ بے شک انہوں نے اپنے بڑے بھائی کی مدد کی، انہیں رہنے کے لیے جگہ دی لیکن بھائی بھی تو محض ان کی محبّت میں وہاں سے دوڑے آئے تھے ــــــ ٹھیک ہے انہوں نے مدد کی، ان کا یہ احسان سر آنکھوں پر۔ اس وقت ہم لوگوں کو مدد کی ضرورت تھی لیکن جب خدا نے دال روٹی کا انتظام کر دیا تو پھر کیوں اُن پر بار بنے رہتے ــــــ ہم لوگ تو ان کے سارے گھر کو سنبھالے ہوئے تھے۔ منجھلی بھاوج نے ہم لوگوں کی موجودگی میں کبھی باورچی خانہ کا منہ نہ دیکھا ــــــ"

"ممانی جان، ماموں جان چاہتے ہیں کہ آپ لوگ اُن سے معافی مانگ لیں۔"

"بھیا، کوئی قصور تو ہو۔ ہم لوگ تو اپنا قصور ہی نہیں جانتے۔ اُن کے فلیٹ میں رہتے تھے سو وہ بھی چھوڑ دیا اور پھر تمہارے ماموں، کیا اپنے چھوٹوں سے معافی مانگ سکتے ہیں ــــــ؟"

عالیہ اس عرصے میں بالکل خاموش رہی۔ حامد سمجھ گیا کہ یہ مسئلہ سلجھنے والا نہیں۔ دراصل سرے سے کوئی مسئلہ ہو تب تو ــــــ

حامد کو یہ دیکھ کر خوشی تھی کہ نازیہ اب آہستہ آہستہ اپنی حالت میں لوٹ رہی ہے۔

تیسرا حصہ

۱۶؍دسمبر ۱۹۵۱ء

عزیزم حامد سلمہٗ! دعائے خیر و برکت

تمہارے کئی خطوط متواتر ملے جن سے حالات سے آگاہی ہوتی رہی۔ یہ جان کر بہت خوشی ہوئی کہ تم ماشاء اللہ بہت خوش ہو۔ اللہ تمہیں ہمیشہ خوش رکھے۔ آفتاب اور مہتاب کے کالج کے امتحانات امتیازی نمبروں سے پاس کرنے کی خبر سے بھی دلی مسرت ہوئی۔ خدا اُنہیں دین و دنیا میں بے مثال کامیابیاں نصیب فرمائے۔ بچوں کی تعلیم و تربیت پر خاص دھیان دینا۔ اپنی زندگی تو آدمی کی گزر ہی جاتی ہے، لیکن اگر بچوں کی زندگی نہ سنور سکی تو پھر دائمی افسوس ہوتا ہے، اُس کا خاتمہ موت سے بھی نہیں ہوتا۔ ماشاء اللہ تم دونوں سمجھ دار اور تعلیم یافتہ ہو اور باشعور بھی، تم لوگوں کو سمجھانے کی چنداں ضرورت نہیں، لیکن ہم بوڑھے لوگ، اس حقیقت کے باوجود سوائے سمجھانے کے اور کر بھی کیا سکتے ہیں، سو ہم اپنا فریضہ پورا کیے دیتے ہیں۔

یہاں کے حالات لائق شکر ہیں۔ تم یہاں کے بارے میں جو کچھ بھی سنتے اور پڑھتے ہو، اُن پر تمہارا فکر مند ہونا فطری ہے۔ لیکن تمہیں زیادہ گھبرانا نہیں چاہیے۔ تم تو بد سے بد تر حالات کا سامنا کر چکے ہو۔ برصغیر کا ہر مسلمان برسوں سے جسمانی، ذہنی اور قلبی اذیت میں مبتلا ہے۔ کبھی کبھی مجھے ایسا لگتا ہے کہ مشیتِ ایزدی کی طرف سے اُن کے لیے یہ عرصہ ٹریننگ کے لیے مخصوص کیا گیا تھا، ٹریننگ تو اب مکمل ہو چکی، اب سُکھ کا زمانہ نہیں آنے والا، اب دُکھ ہی میں زندگی بسر کرنی ہے ـــــ جو ٹریننگ مل چکی، اُسے عمل میں لانا اور سمجھنا ہے۔ اگر اس نکتہ کو مسلمان سمجھ لے، چاہے وہ ہندوستان میں رہتا ہو یا پاکستان میں، یا مشرقی پاکستان میں (اصل نام بنگلہ دیش، مشرقی پاکستان میں محض پاکستانیوں کی دل جوئی کے لیے کہتا ہوں) تو پھر

اُسے جیسے حالات کا سامنا بھی کرنا پڑے، وہ جی لے گا۔

میاں، جینے کا ایک گُر ہوتا ہے جو ہر کسی کو نہیں آتا۔ جینے سے زیادہ بڑا فن ابھی تک ایجاد نہیں ہوا۔ بہاری، پہلے تقسیمِ ہند کے بعد مشرقی پاکستان گئے، یہ محض اتفاق تھا، وہ مغربی پاکستان بھی جا سکتے تھے اور بہت سے لوگ وہاں گئے بھی۔ وہ گھر سے بے گھر ہوئے، پھر لُٹے مارے گئے اور اب مغرب کی طرف گئے تو وہاں مصطفیٰ جتوئی صاحب کہتے ہیں کہ مہاجروں کو سمندر میں دھکیل دینا چاہیے۔ بیٹے، یاد رکھنا جب کوئی اپنی زمین، اپنا وطن چھوڑ کر ہمیشہ ہمیشہ کے لیے جاتا ہے تو اسے اپنی زمین، اپنے وطن کو بھول بھی جانا پڑتا ہے اور نئی زمین کو اپنانے کی سعی کرنی پڑتی ہے۔ بدقسمتی سے یہ دونوں اہم کام وہاں سرانجام نہیں دیے جا سکے، ورنہ تواریخ کے باب اتنے برہنہ صورت میں، شاید ہمارے پاس کھل کر نہیں آتے (توبہ کرتا ہوں میں تواریخ کے بارے میں کچھ بولنے سے ـــ تواریخ مجھ سے، تم سے، بنگلہ دیش، ہندوستان اور پاکستان سے بہت بلند تر شے ہے اور وہ مجھ جیسے چھوٹے آدمیوں کی خواہشوں اور مشوروں کو خاطر میں نہیں لاتی۔)

ہاں تو میں یہ کہہ رہا تھا کہ پریشان ہونا ایک فطری ضرورت ہے، لیکن اتنا پریشان نہ ہو کر اپنا چین و سکون ہی کھو دو۔ یوں بھی مصطفیٰ جتوئی صاحب سے نئے مہاجرین کو ڈرتے رہنا چاہیے۔ بھئی مجھے تو جتوئی صاحب بہت صاف گو آدمی نظر آتے ہیں کہ یہ تو سچی بات ہے کہ اب مہاجرین کے لیے سوائے سمندر کے اور کوئی جائے پناہ رہ بھی نہیں گئی ہے۔ یہ بیچارے اب اور کہاں جا سکتے ہیں۔ میں تو ڈرتا ہوں اُس دن سے کہ کہیں مجھے اپنی زندگی ہی میں (جو اب یقینی بہت تھوڑی رہ گئی ہے) یہ تماشا بھی نہ دیکھنا پڑے ـــ خدا نہ کرے۔

میرا حال کیا پوچھتے ہو ـــــــ میں تو عرصے سے گوشہ نشیں ہو کر بیٹھا ہوں۔ زندگی بہت گزاری، اب یہ تمنا بھی چھوڑ بیٹھا ہوں، لیکن ہوتا یہ ہے کہ کمبل تو میں نے چھوڑ دیا ہے، کمبل مجھے نہیں چھوڑتا۔ کبھی سیاست میں بہت دل چسپی لی تھی، اس کی سزا آج تک بھگت رہا ہوں۔ ۷۲-۱۹۷۱ء کے انتخابات تو کانگریس نے بہت آسانی سے جیت لیے۔ اس وقت اگر وہ کسی

کھمبے کو بھی کھڑا کر دیتی تو وہ بھی جیت جاتا۔ اس موقع پر مجھے محمد علی جناح بہت یاد آئے۔ اُن کا یہ جملہ بہت مشہور ہوا تھا کہ اگر وہ کسی کھمبے کو بھی مسلم لیگ کا جھنڈا لے کر کھڑا کر دیں تو مسلمانوں کو اُسے ووٹ دینا چاہیے۔ اتفاق یہ کہ مسلمانوں نے بہت سے کھمبوں کو ووٹ بھی دیا۔ ادھر بہت سے کھمبے کانگریس کا جھنڈا لے کر کھڑے ہوئے اور جیتے بھی۔ دروغ برگردن راوی' یہ کہا گیا کہ کانگریس کو مسلمانوں کے ووٹ کی کوئی ضرورت نہیں۔ وجہ یہ ہے کہ یہ عام تاثر تھا کہ مسلمان، کانگریس سے بہت بگڑے ہوئے ہیں بنگلہ دیش کے سبب۔ بات بہت حد تک صحیح بھی تھی۔ زخم تازہ تھا۔ ہزاروں بہاری قتل کر دیے گئے تھے اور اُن کی موت کا یہاں بہت چرچا تھا۔ وہ سمجھتے تھے کہ اس قتل عام میں بنگالی حریت پسندوں کی پشت پناہی کانگریس حکومت نے کی ہے ——— اُن کا یہ سمجھنا صحیح تھا یا غلط' یہ ایک الگ بحث ہے' میں صرف یہ پوچھنا چاہتا ہوں کہ مسلمانوں کی جگہ پر کوئی دوسری قوم ہوتی اور وہ اس صورت حال سے دوچار ہوتی تو اس موقع پر وہ کیا کرتی۔ یہ ایک حقیقت ہے کہ اگر واپس آئے ہوئے بہاریوں کے رشتہ دار چاہتے تو وہ لوگ ہندوستان کی وسیع و عریض بھیڑ میں کھو سکتے تھے۔ اُن کے پاس پاکستانی شہریت کا کوئی ثبوت نہیں تھا۔ ہندوستانی شہریت اُن سے چپکی ہوئی تھی اور کھرچ کھرچ کے ہٹانے سے بھی نہیں ہٹی تھی۔ لیکن مال و اسباب اور جائداد میں حصہ دار بننے کے خوف سے خود ان لوگوں نے بہاریوں کو نیپال کا راستہ دکھایا اور اپنے جانتے ایک بہت بڑا کارِ خیر انجام دیا ——— لیکن ایک بات ہے میاں' بنگلہ دیش کے قیام سے یہاں کے مسلمانوں میں اچانک بڑی سمجھ آگئی ہے اور وہ جینا سیکھنے کی طرف راغب ہو رہے ہیں۔ اب وہ فرقہ وارانہ فسادات سے خوف نہیں کھاتے بلکہ اس کا مقابلہ کرنے کی تیاری کرتے ہیں۔ شاید لاشعوری طور پر وہ یہیں رہنے سہنے اور مرنے مارنے کے لیے تیار ہو گئے ہیں۔ وہی بات جو میں ہمیشہ کہتا رہا ہوں اور جو نقار خانے میں طوطی کی آواز ثابت ہوتی رہی ہے۔ اس کی وجہ یہ تھی کہ اُن کے سامنے سب سے آسان راستہ فرار کا تھا۔ مشرقی پاکستان بھاگنے میں بہت زیادہ روپے کا خرچ نہیں تھا، نہ پاسپورٹ کی ضرورت نہ ویزا کی' بس گردنیا کا

سہارا لیا اور چل دیے۔ ہلدی لگے نہ پھٹکری اور رنگ چوکھا۔ وہاں پہنچے تو کچھ سچی جھوٹی کہانی سُنا کر نوکری بھی مل گئی، چلو چھٹی ہوئی۔ لیکن یہ کسے پتہ تھا کہ ایک دن وہاں سے بھی بھاگنا پڑے گا، اور کچھ عجب نہیں کہ کہاں کہاں سے بھاگنا پڑے۔ جانتے ہو، جو کچھ بھی تم نے دیکھا، ہم نے سُنا، اس سے کم از کم مجھے کوئی بہت زیادہ حیرت نہیں ہوئی۔ میں تو بہت دنوں سے اس سارے نقشے کو دیکھ رہا تھا، رنگ بھرنے کی ہمّت البتہ نہیں ہوتی تھی۔ اور رنگ میرے پاس تھا بھی کہاں، وہ تو وقت نے اپنی ہتھیلی میں چھپا رکھا تھا اور کیا پتہ تھا کہ وقت کے ذہن میں رنگوں کا کون سا امتزاج ہے۔ بہرکیف، رنگ بھی سامنے آگئے اور رنگوں کے امتزاج بھی اور زمانے نے دیکھ بھی لیا ——

ہاں تو میں یہ کہہ رہا تھا کہ اب جب کہ سب طرف کے راستے بند ہو گئے تو یہاں کے مسلمانوں کو بھی اچانک ہوش آگیا ہے۔ انہوں نے تو یہ سمجھ رکھا تھا کہ اُنہیں تو یہاں رہنا ہی نہیں، اُنہیں تو ایک دن پاکستان جانا ہے، چنانچہ وہ اپنی جائز مانگوں کی طرف سے بھی آنکھیں بند کیے بیٹھے تھے۔ ہم لوگ آواز بلند کرتے تو جواب ملتا کہ آپ کی قوم تو چپ ہے، پھر آپ کیوں ہنگامہ کرتے ہیں۔ قوم کو بیدار کرنے کی کوشش کرتے تو اس پر ایسی نیند سوار تھی، جو پوری ہونے کا نام ہی نہ لیتی تھی۔ یہاں، مانگیں، تو بغیر مانگے ملتی نہیں۔ سیدھی سی بات یہ ہے کہ ہمارے یہاں جمہوریت قائم ہے جس میں اپنی مانگوں کے سلسلے میں آواز بلند کرنا پڑتی ہے۔ بیٹھے بٹھائے کچھ نہیں ملتا۔ فوجی آمریت میں یہ بات تو ممکن ہے کہ حکمراں آپ سے انفرادی طور پر خوش ہو کر خلعت سے نواز دے، لیکن جمہوریت میں تو آواز بھی بلند کیجیے اور رائے عامہ کو بھی ہموار کیجیے۔ مسلمانوں کو بہت دنوں کے بعد ہی سہی، اپنی جائز مانگوں کا خیال آیا اور انہوں نے اس کے لیے جمہوری طریقۂ کار بھی سیکھا، اس کی اہمیت بھی جانی۔ نتیجہ یہ ہوا کہ حکومت بھی مجبور ہوئی اور اُس نے حقیقت پسندانہ روش اختیار کی۔ تمہیں یہ سن کر تعجب ہوگا کہ مسلمانوں کی اکثر مانگیں، بنگلہ دیش کے واقعہ کے بعد سامنے آئیں اور پوری ہوئیں۔ اس طرح بنگلہ دیش نے اُن کے اندر زندگی کا وقار پیدا کیا، اُنہیں جینے کا اسلوب سکھایا،

اور اُنہیں ایک ہی جھٹکے میں باوقار قوموں کی صف میں لا کھڑا کیا۔ جو کام گاندھی، نہرو اور آزاد نہیں کر سکے، وہ کام بنگلہ دیش کے واقعہ نے یوں چٹکیوں میں سرانجام دے دیا۔ تم بنگلہ دیش کو ایک سانحہ کہتے ہو، میں اسے مبارک کہتا ہوں۔ اگر بنگلہ دیش میں بہاری اور بنگالی کا خون نہ بہتا تو جینے کا اسلوب لکھنے کے لیے روشنائی کبھی حاصل نہ ہوتی۔ فساد اب بھی ہوتے ہیں، فرقہ وارانہ کشیدگی اب بھی رہتی ہے لیکن اب کوئی کہیں بھاگنے کا نام نہیں لیتا، اب قریے گاؤں اور شہر ویران نہیں ہوتے، مسجدوں میں جانور نہیں باندھے جاتے اور اوپلے نہیں تھوپے جاتے، اب فسادیوں کے مقابلے کی تدابیر سوچی جاتی ہیں اور کشیدگی کو دور کرنے کے دور رس قدم اُٹھائے جاتے ہیں۔ اب اگر کوئی مسلمانوں کو ملک چھوڑ دینے کا مشورہ دیتا ہے تو وہ اس پر چڑھ دوڑتے ہیں اور اس کی اس طرح خبر لی جاتی ہے کہ وہ سارے ملک میں نکّو بن کر رہ جاتا ہے ——— ایسا مشورہ دینے والوں کو اب کوئی اچھا نہیں کہتا۔

کانگریس کو مسلمانوں کے ووٹ کی ضرورت تھی یا نہیں، لیکن یہ حقیقت ہے کہ مسلمانوں کی ایک بڑی تعداد نے کانگریس کو ووٹ نہیں دیا، اُنہوں نے دوسری جماعتوں کو اپنا ووٹ دیا۔ میں اسے بھی ایک صحت مند رجحان سمجھتا ہوں۔ آخر کانگریس اُنہیں اپنا بندھوا ووٹر کیوں سمجھتی آرہی ہے۔ تقسیم ہند کے بعد کانگریس نے اُن کے اندر سے سہمے سہمے مسلمان کو باہر ضرور نکالا تھا اور اُنہیں اعتماد کی ہوا ضرور کھلائی تھی، لیکن اس کی قیمت تو اُسے بہت قبل مل چکی تھی۔ اُسے بیٹھے بٹھائے کروڑوں ووٹر مفت مل گئے تھے۔ کانگریس نے اُن سے ووٹ لینے کے سوا اُن کے لیے اور کیا بھی کیا۔ انہیں تو بہت پہلے سے یہ حق حاصل ہے کہ وہ اپنی پسند کے اُمیدوار اور جماعت کے حق میں اپنے ووٹ کا استعمال کریں اور جسے ناپسند کریں، اُسے اپنا ووٹ نہ دیں۔ یہ اور بات ہے کہ اپنے حق کی جانکاری اُنہیں بہت تاخیر سے ہوئی۔ کانگریس نے اُنہیں اپنا مہرہ بنا لیا تھا، وہ کھیل اب ختم ہوا۔ میں تو بہ بانگِ دہل یہ کہتا ہوں کہ فسادات میں جو سیاسی کھیل ہوتا ہے اُس میں بھی حکمراں

جماعت ہونے کے باعث کانگریس کا ہاتھ اُوپر ہوتا ہے، بقیہ کھلاڑی تو اُس کے موڈ اور اشارے کے مطابق کھیلتے ہیں۔ اتنا اطمینان ضرور ہوا کہ محض ووٹوں کے لیے مسلمان دوست نہیں بنائے جائیں گے۔ یاد رکھنا بیٹے، ووٹوں کی قدر و قیمت اسی وقت تک ہے جب تک کہ ملک میں جمہوری نظام قائم ہے۔ اُس کے لیے ہمیں گاندھی، نہرو اور آزاد کا احسان مند ہونا چاہیے ورنہ سچویشن دوسری بھی ہو سکتی تھی۔ اب دیکھو نا، پاکستان، ہندوستان سے عمر میں چوبیس گھنٹہ بڑا ہے، سینیئر ہے، وہاں وہ پرابلم بھی نہیں جو یہاں ہے، پھر بھی وہاں آدمیوں کی کوئی قدر و قیمت نہیں، اُن کی وہاں کوئی پوچھ نہیں ——— یہ ووٹ جو ہے نا میاں، تو یہی ترازو کے پلڑے میں جمع ہو کر انسان کا وزن بڑھاتا ہے، ورنہ آج کی دُنیا میں کون کسے پوچھتا ہے۔

اب اِدھر کا حال سنو، اندرا گاندھی الیکشن کا مقدمہ الہ آباد ہائی کورٹ سے ہار گئیں لیکن سپریم کورٹ میں جا کر جیت گئیں۔ وقفہ سے سیاسی جماعتوں نے فائدہ اُٹھالیا۔ اندرا گاندھی کے خلاف پورے ملک میں مہم چلائی گئی، جے پرکاش نرائن جو بہت دنوں سے الگ اور چُپ رہ کر سب تماشا دیکھ رہے تھے، عوام کے مسیحا بن کر کود پڑے۔ تم جانو، ابھی بھی ملک میں اُس کانگریس کا رعب باقی ہے جس کے لیڈر وہ گاندھی تھے جو اس کے چوَنیا ممبر بھی نہیں تھے۔ اندرا گاندھی، اس صورت حال سے اتنی پریشان ہوئیں، اتنی پریشان ہوئیں کہ انہوں نے آئین میں دی ہوئی سہولت کے مطابق ملک میں ایمرجینسی لگادی۔ جے پرکاش سمیت بڑے بڑے لیڈر راتوں رات گرفتار کر لیے گئے۔ ملک میں ڈسپلن کا ایک دور شروع ہوا۔

یاد رکھنا بیٹے، ڈسپلن (بغیر ڈر اور خوف کے) اس وقت بے معنی ہو جاتا ہے جب لوگ اپنے فرائض اور حقوق سے واقفیت نہیں رکھتے ہوں۔ اندرا گاندھی کی پولیس کو زیادہ گولی نہیں چلانی پڑی، وہ تیز دھوپ میں نیزے چمکاتی رہی اور اس کی چمک سے ایک ڈر کھنچتا رہا ——— بہت اچھا دور تھا وہ بھی، افسوس یہ ہے کہ پھر وہی ہوا جو ایسے

موقع پر ہر جگہ ہوتا آیا ہے ۔ پتہ نہیں تم لوگ اقتدار کے صحیح یا غلط استعمال سے واقف ہو یا نہیں ۔ مجھے شک اس لیے ہے کہ تم لوگ ہمیشہ باہر کی چمک دمک دیکھ کر اپنے گھر کے اندھیرے کو بھلا دینے کی کوشش اور تلقین کرتے رہے ہو اور خوشیوں کے خوب خوب شکار ہوتے رہے ہو ــــــــــــ

میں سوچتا ہوں کہ تمہیں حیرت ہوگی ، کہ میرے جیسا کٹّر ہندوستانی ، پاکستان سے اس لہجے میں بات کر سکتا ہے تو یہاں ، درمیان ہی میں میرا جواب بھی سن لو کہ پاکستان بننے میں جتنا خون ہندوستان کا بہا ہے ، اتنا پاکستان کا نہیں بہا ۔ میں قیام پاکستان کا مخالف ضرور رہا ہوں لیکن کسی قیمت پر اپنے خون کو رائگاں جانے نہیں دے سکتا ــــ اسی خون ــــ ہندوستانی خون کے صدقے میں ، میں پوچھتا ہوں کہ پاکستان اب تک کیا کرتا رہا ہے ــــــــ ہمیشہ باہر کا مال عوام کو دکھا کر اس کی چمک دمک میں انہیں الجھانے کی کوشش کی جاتی رہی ہے ۔ عبرت کی بات ہے کہ بہت پڑھے لکھے لوگ بھی جاپانی کاروں ، امریکی کپڑوں اور سوئٹزرلینڈ کی گھڑیوں کا فخر کے ساتھ ذکر کرتے ہیں ۔ میاں ہم تو اتنی چیزیں بنا لیتے ہیں کہ باہر کے ضرورت مندوں کو بھی بھیج سکیں ۔ تم سے لڑائی ہے اس لیے تمہارے یہاں نہیں بھیجتے ۔ اگر تم لوگ بھی ہماری چیزیں دیکھ لیتے اور استعمال کر لیتے تو پھر ہم پر کبھی ہنسنے کی جرأت نہ کرتے ۔

ترقی یافتہ اور پچھڑا پن کی تعریف میں سیاست کا دخل بہت کم ہے اور یوں بھی تم لوگ سیاست کیا جانو ــــــــ دیکھو ، بات کہاں سے کہاں جا پہنچی ۔ ہاتھ میں قلم تھامے ہوں اور لگ رہا ہے کہ تقریر کر رہا ہوں ۔ یہ میرا پرابلم ہے اور اب تو اس عمر میں کسی پرابلم کے حل ہونے کی کوئی امید باقی نہیں ۔ تو میں یہ کہہ رہا تھا کہ ایمرجنسی کچھ دنوں تک تو بہت اچھی چلی ، پھر وہ اقتدار کے غلط استعمال کا شکار ہو گئی ۔ اندرا گاندھی تو اتنے لوگوں میں گھری ہوئی تھیں کہ انہیں یہ پتہ بھی نہیں تھا کہ باہر کیا ہو رہا ہے ۔ وہ سنتیں کچھ اور ، اور سنایا جاتا انہیں کچھ اور ۔ جب بات ان کے پلّے نہ پڑتی تو وہ شدید جھنجھلاہٹ کا شکار ہو جاتیں اور

اسی جھنجھلاہٹ سے لگتا کہ وہ اقتدار کے نشہ میں چور ہو رہی ہیں۔ اُن کی کمزوری یہ تھی کہ اُنہوں نے حالات کو سمجھنے میں پہل نہیں کی۔ حالات بد سے بدتر ہوتے چلے گئے، اُنہیں کوئی خبر نہ ملی۔ بہت دیر کے بعد اُنہیں خیال آیا تو الیکشن کا، انہوں نے الیکشن کا اعلان کر دیا، بس پھر یوں سمجھو کر اندر سے پکا پکایا لاوا پھوٹ پڑا۔ جے پرکاش جیسے لیڈروں میں اب بھی ہندوستانیوں کو رُلا دینے کی پوری صلاحیت موجود تھی۔ صاف نظر آنے لگا کہ اندرا گاندھی کی نیّا ڈوب رہی ہے، اور اس ناؤ میں جو سوار ہوگا، اُس کی خیر نہیں۔ پھر تو لوگ تیزی سے اُن کا ساتھ چھوڑنے لگے۔ صبح کو جو آدمی اُن کے سامنے ہاتھ جوڑ کر آتا، شام کو وہ اُنہیں گالیاں دیتا ہوا نظر آتا۔ لیکن واہ رے، اس عورت کی ہمت، اس کے ماتھے پر پریشانی کی شکنیں دکھائی نہیں دیں اور وہ مردانہ وار حالات کا تنہا مقابلہ کرتی رہی۔

کانگریس تو بہت پہلے ہی ایک ایسی انڈسٹری بن چکی تھی جس میں رہنے والا کبھی گھاٹے میں نہیں رہتا اور دولت و اقتدار حاصل کرنے کا اس سے اچھا اور کوئی ذریعہ ہی نہیں۔ پیسہ اور اقتدار ہی کے لیے تو انسان (آج کا انسان!) جیتا ہے۔ کانگریس میں جب تک ان چیزوں کا رس رہا، لوگ اس میں سٹتے رہے اور جو نہیں سٹ سکے، وہ اس کے لیے ترستے رہے۔ جب رس ختم ہوتا نظر آنے لگا تو پھر لوگ اس میں کیسے رہ سکتے تھے، اور کیوں رہتے۔ جہاں یہ چیزیں نظر آ رہی تھیں، وہاں لوگ دوڑے جا رہے تھے۔ ایک ایک آدمی اندرا گاندھی کو چھوڑ چھوڑ کر بھاگنے لگا۔ صورت حال یہ ہو گئی کہ اُن کے پاس ایسے لوگ بھی نہیں رہے جو اُن کی طرف سے اُمیدوار بن سکیں۔ تم جانو کہ ہم لوگ تو وہ ہیں جنھوں نے اپنا خون پلا پلا کر کانگریس کو پالا ہے۔ اگرچہ تندرست و توانا ہو کر کانگریس ہم لوگوں کو دھتکارتی بھی رہی۔ بالکل یوں کہ جس طرح ناخلف اولاد، اپنی جوانی کے زعم میں ضعیف ماں باپ کو نہیں پوچھتی، لیکن ماں باپ کے دلوں میں اولاد کی محبت تو باقی ہی رہتی ہے۔ کانگریس نے ہم لوگوں کو بے شک دھتکارا، لیکن اپنے خون سے سینچے ہوئے جسم کو ہم لوگ کیسے چھوڑ سکتے تھے۔ اندرا گاندھی، نہرو کی بیٹی تھیں ——— وہ نہرو، جس کے

بارے میں سردار پٹیل نے کہا تھا کہ ہندوستان میں بس ایک ہی ــــــ صرف ایک مسلمان رہ گیا ہے اور وہ ہے جواہر لال نہرو ــــــ اندرا گاندھی نے مجھے اور اجودھیا بابو کو بلایا اور پارلیامنٹ کے الیکشن میں حصّہ لینے کو کہا۔ ہم لوگ تیار تو ہو گئے، لیکن مشکل یہ آپڑی کہ میں چاہتا تھا کہ اجودھیا بابو اُمیدوار ہوں اور اجودھیا بابو میرے حق میں تھے۔ تم جانتے ہو کہ اجودھیا بابو نے اقتدار کی کبھی پروا نہیں کی اور اپنے ذاتی فائدے کی بات کبھی نہیں سوچی۔ میں چاہتا تھا کہ کم از کم اس عمر میں تو اجودھیا بابو اُس ایوان میں پہنچ جائیں جہاں بیٹھ کر قانون بنایا جاتا ہے، میں تو بہت بیٹھ کر قانون بنا چکا تھا، اور اس سلسلے میں اجودھیا بابو کے بہت طعنے سُن چکا تھا، چاہتا تھا کہ وہ خود سمندر میں تیر کر دیکھیں کہ اس میں کتنا پانی ہے۔ شاید میں انہیں تیار بھی کر لیتا کہ دلّی سے اُمیدواری کا اعلان ہو گیا، ٹکٹ مجھے ہی ملی، شاید اس لیے کہ میں اس میدان کا جانا بوجھا کھلاڑی تھا اور پھر یہ جگہ مسلم سیٹ کے طور پر مشہور ہو چکی تھی، اجودھیا بابو کو دوسری جگہ کا آفر ملا لیکن انہوں نے اس مضحکہ خیز آفر کو ٹھکرا دیا۔ حالانکہ ــــــ میاں جب سے کانگریس نے انڈسٹری کی شکل اختیار کی ہے بہت سے اُمیدوار اور ووٹروں کے درمیان کا رشتہ ہی ختم ہو گیا ہے۔ ووٹ یا تو اندرا گاندھی کو دینا ہے یا پھر اُنہیں نہیں دینا ہے، اس لیے اس کی کیا ضرورت کہ اُمیدوار، ووٹروں کی پہچان کا بھی ہو۔ کیا کیا جائے، ہم لوگ دراصل جس مٹی سے بنے ہیں، وہ اب دستیاب ہی نہیں ہے۔ اجودھیا بابو کو بہت طرح سے گھیرا گیا، اُنہیں صرف کھڑا ہونا تھا، خرچ اور سارے انتظامات پارٹی کرتی، لیکن وہ تیار نہیں ہوئے۔

خیر صاحب، تو میں برسوں کے بعد پھر اسی کوچہ میں جا نکلا جہاں سے نکالا تو نہیں گیا تھا، ہاں اپنا دل توڑ کر ضرور چلا گیا تھا۔ یوں شہر اور دیہات کے بہت سے لوگ میرے پاس مشورے کے لیے آتے رہے، اپنے مسائل میرے سامنے رکھتے رہے اور میں حتی المقدور اُن کی مدد کرتا رہا۔ اس طرح عوام سے میرا رشتہ کسی نہ کسی شکل میں قائم رہا۔ یہ بات ضرور ہے کہ اس رشتے میں گرمی باقی نہ رہی۔ لیکن میں نے اس رشتہ پر اپنا اعتماد کبھی نہیں کھویا۔ میں ساری

زندگی، عوام کے ساتھ رہا ہوں۔ کچھ وقت اقتدار کے ذریعہ بھی خدمت کرنے کا موقع ملا ہے۔ مجھے یہ یقین تھا کہ جب میں عوام کے سامنے چلا جاؤں گا تو وہ مجھے دیکھ کر، وہ سارا غم و غصہ کو یکسر بھلا دیں گے جو اُن پر کسی نہ کسی سبب طاری تھا۔ فضا بہت بدلی ہوئی تھی۔ کانگریسیوں کو ہر جگہ مار پڑ رہی تھی۔ خود اندرا گاندھی کے لیے جلسوں میں تقریر کرنا مشکل ہو رہا تھا، لیکن اُن کے لیے تو پولیس اور انتظامیہ جلسے کا انتظام کر ہی دیتی تھیں، دوسروں کے لیے عوام کا سامنا کرنا مشکل تھا۔ یہ ہندوستان کی سیاسی تواریخ کا ایک انوکھا باب تھا۔

اب تک کانگریسی نہرو اور اندرا کے سہارے بڑے آرام سے اوپر پہنچتے رہے تھے، محنت کرنے اور عوام کا سامنا کرنے کی اُن میں عادت نہیں تھی۔ دوسری طرف مخالف جماعتوں کے لوگ شروع ہی سے محنت کے عادی تھے۔ وہ بڑی محنت اور مشقت کے بعد مجلس قانون ساز میں میں پہنچ پاتے نئی صورت حال تو اُن کے لیے بہت ہی سازگار تھی۔ ایسی فضا بندی، چاروں طرف ہوئی کہ سچ اور جھوٹ کا فرق آنکھوں نے بھلا دیا۔ گوئبلز کا یہ کہنا کتنا سچ ہے کہ جھوٹ کو اتنی بار دہراؤ کہ لوگ اسے سچ سمجھنے پر مجبور ہو جائیں۔ میں جان رہا تھا کہ صورت حال دوسری ہے، پھر بھی مجھے عوام کا سامنا کرنے میں کوئی گھبراہٹ نہیں تھی۔

اُمیدواری کا پرچہ داخل کرنے کے بعد میں نے اپنے کارکنوں کو منظم کیا۔ اُس وقت مجھ پر پہلی بار یہ انکشاف ہوا کہ کانگریس میں تو کوئی کارکن ہے ہی نہیں، البتہ روزانہ اُجرت پر کام کرنے والوں کی بھرمار تھی اور وہ سب بھی اس وقت مُنہ چھپاتے پھر رہے تھے۔ اجودھیا بابو نے مجھے بتایا کہ اکثر لوگ ایسے ہیں کہ دونوں طرف سے پیسہ لیتے ہیں اور کام کس کا کرتے ہیں، یہ پتہ ہی نہیں چلتا۔ میرے لیے یہ صورت حال بالکل نئی تھی اور میں کسی طرح بھی اس سے سمجھوتہ نہیں کر سکتا تھا۔ صوبائی کانگریس کے صدر سے میں نے صاف کہہ دیا کہ میں نہ پیسہ لوں گا، نہ خرچ کروں گا۔ آپ کسی کو وہاں خرچ کے لیے مقرر کیجیے۔ صوبائی صدر میرا مُنہ تاکنے لگے، شاید اُنھوں نے پہلی بار اس قسم کی بات سُنی تھی۔

اب سُنو یہاں کا تماشا۔ جب لوگوں کو یہ پتہ چلا کہ میں نے پیسہ اپنے ہاتھوں میں لینے سے

انکار کر دیا ہے تو وہ اتنے مایوس ہوئے کہ میں اُن کی صورت کو ترس گیا۔ وہ تو کہیے کہ صوبائی کانگریس کا نمائندہ جلد ہی آ گیا اور اس کے اِرد گرد بھیڑ نظر آنے لگی۔ میں جانتا تھا کہ ان تماشوں سے الیکشن نہیں جیتا جاتا۔ چنانچہ میں اپنے پُرانے ساتھیوں سے ملا۔ اُن کے ذہن اور جسموں سے ملال اور سُستی کو دور کیا اور اُنہیں پرانے کوچوں کی سیر کی دعوت دی۔ اس دعوت میں اُنہیں کشش لگی اور وہ گھروں سے نکل پڑے۔

میاں! میں اپنی بے وقوفی اور ناواقفیت کا اعتراف کرتا ہوں۔ مجھے مطلق پتہ نہیں تھا کہ حالات واقعی بہت بدل چکے ہیں۔ گاندھی، نہرو اور آزاد کے نام اپنی کشش کھو چکے ہیں اور اندرا گاندھی سے اتنی بددلی پیدا ہو چکی ہے کہ لوگ اب اُن کا نام لینا بھی گوارا نہیں کرتے۔ مجھ سے ایسے ایسے سوالات کیے جاتے جن کا میرے پاس کوئی جواب نہ ہوتا، اپنی بے بسی پر مجھے رونا آ جاتا۔ افسوس اس کا ہوتا کہ مجھے صورت حال کی پوری واقفیت نہ تھی ورنہ کم از کم میں چپ تو نہ رہتا۔ لوگ میرے مُنہ پر آ کے کہتے کہ میں کیوں ضعیفی میں اپنی مٹی پلید کر رہا ہوں، اب تو مجھے گوشہ نشیں ہو کر یادِ الٰہی میں لگ جانا چاہیے ورنہ کیا اندرا گاندھی کا نام میری عاقبت سنوار دے گا ——— کچھ سوالوں کے جواب تو تھے لیکن مناظرہ بازی سے فائدہ بھی کیا تھا۔ کانگریس، لوگوں کے دلوں سے نکل چکی تھی اور اب کوئی کرشمہ، کوئی چمتکار کارگر نہیں رہا تھا۔ اس وقت مجھے واقعی افسوس ہوا کہ ہم لوگوں کو بھی اس طرح سنیاس نہیں لینا چاہیے تھا ورنہ اتنی عظیم جماعت کا یوں ستیاناس نہ ہو جاتا۔ ہم لوگوں کے زمانے میں پارٹی کے اندر ایک بہت ہی منظم جمہوری نظام ہوا کرتا تھا۔ سرکار میں رہنا کوئی فخر کی بات نہیں تھی، تنظیم میں رہنا البتہ طرۂ امتیاز تھا۔ تنظیم کو سرکار پر فوقیت حاصل تھی کہ سرکار تو تنظیم سے جنم لیتی ہے۔ لیکن اب صورت حال یہ ہے کہ تنظیم سرکار کے ہاتھوں کی ایک آلہ کار بن چکی ہے، حکومت، سرکار کی چلتی ہے، تنظیم کی نہیں ———

شاید تم میری بے رس باتوں سے بور ہو رہے ہو، لیکن میری باتیں گرہ میں باندھ لو۔

شاید تمہارے یہاں کبھی بھولے بھٹکے جمہوریت آجائے تو اس وقت تمہیں ان باتوں کی ضرورت ہوگی اور اگر خدانخواستہ جمہوریت نہیں بھی آسکی تو یہ ایک علم ہوگا جس کا جاننا اور بہت سے علموں کی طرح رائیگاں نہیں جائے گا۔

تو میاں، ہم الیکشن ہار گئے۔ ضمانت تک ضبط ہوگئی۔ ایک ایسا اُمیدوار کامیاب ہوگیا جو کبھی میرا کارکن ہوا کرتا تھا۔ خیر یہ کوئی ایسی بات نہیں جس پر افسوس یا تعجب ہو، سیاست میں ایسا ہونا عین ممکن ہے۔ کمال تو یہ ہے کہ جو لوگ اُسے نہیں جانتے تھے، اُنہوں نے بھی اُسے ووٹ دیا، محض ضد میں ـــــ پورے شمالی ہند میں کانگریس کا پتہ صاف ہوگیا۔ اِندرا گاندھی ہار گئیں۔ اُن کے سبھی لوگ ہار گئے۔ ذاتی طور پر تو مجھے اپنی ہار کا کوئی ایسا اثر نہیں ہوا، الیکشن میں ہار جیت تو ہوتی ہی رہتی ہے۔ افسوس اس کا ہوا کہ اُس تنظیم کو خاک چاٹنی پڑی جو کبھی ہندوستانی عوام کے دل کی دھڑکن ہوا کرتی تھی۔ ہندوستان کا دوسرا نام کانگریس تھا۔ بہرکیف جنتا پارٹی کی حکومت بنی۔ اندرا گاندھی پر ان لوگوں نے مقدمہ چلایا، اُنہیں جیل بھجوا دیا۔ یہ لوگ اقتدار کے نشہ میں آپس ہی میں اس طرح لڑ پڑے کہ اُنہیں کچھ ہوش ہی نہ رہا۔ جمہوریت کی ایک خرابی یا اچھائی یہ ہے کہ کبھی نہ کبھی عوام کا سامنا کرنا ہی پڑتا ہے، سو پھر الیکشن ہوا۔ اندرا گاندھی اتنے دنوں میں حالات کے داؤں پیچ کو اچھی طرح سمجھ گئی تھیں۔ انہوں نے ہارنے کے بعد جو حکمت عملی استعمال کی، وہ بڑی ہی انوکھی اور جدید ہے۔ تم بھی سُنو۔

ایک ڈاکٹر چندیشور پرشاد ہیں۔ زبردست پریکٹس ہے، خوب پیسے کما چکے ہیں، باہر بھی گھوم آئے ہیں، ان کو شوق چرایا کہ ذرا الیکشن میں بھی کھڑا ہوا جائے۔ چنانچہ اُمیدواری کی درخواست دی گئی۔ کانگریس کا ایک مرکزی نمائندہ پٹنہ آیا تاکہ اس کی مدد سے اُمیدواری کی فہرست تیار کی جاسکے۔ اس سے ڈاکٹر صاحب موصوف کی مندرجہ ذیل گفتگو ہوئی۔

"آپ کے پاس الیکشن میں خرچ کے لیے کتنے روپے ہیں۔؟"

"یہی کوئی لاکھ، ڈیڑھ لاکھ۔"

" آپ کے پاس MAN POWER کتنا ہے۔؟ "

" کوئی سو آدمی۔ "

" آپ کے پاس بندوق اور دوسرے ہتھیار کتنے ہیں۔؟ "

" ایک لائسنس شدہ بندوق اور کچھ بھالے۔ "

" بوتھوں پر قبضہ کرنے کے لیے آپ کے پاس ذرائع۔؟ "

" ایک بھی نہیں۔ "

" ڈاکٹر صاحب، آپ شریف آدمی ہیں، ہزاروں کی پریکٹس ہے، آپ کیوں اس جھنجھٹ میں پڑنا چاہتے ہیں۔ یہ سب دوسروں کے لیے چھوڑ دیجیے۔ "

" میں عوام کی خدمت اونچی سطح پر کرنا چاہتا ہوں اور یہ سمجھتا ہوں کہ دوسروں سے زیادہ اُن کی خدمت کر سکوں گا۔ "

" لیکن پہلے تو لوک سبھا میں اکثریت حاصل کرنا ہے۔ آج کل تو اقتدار حاصل کیے بغیر کسی کی خدمت نہیں ہوتی اور اس وقت یہ بہت ضروری ہے کہ ایک ایک امیدوار کے پاس تین تین، چار چار لاکھ روپے ہوں، کم از کم ایک ہزار کی تعداد میں MAN POWER ہو تاکہ بوتھوں پر قبضہ کیا جائے، اس کے لیے ہتھیار ہوں اور دوسرے ذرائع ہوں، وغیرہ وغیرہ ——— آپ یہ سب کر سکیں گے۔؟ "

بیچارا ڈاکٹر منہ لٹکائے واپس آ گیا۔ کانگریس نے انہیں لوگوں کو ٹکٹ دیا جنھوں نے یہ شرائط پوری کر دیں اور وہی لوگ جیتے بھی۔ تمہارے خالو، جو کبھی تنظیم سے براہ راست وابستہ نہیں رہے۔ لیکن وہ ہمیشہ لیڈر سمجھے جاتے رہے، وجہ یہ ہے کہ اُن کا رہنا سہنا اور زندگی کے سارے انداز لیڈروں جیسے تھے۔ اُن کے یہاں منسٹر آتے، ممبرانِ قانون ساز آتے، ان کا بھی ایک پیر دلّی میں رہتا، دوسرا پیر پٹنہ میں۔ میری خواہش ہوتی کہ اُن سے پوچھوں کہ میاں، اتنے خرچ کے لیے پیسے کہاں سے لاتے ہو، لیکن زبان پر آتے آتے میری یہ خواہش دم توڑ دیتی۔ جب کبھی کسی لیڈر کو جلسے جلوس کے لیے بھیڑ کی ضرورت ہوتی تو وہ تمہارے خالو کے پاس دوڑا آتا

اور پتہ نہیں کہاں سے اور کون سی ترکیب سے یہ حضرت ہزاروں کی بھیڑ اکٹھی کر لیتے اور جلسے جلوس کو کامیاب کروا دیتے۔ کانگریس نے اس دفعہ ان کو بھی ٹکٹ دیا کوڈرما سے، جو یہاں سے دور ہونے کے علاوہ اُن کے لیے بالکل اجنبی جگہ ہے۔ وہ کامیاب بھی ہو گئے۔ اُن کے پاس روپیہ، ہتھیار، ذرائع اور آدمی کہاں سے آئے، یہ سب چینو، راز ہی ہے۔

ہم لوگوں کو تو اس الیکشن میں پوچھا بھی نہیں گیا۔ ہم سبھی لوگ اس پوری مدت میں گھروں میں بند رہے اور اخبارات کے ذریعہ باہر کا حال چال لیتے رہے کہ اس کے علاوہ اور کوئی ذریعہ ہمارے پاس تھا ہی نہیں۔ ووٹ دینے گئے تو پتہ چلا کہ ہمارے ووٹ تو پڑ چکے، کس نے دیا، کیسے دیا، یہ سب کچھ پتہ نہیں، منہ لٹکائے ہوئے واپس آ گئے ______ میاں، اب ہم جیسے لوگوں کی ریٹائرمنٹ کا صحیح وقت آ پہنچا ہے اور اب ہمیں ہرگز اپنے گوشوں سے نہیں نکلنا چاہیے، ورنہ اب عاقبت سنورنے کی جو ایک اُمید ہے، وہ بھی ختم ہو جائے گی ______ نہ تو کعبہ ہی ملے گا، نہ وصالِ صنم۔

جی چاہتا ہے کچھ تم سے مسلمانوں کے بارے میں بات کروں۔ اب تک تو یہ ہوتا تھا کہ جہاں کوئی مسئلہ کھڑا ہوا، مسلمان میدان چھوڑ کر بھاگا، کیوں کہ بھاگنے سے زیادہ آسان راستہ اور کون ہو سکتا ہے۔ ظاہر ہے کہ اُس کے بھاگ جانے کے بعد پیدا شدہ مسئلہ یک طرفہ انداز میں سلجھا لیا جاتا تھا۔ مگر ہوا یوں کہ سرحدیں بدلیں تو میدان ختم، بھاگنے کا راستہ بھی بند۔ نتیجہ یہ کہ اب جو مسئلہ پیدا ہوتا ہے، اُس کا سامنا کرنا ہی پڑتا ہے۔ دیہاتوں اور شہروں سے جو بے شمار لوگ پاکستان بھاگے تھے، وہاں مسجدوں اور قبرستانوں کے لیے وقف بڑی وسیع و عریض زمینیں تھیں جو کچھ دنوں تک تو یوں ہی پڑی رہیں، پھر آہستہ آہستہ مسجدوں میں جانور باندھے جانے لگے اور قبرستانوں کو چراگاہ کی شکل دے دی گئی۔ زمانے کی کروٹوں نے جب زمینوں کی قیمت آسمانوں پر پہنچا دیں تو ان بے سہارا زمینوں کی قسمت بھی بدلی، جو انہیں دیکھتا، اُس کے منہ میں پانی بھر آتا، ان کو ہتھیانے اور قبضہ کرنے کی طرح طرح کی اسکیمیں بننے لگیں۔ انہیں اسکیموں کے درمیان ایک آسان اور سامنے کا راستہ نکل آیا۔

خود مسلمانوں میں بہت سے ایسے ضرورت مند پیدا ہو جو جعلی کاغذ بنوا کر اونے پونے داموں میں ان زمینوں کو فروخت کرنے پر راضی ہو گئے ـــــــــ پیسہ میں بہت بڑی طاقت ہے حامد بیٹے ۔ اس کی ضرورت انسان کو بڑا سے بڑا اور چھوٹا سے چھوٹا کام کرانے کی صلاحیت رکھتی ہے ۔ بیچنے والا بھی خوش، خریدنے والا بھی خوش، چلو چھٹی ہوئی ـــــــ لیکن چھٹی نہیں ہوئی نا ۔ اِدھر مسلمان جو دھڑا دھڑ عرب جانے لگے تو اُن کے پاس پیسے بھی آ گئے ۔ پہلے پہل تو وہ پیسے کی ریل پیل دیکھ کر بدحواس رہے، پھر ہوش ٹھکانے آئے تو کچھ عرصہ تک پیسہ کھاتے، پیسہ پیتے اور پیسہ اوڑھتے رہے، اچانک اُنہیں خیال آیا کہ مسجدوں اور قبرستانوں کی طرف بھی دھیان دینا چاہیے کہ خدا کو بھی مُنہ دکھانا ہے ۔ اب جو زمینوں پر جاتے ہیں تو وہاں اغیار کا قبضہ ـــــــ اور یوں ہی نہیں وہ اس کی لکھا پڑھی کے ساتھ قیمت ادا کر چکے ہیں ۔ اُن سے خالی کرنے کو کہا جاتا ہے تو وہ کیوں خالی کرنے لگے ۔ کئی جگہ اس مسئلے کو لے کر مار کاٹ ہو چکی ہے ۔ ہمارے برادرانِ وطن کے ذہنوں میں یہ شک و شبہ جڑ پکڑ گیا ہے کہ مسلمانوں کے پاس عرب سے بے اندازہ پیسے آ رہے ہیں اور وہ اُنہیں بے دخل کر کے سارے ہندوستان ہی کو خرید لیں گے ۔ ادھر مسلمان یہ کہتے ہیں کہ جب وہ بے سہارا تھے، غریب تھے تو انہوں نے بہت ظلم سہے، اب اُن کے پاس بھی پیسے آ گئے ہیں تو وہ مزید ظلم نہیں سہیں گے ۔

زمین کی حالت یہ ہے کہ جلد ہی وہ دن بھی آنے والا ہے جب لوگ دو دو گز زمین کو ترس جائیں گے، اب زمین کو ہتھیلی میں رکھ کر اسے سونگھا جاتا ہے، اس سے بناؤ سنگھار کے کام لیے جاتے ہیں اور اس کی بنیاد پر سماجی مرتبوں کا تعین ہوتا ہے ـــــــ لیکن یہ مسئلہ ہے گمبھیر، میرے پاس دیہاتوں اور شہروں سے لوگ آتے رہتے ہیں، لیکن میں کیا کر سکتا ہوں، یہ اپنے لیڈروں کے پاس جاتے ہیں تو اول اُن سے ملاقات ہی نہیں ہوتی، دوم ملاقات ہو بھی جاتی ہے تو وہ اتنے خوب صورت وعدوں میں اُنہیں اُلجھا کر مسحور کر دیتے ہیں کہ برسوں کے بعد انہیں ہوش آتا ہے ۔ تب یہ ہم جیسوں کے یہاں دوڑے آتے ہیں،

اور ہم لوگوں کی اب سنتا ہی کون ہے۔ میں اوپر سے لے کر نیچے تک کہتا پھرا کہ سرکاری کاغذات میں جو زمینیں مسجدوں اور قبرستانوں کے لیے وقف ہیں، اُن کی نشان دہی کر کے انہیں سرکاری انتظام میں لے لو، لیکن کون سنتا ہے فغانِ درویش۔

اِدھر بہار شریف میں بڑا بھیانک فساد ہو گیا۔ وجہ وہ نہیں تھی لیکن کشیدگی کی وجہ وہ ضرور تھی جو میں تمہیں بتا چکا ہوں۔ یہ کشیدگی بہت دنوں سے اندرونی بخار کی طرح تپ رہی تھی۔ ایک شراب خانے میں نشہ میں چور، کچھ لوگ لڑ پڑے۔ ان میں ایک طرف ہندو تھے، دوسری طرف مسلمان۔ دیکھتے دیکھتے سارا شہر آگ کے شعلوں سے گھر گیا۔ حکام کو کچھ نہ سوجھی تو انہوں نے شہر میں کرفیو لگا دیا اور پرامن لوگ گھروں میں بند ہو گئے۔ انہیں کچھ پتہ بھی نہ چلا کہ باہر کیا ہو رہا ہے، باہر یوں بھی سناٹا تھا لیکن آگ تو دیہاتوں میں بھی پہنچ چکی تھی اور شہر کے باہر کے راستے کھلے ہوئے میدان تھے۔ فسادیوں کو ان میدانوں اور دیہاتوں میں خوب چھوٹ ملی۔ دیہاتوں میں تو وہی بچ سکے جو یا تو رنگ ڈھنگ دیکھ کر پہلے ہی بھاگ چکے تھے یا پھر اُن کے پڑوسیوں نے اپنی جانوں پر کھیل کر انہیں بچایا۔ اس فساد کی خصوصیت یہ دیکھنے میں آئی کہ اونچی ذات کے ہندوؤں نے فساد میں بالکل حصّہ نہیں لیا بلکہ ان لوگوں نے اپنی حدوں سے آگے جا کر مسلمانوں کی جانیں بچائیں جب کہ پچھڑی جاتی کے لوگوں نے اس میں خوب دل کھول کر حصّہ لیا۔ بات یہ ہے کہ ۱۹۴۶ء میں یہی لوگ فساد میں استعمال کیے گئے تھے۔ اگرچہ براہ راست انہیں فائدہ کم ہی پہنچا تھا لیکن اس کا مزا تو انہیں مل ہی چکا تھا۔ آزاد ہندوستان میں تو اب یہی لوگ ہیں جو ہر فائدے کے حق دار ہیں، اونچی ذات والوں کو اب کوئی نہیں پوچھتا، دیہاتوں میں اب ان کا عزّت سے رہنا مشکل ہو گیا ہے۔ پچھڑی جاتی کے لوگ ان کے گھروں میں گھس کر بہو، بیٹیوں کی عزّت لوٹتے ہیں، نوکریوں میں کوٹہ لے جاتے ہیں، اونچی ذات والوں کا زمانہ اب لد گیا ہے۔ دونوں کے درمیان نفرت کی ایسی خلیج قائم ہو گئی ہے جس کا پاٹنا ممکن نظر نہیں آتا۔

تو میں یہ کہہ رہا تھا کہ دیہاتوں میں اونچی ذات والوں کے پاس اب بھی اونچی

کوٹھیاں ہیں، مضبوط کواڑ ہیں اور شکار کا شوق پورا کرنے کیلیے بندوق ہے اس لیے بہت سے غریب مسلمانوں کی جان بچ گئی۔ فسادی، شہر کے باہر بائی پاس پر جا کر بیٹھ گئے اور آنے جانے والی بسوں اور موٹروں کی تلاشی شروع کی۔ اس تلاشی میں جو فرد بھی داڑھی رکھے پایا گیا یا اس کے ہاتھوں میں اُردو اخبار ملا، اُسے مسلمان سمجھ کر قتل کر دیا گیا۔ اس دھوکے میں بیچارے کرنل گپتا کا اکلوتا بیٹا بھی مارا گیا۔ تم شاید کرنل گپتا کو جانتے ہو گے، جب میں پٹنہ میں تھا تو ان کے ہاں آنا جانا تھا۔ اِدھر شہر میں کرفیو اُٹھا، اُدھر فساد کا سلسلہ بھی رُکا، خوب ہنگامہ رہا۔ منسٹر آئے، چیف منسٹر آئے، پرائم منسٹر کا دورہ بھی ہوا، آنسو پونچھے گئے، وعدے وعید ہوئے، امداد اور چندے کا سلسلہ شروع ہوا، غرض وہ سب کچھ ہوا جو ایسے موقع پر ہوا کرتا ہے۔ لیکن میاں، ایک بات، مسلمان اس صورت حال سے ہراساں نہیں ہے۔ اُسے افسوس اِس کا ہے کہ وہ بے خبری میں مارا گیا۔ وہ دھوکا اس لیے کھا گیا کہ وہ کرفیو کے احترام میں گھر میں بند ہو گیا تھا۔

اِدھر ۱۹۴۶ء پھر زندہ ہو گیا ہے لیکن بر انداز دیگر۔ پہلے لوگ پاکستان بھاگتے تھے اب دیہاتوں سے بھاگ کر شہر آتے ہیں۔ خطرناک بات یہ ہے کہ اب آبادیاں فرقہ وارانہ بنیادوں پر استوار ہونے لگی ہیں۔ ہندوؤں کے محلے میں مسلمان بسنا پسند نہیں کرتا، اور مسلمانوں کے محلے میں ہندو رہنا نہیں چاہتا۔ مسلمان، ہندو کے محلے سے بھاگ رہا ہے اور ہندو، مسلمان کے محلے سے۔ اب ذرا سوچو (تم سے ہندوستان کا اتنا رشتہ تو ہے ہی کہ اِس کے بارے میں کچھ سوچ سکو۔) کہ اگر یہی صورت حال رہی تو ملک کتنے ٹکڑوں میں بٹے گا، آج تو ہم ایک ہی تقسیم کو لے کر رو رہے ہیں لیکن یہاں تو ان گنت تقسیم کے بیج بوئے جا رہے ہیں۔ کیا کیا خواب دیکھے تھے ہم لوگوں نے اور کیا تعبیر دیکھنے کو مل رہی ہے۔ ہاتھ مل مل کے رہ جاتے ہیں، لیکن کر ہی کیا سکتے ہیں، اپنے بس میں تو کچھ ہے ہی نہیں۔

خط خواہ مخواہ طویل ہوتا جا رہا ہے۔ قلم ہاتھ میں ضرور ہے لیکن دماغ و ذہن قابو میں نہیں۔ شروع کرتا ہوں قلم سے، اور ذہن اُسے اُڑا کر کہاں سے کہاں لے جاتا ہے،

جب اپنی کہی پر لوٹتا ہوں تو لگتا ہے کہ ابھی تو بہت سی باتیں کہنے کو رہ گئی ہیں، ابھی کہاں کچھ کہا ———

تمہاری نانی اماں اللہ کو پیاری ہو گئیں ۔ اُن کی ساری زندگی ہندوستان کی سیاسی تواریخ کا ایک مکمّل باب ہے۔ جو وطن دوستی کے دعووں کی ضخیم کتابوں پر سُلگتی ہوئی ٹکیہ کی طرح رکھا ہوا ہے۔ اُن کے شوہر بہت بڑے قوم پرست تھے ۔ افسوس اُن کی زندگی نے وفا نہ کی ورنہ ملک کی قسمت لکھنے والے ہاتھوں میں ایک ہاتھ اُن کا بھی ہوتا۔ وہ ایک سیدھی سادی گھریلو عورت تھیں۔ شوہر نے اُنہیں سیاست سکھانے کی کوشش کبھی نہیں کی، لیکن وہ اتنا جانتی تھیں کہ وطن سے محبت کرنا ایمان کا ایک جُز ہے اور وطن کے لیے کٹ مرنا عین عبادت ۔

پاکستان کا قیام، ہندوستان کے اُن مسلمانوں کے لیے جو ہر قیمت پر ہندوستان ہی میں رہنا چاہتے تھے، ذلّت کا پروانہ ثابت ہوگا، یہ بات ہر وہ آدمی سمجھ رہا تھا۔ جو تمہارے نانا کے ساتھ کام کیے ہوئے تھا۔ تمہاری نانی اماّں بھی اس بات کو اچھی طرح سمجھتی تھیں ۔ جب اُن کے بیٹے چلے گئے، تو وہ محبّت اور نفرت کے ایسے جزیرے میں پھنس گئیں کہ اگر محبت اُن کو آگے کھینچتی تھی تو نفرت اسی طاقت سے پیچھے ۔ پاکستان نے اُن کے بیٹوں کو نہیں آنے دیا تو وہ پاکستان سے نفرت کرنے لگیں، لیکن جب تمہارے بڑے ماموں مرکر پاکستان ہی کی سرزمین میں دفن ہو گئے، تو پاکستان اُن کی محبت کا بھی ایک حق دار بن گیا ۔ وہ پاکستان سے نفرت کرنا چاہتی تھیں، لیکن جب بھی وہ اس راہ میں کچھ آگے بڑھتیں تو لاشعوری طور پر اُن کے اندر محبّت کا جذبہ جاگ اُٹھتا، بس وہ وہیں پر رُک جاتیں اور کچھ دم لے کر پیچھے لوٹ آتیں ۔ وہ ایک ایسے NO MANS LAND میں قید ہو گئی تھیں جس میں پیچھے کا دروازہ بند تھا اور آگے کا مخدوش ۔ ساری زندگی وہ اسی طرح قید رہیں ۔ جب تمہاری والدہ کا انتقال ہوا تو اُن سے یہ خبر پوشیدہ رکھنے کی کوشش کی گئی ۔ لیکن وہ ایک زمانہ میں اتنی باہوش و حواس رہ چکی تھیں کہ اُن کی نظروں سے کچھ پوشیدہ رکھنا ممکن نہیں تھا۔ بدحواسی کے عالم میں بھی انہیں محسوس ہوا کہ ضرور پاکستان اُن کے ساتھ پھر کوئی چال چل گیا ہے ۔ وہ ایک

وقت پاکستان کو دعائیں دینیں تو دوسرے وقت اُسے کوسنے۔ مجھے تو لگتا ہے کہ خالقِ دوجہاں بھی اُن کی یہ کیفیت دیکھ کر مشکل میں پڑ گیا ہو گا کہ اُن کی کون سی بات مانے اور کون سی نہیں۔ مرتے وقت بھی اُن کی زبان پر پاکستان کا نام تھا لیکن یہ پتہ نہیں کہ وہ پاکستان کے بارے میں کیا سوچ رہی تھیں۔

اُن کے مرنے کے بعد سے تو گھر کا نقشہ ہی کچھ اور ہو گیا ہے۔ تمہاری پھوپھی کا تو ذکر ہی فضول ہے۔ انہوں نے اپنے آپ کو زندہ سمجھا ہی کب ـــــــ نیاض کی دیوانگی پھر عود کر آئی ہے۔ یا تو وہ چپ رہتا ہے بالکل خاموش، یا پھر دیوانوں جیسی حرکتیں کرتا رہتا ہے۔ دُکان بھی سمجھو کہ بند ہی ہے۔ نوکر چاکر اُس کی مار پیٹ سے تنگ آ کر بھاگ گئے ہیں۔ شادی تو اس کی ابھی تک نہیں ہوئی اور اب دیوانے سے کون شادی کرے گا۔ نثار میاں کپڑے سی سی کر خوب کما رہے ہیں اور پتہ نہیں کس روز کے لیے پیسے جمع کر رہے ہیں ـــــــ

لیکن میاں، تمہارے ماموں بھی خوب چیز ہیں۔ ایک بار جو پاکستان گئے، تو پھر پلٹ کر آنے کا نام نہ لیا۔ ماں اور اولاد' دونوں کی محبّت، اُن کے پَیروں میں لپٹ جانے سے قاصر رہی۔ کوئی ہوش مند یہاں موجود نہیں، اس گھر کا کیا ہو گا، خدا کو معلوم۔ اب میں بھی کتنے دنوں کا مہمان ہوں۔ میں یوں بھی کسی کام کا نہیں، لیکن اتنی بات ضرور ہے کہ اپنے جیتے جی کم از کم میں اِس گھر کی دیوار کو کبھی گرنے نہیں دوں گا۔ انشاءاللہ۔

یاد آیا ساجد ـــ اسے تو گھر سے کوئی واسطہ ہی نہیں رہا۔ وہ ایک محکمہ کا سکریٹری ہو گیا ہے۔ ایک آئی اے ایس لڑکی سے اس نے شادی ـــــ نہیں میرج کر لی ہے۔ لڑکی مسلمان نہیں ہے۔ مجھ سے اُس نے پوچھا ضرور تھا لیکن یہ پوچھنا محض اطلاع دینے کے مترادف تھا۔ سو مجھے اطلاع مل گئی اور میں خاموش رہا، اور کرتا بھی کیا۔

پتہ نہیں، اب دو گز زمین مجھ سے کتنی دُور رہ گئی ہے۔ خواہش تو ہے کہ اس سے ہزاروں میل دور جا کر حج کر آؤں، پتہ نہیں میری خواہش زمین کے کانوں تک بھی،

پہنچتی ہے یا نہیں۔

اچھا بیٹے، خوش رہو اور بچوں کو خوش رکھو۔ میں تو تمہیں کچھ دے نہ سکا، سوائے دعاؤں کے، لیکن تم بچوں کو بہت کچھ دینا ــــ دعاؤں کے ساتھ ساتھ۔

تمہارا

اختر حسین

▬▬

چوتھا حصّہ

۴۴

۱۵ اگست ۱۹۸۱ء

پیارے ابّا جان!

خدا کرے آپ سب بخیر ہوں

بہت دنوں سے آپ کا کوئی خط نہیں ملا، خیریت البتہ معلوم ہوتی رہی جس سے دل کو ایک گونہ سکون رہا۔ میں تو برابر خط لکھتا رہا ہوں۔ اگر ڈاک نے مہربانی نہ کی ہوگی تو یقیناً ملے ہوں گے۔ خدا کا شکر ہے کہ بخیر ہوں۔

ابّا، میں نے آپ کو بتایا تو تھا کہ ماموں جان کی مہربانیوں سے مجھے یہاں ایک بینک میں ملازمت مل گئی تھی۔ تنخواہ ایک ہزار روپیہ۔ شروع میں تو میں ماموں جان کے ساتھ ہی رہا، لیکن کب تک اُنھیں تکلیف دیتا۔ اُن کی اجازت سے ایک الگ مکان لیا۔ بڑی ممانی اور اُن کی بیٹی عالیہ بھی ہمارے ساتھ ہی آ گئیں۔ مکان کے کرایہ چار سو روپے ماہانہ میں، میں اور عالیہ نصف نصف ادا کر دیتے۔ تکلیف تو تھی، بقیہ پیسوں میں کیا ہو سکتا تھا۔ لیکن گزر بسر ہو ہی رہی تھی۔ پاکستان میں جو لوگ تقسیم کے فوراً بعد آئے، وہ مالی اعتبار سے یقینی فائدے میں رہے، بقیہ کی اُنھیں ضرورت ہی نہیں تھی۔ لیکن بنگلہ دیش کے سانحہ کے بعد جو لوگ آئے، وہ تو بس مقامی لوگوں کی روٹی کاٹتے رہے، اس سے صورت حال نازک ہوتی چلی گئی۔ مقامی لوگ، ہم لوگوں سے بری طرح نفرت کرتے لگے۔ کئی بار یہ نفرت رنگ لا چکی ہے اور کوئی تعجب نہیں کہ اچانک کوئی بڑا دھماکہ ہو جائے۔

ایک سال کے اندر عالیہ کی شادی ہو گئی اور وہ نوکری چھوڑ کر اپنے شوہر کے ساتھ امریکہ چلی گئی۔ چند مہینوں کے بعد ممانی بھی وہیں چلی گئیں۔ اب ہم لوگوں کے لیے بڑی مصیبت ہو گئی۔

تنخواہ کے چار سو روپے کرایہ کے کٹ جاتے تھے، بقیہ میں گزر بسر تو کیا ہوتی، فاقوں کی نوبت آجاتی۔ ناز یہ نوکری کرنا چاہتی تھی، لیکن یہاں بنگالیوں کے خلاف نفرت ابھی تک کم نہیں ہوئی ہے، اور ماموں جان کی ہدایت کے مطابق ہمیں یہ ظاہر نہیں ہونے دینا تھا کہ وہ بنگالی ہے۔ اس کے سبھی سرٹیفکٹ، ڈگریاں ڈھاکہ کی ہیں، اُن کے بغیر تو وہ یہاں مطلق جاہل ہے۔ دن بھر گھر میں بند رہنے اور کوفت سہتے سہتے اُس کی ذہنی حالت پھر بگڑ گئی۔ اب اندر باہر دونوں مجھے ہی دیکھنا پڑتا۔ رات کو میں نے ٹیوشن شروع کر دیا۔ کچھ پیسے آجاتے۔ خدا کا شکر ہے کہ ہم لوگ کراچی کی اصل آبادی سے دُور نسبتاً ایک غریب بستی میں تھے ورنہ کراچی میں تو زندگی کی ساری ضروریات مقابلہ کے ذریعہ پوری ہوتی ہیں۔ ہم لوگ اس مقابلے میں کہاں ٹھہر سکتے تھے۔

اِدھر سیاسی صورت حال ایسی ہوگئی کہ بہاریوں کے لیے زمین تنگ ہونے لگی۔ فوج تو بیرکوں میں واپس چلی گئی تھی اور بھٹّو صاحب آگئے تھے۔ وہ جمہوریت کا بہت نام لیتے، یوں بھی وہ جمہوریت ہی کی وجہ کر مغربی پاکستان کے واحد لیڈر بن کر اُبھرے تھے۔ اُن کا ملک پر بڑا احسان یہ ہے کہ وہ نوّے ہزار سے زائد فوجیوں کو ہندوستان سے چھڑا لائے تھے۔ اور ایک بے حد شکستہ اور شرمندہ قوم کے اندر انہوں نے وقار اور حوصلہ پیدا کر دیا تھا۔ ورنہ پاکستانی قوم جن حالات سے دوچار تھی، اس کے بعد کیا وہ زندہ رہ سکتی تھی۔ نہ صرف یہ کہ ملک کا ایک بڑا حِصّہ اس سے کٹ گیا تھا بلکہ لگ بھگ نوّے ہزار ہتھیار بند فوجیوں نے شرمناک طریقے سے ہتھیار ڈال دیے تھے۔ مسلمانوں کی تواریخ میں اس نوعیت کے سانحے کی کوئی دوسری مثال نہیں ملتی۔ فتح و شکست بالکل دوسری شے ہے اور بہت ہی عارضی۔ فتح کو شکست میں بدلنے میں دیر نہیں لگتی اور شکست کو فتح ہونے میں وقت نہیں لگتا۔

بہت دنوں تک یہاں کے لوگ طرح طرح سے اپنے آپ کو بہلانے میں مصروف رہے۔ صدیوں قبل کے ایک بزرگ شاہ نعمت اللہ کی ایک کتاب ڈھونڈ کر نکالی گئی اور سارے ملک میں اس کا خوب شہرہ رہا۔ اس کتاب میں اُنہوں نے (کسی) مشرقی حصّہ کی شکست کی پیشین گوئی کی تھی اور جلد ہی مغرب کے ذریعہ اس کی فتح کی بشارت بھی دی تھی۔ حقیقت یہ ہے کہ

سانحہ اتنا عظیم تھا کہ اگر قوم اس طرح اپنے آپ کو نہ بہلاتی تو نہ جانے اس کا کیا حشر ہوتا۔ یہاں تو اکثر کو یہ بھی پتہ نہیں کہ دراصل وہاں ہوا کیا تھا۔ کچھ لوگ تو بس یہ سمجھے ہوئے تھے کہ ہندوستان میں کوئی بڑا فساد ہوا ہے اور حسب دستور وہاں سے بھاگ کر لوگ پاکستان آگئے ہیں۔ بھٹو صاحب نے بھی اُن کی لاعلمی سے خوب فائدہ اُٹھایا۔ پہلے تو انہوں نے بہاریوں کو گلے لگایا، بعد میں اُن پر سندھی مذہب کا غلبہ ہوا۔ کراچی کے مضافات میں سندھی، بہاری کو اس طرح گھور گھور کر دیکھتا کہ جو بہاری، بنگلہ دیش دیکھ کر آیا تھا، وہ تو یوں سہم جاتا جیسے بلی کو دیکھ کر چوہا۔ کراچی میں ہر بہاری پچھلے کئی سالوں سے کسی بڑے واقعہ کا منتظر ہے۔ بس ایک چنگاری دکھانے کی دیر ہے ـــــ لاوا اندر اندر پک چکا ہے۔ آپ یقین مانیے ابا جان کہ اگر خدانخواستہ بہاری اور سندھی میں کبھی ٹھن گئی تو یہ کوئی معمولی واقعہ نہیں ہوگا، اس کی حیثیت تاریخی ہوگی۔ خدا کا شکر ہے کہ شاہ نعمت اللہ کی پیشین گوئی میں ایسی کوئی بات درج نہیں ہے ورنہ یہاں بہاری اتنے آرام سے پاؤں نہ پسار پاتے۔

بھٹو صاحب نے الیکشن بھی کرایا اور اگر انہوں نے اس میں دھاندلی کی تو یہ عین فطری امر تھا۔ جو قوم برسوں سے سوئی ہوئی ہو، اس میں خمار تو ہوگا ہی اور جب خمار ہوگا تو اس سے فائدہ اُٹھانے والے بھی ہوں گے ـــــــــ ہندوستان میں جمہوریت تو بالغ ہو چکی، وہاں کتنا صاف ستھرا الیکشن ہوتا ہے؟ اصل میں اس الیکشن کو تو برداشت کر لینا چاہیئے تھا، اس سے آگے کی راہیں کھل سکتی تھیں۔ پاکستان جیسے چھوٹے سے ملک میں صاف ستھری جمہوریت کا قیام کوئی ایسا کٹھن نہ ہوتا۔ پرابلم یہ ہے کہ یہاں کے سیاست داں تیس پینتیس برسوں سے اقتدار حاصل کرنے کی تگ و دو میں لگے ہوئے ہیں۔ اقتدار کی دیوی اپنی جھلک دکھاتی ہے لیکن فوراً ہی اندھیروں میں گم ہو جاتی ہے اور یہ ہاتھ ملتے رہ جاتے ہیں۔ بہت دنوں تک تو فوجی حکومت ہی رہی جو چولے بدل بدل کر اپنی عمر عزیز میں اضافے کرتی رہی۔ الیکشن ہوا تو ملک کے ٹکڑے ہی ہو گئے، قوم کو ایسی ذلت کا سامنا کرنا پڑا کہ تواریخ میں یہ باب ہمیشہ سلگتا رہے گا۔ پھر بھٹو صاحب آگئے۔ انہوں نے الیکشن کرا کے پانچ برسوں کے لیے اپنی عمر

بڑھائی۔ بھلا بتائیے تو بیچارے مایوس سیاست داں کب تک بیٹھے رہ سکتے تھے۔ انہوں نے فوجیوں کو بہکا کر بھٹو کا تختہ ہی اُلٹوا دیا اور اُنہیں ایک مقدمہ میں پھنسا کر پھانسی بھی لگوادی لیکن فوجی بھی کچھ کچّی گولیاں نہیں کھیلے تھے، وہ برسوں تک اقتدار کا مزا چکھ چکے تھے، اور بیرکوں میں سُستا سُستا کر وہ یوں بھی گھبرا گئے تھے جو اقتدار انہوں نے چھین کر حاصل کیا تو پھر دوسروں کو کیوں دے دیتے۔ انہوں نے نہیں دیا اور یہ بھی سُن لیجیے کہ وہ نہیں دیں گے ادھر انہوں نے پُرانی پالیسی پھر اپنالی ہے، یعنی مہاجرین کو خوب بڑھاوا دینا۔ پاکستان میں اگر مضبوط جمہوریت آجاتی ہے تو مہاجرین گھاٹے میں بھی رہ سکتے ہیں۔ یہاں مہاجرین اور مقامی افراد پر مشتمل افراد کے دو واضح گروپ بن گئے ہیں۔ مقامی حضرات، فوجی حکومت سے نالاں ہیں اور مہاجرین حکومت کی تعریف کرتے نہیں تھکتے۔ فوجی حکمرانوں نے تو کچھ دنوں کے لیے اپنا انتظام کرلیا ہے اور پاکستانیوں کے لیے یہ وقت انتظار کا ہے، سو ہم ابھی انتظار کر رہے ہیں۔

ایک روز سڑک پر شہناز سے اچانک ملاقات ہوگئی۔ شہناز، عظیم الدین ماموں کی بیٹی ہے ــــــ وہی عظیم الدین ماموں، جو مشرقی پاکستان چلے آئے تھے اور جنھوں نے ڈھاکہ میں بہت اچھّی مالی حیثیت بنالی تھی۔ شہناز نے ماں باپ کی مرضی کے خلاف ایک بنگالی فوجی افسر سے شادی کرلی تھی، اس کا ٹرانسفر بعد میں مغربی پاکستان ہوگیا۔ اسی درمیان بنگلہ دیش کا واقعہ رونما ہوگیا۔ عظیم الدین ماموں، مکتی باہنی کے اس مقتل میں موجود تھے، جو بہاریوں کے لیے قائم کیا گیا تھا۔ جب میں چامو ماموں کی مہربانی اور خدا کے فضل و کرم سے بچ کر آیا تو بیچارے پر اسی وقت فاتحہ پڑھ لیا تھا۔ اُن کے بچنے کا کوئی سوال ہی نہیں تھا، لیکن وہ جو کہا جاتا ہے کہ قبر کی زمین اپنے نوالے کو پکارتی رہتی ہے، بس یہی پکار اُنہیں مقتل سے بچالے گئی۔ وہ کسی نہ کسی طرح پاکستان پہنچ گئے اور چند ہفتوں کے اندر اپنی دوگز زمین کا نوالہ بن گئے۔ شہناز ڈھاکہ میں میرے قریب آگئی تھی سگی بہن کی طرح۔ اُس کا شوہر فوج کی نوکری چھوڑ کر عرب میں ایک بہت بڑی امریکی فرم میں ایگزیکٹیو ہے، شہناز اس کے ساتھ

رہتی ہے، یہاں انہوں نے اپنے دو بچوں کو رکھ چھوڑا ہے جو تعلیم حاصل کر رہے ہیں۔ اپنا شاندار بنگلہ ہے۔ مہینہ دو مہینہ بعد یہ لوگ بچوں سے ملنے آجاتے ہیں۔ شہناز بہت محبت سے ملی۔ زیادہ پیسہ ہو جانے سے اس کا دماغ ذرا خراب نہیں ہوا ہے۔ میں نے تو اس سے اپنے بارے میں کچھ نہیں کہا تھا، لیکن وہ نازیہ سے ملنے گھر آگئی تو اس پر سب کچھ عیاں ہو گیا۔ گھر کی اینٹ اینٹ نے اس سے ساری داستان کہہ ڈالی۔ اُس نے مجھ سے عرب چلنے کو کہا۔ پہلے تو میری سمجھ میں نہ آیا کہ کیا جواب دوں۔ اور کچھ نہ سوجھا تو میں نے کچھ سوچنے کی مہلت مانگی۔ پندرہ روز کے بعد شہناز کا شوہر قاضی نذر محمد عرب سے آگیا۔ اس نے بھی مجھ پر بہت زور ڈالا کہ میں عرب چلوں۔ میں نے بھی سوچ لیا کہ مجھے چلا ہی جانا چاہیے۔ میں نذر محمد کے ساتھ عرب چلا آیا۔ اسی کی کمپنی میں مجھے نوکری مل گئی۔ تنخواہ چار ہزار ریال اور رہنے کو فلیٹ۔ کچھ دنوں کے بعد نازیہ اور بچوں کو بھی بلا لیا۔ یہاں سب سے بڑا پرابلم تعلیم کا ہے۔ چنانچہ پھر بعد میں بچوں کو کراچی واپس بھیجنا پڑا۔ کراچی میں ہم نے ایک فلیٹ خرید لیا ہے۔ بچے وہیں رہتے ہیں۔ ہم سال میں دو چار بار انھیں جا کر دیکھ آتے ہیں۔ نازیہ دھیرے دھیرے اپنی دنیا میں لوٹ رہی ہے۔

ابا جان ——— یوں تو پاکستان اور ہندوستان کے بے شمار افراد عرب کے مختلف علاقوں میں کام کرتے ہیں۔ اُن میں بہتیرے تو اپنے ملک کی اچھی نوکریاں چھوڑ کر آئے ہیں، محض چند فاضل پیسوں کی خاطر۔ بہت سے لوگ تو زیادہ پیسوں کے وعدے پر آئے، لیکن توقع سے بہت کم پیسے اُنہیں مل رہے ہیں، لیکن وہ اپنی کشتیاں جلا چکے ہیں اس لیے جس حال میں ہیں، اُسی میں خوش رہنے کی کوشش کرتے ہیں۔ یہاں پیسہ، روٹی اور دُنیا بھر کے آسائش کی کوئی کمی نہیں، لیکن آدمی کی یہاں کوئی عزت نہیں۔ جو بھی عوام، آئین اور حقوق کی بات کرتا ہے، وہ غائب ہو جاتا ہے اور کسی کو پتہ بھی نہیں چلتا کہ اس کا کیا حشر ہوا۔ غیر عرب کو تو یہ انسان ہی نہیں سمجھتے، جانوروں سے بدتر اُن کا سلوک ہے۔ عرب اور غیر عرب کے درمیان یہاں کوئی تعلق نہیں ہے۔ ابھی حال ہی میں ہندوستان کے ایک ڈاکٹر کے زیر علاج

ایک عرب کی موت ہوگئی، عربوں نے قصاص کے طور پر اُس کو قتل کر کے لاش ایک تابوت میں بند کر کے اُس کے گھر بھجوا دی۔

یہاں کی کمپنیاں باہر کے کام کرنے والوں کے پاسپورٹ ضبط کر لیتی ہیں اور اگر کسی بات پر ملازم کے ساتھ ناراضگی ہوگئی تو واپسی کا ٹکٹ اس کے ہاتھوں میں تھما دیا جاتا ہے۔ پاسپورٹ ضبط ہو جانے کی صورت میں وہ دوسری جگہ اپنی مرضی سے جا نہیں سکتے۔ یہاں تو عام طور پر ہندوستانی اور پاکستانی، دوسرا پاسپورٹ بنوا کر رکھتے ہیں کہ بوقت ضرورت کام آئے۔

اگر کوئی غیر عرب آگے جا رہا ہے تو عرب کبھی برداشت نہیں کر سکتا کہ اُس کی کار پیچھے رہ جائے۔ وہ خطرناک سے خطرناک حالات میں بھی OVERTAKE کرنے سے باز نہیں آتا۔ سڑک کے حادثات یہاں بہت عام ہیں، یوں حادثے کے بدلے میں روپے بہت مل جاتے ہیں۔

عزتِ نفس یہاں نہیں ہے ابّا ——— جس چیز کے لیے ہم لوگ ہندوستان میں مرتے رہے، پاکستان میں ترستے رہے، اس شئے کا یہاں وجود ہی نہیں ہے۔ یہاں سب کچھ کھو کر جو چیز حاصل ہوتی ہے وہ پیسہ ہے جس سے ہر چیز بازار میں خریدی جاتی ہے۔ بس تین چار برس یہاں اور رہنے کا ارادہ ہے، اس سے زیادہ کی ہمت نہیں ہے۔ اِن تین چار برسوں کے بعد جو کچھ ہاتھ لگے گا اس کے سہارے ساری زندگی بسر کرنے کا ارادہ ہے ———

میں نے اور نازیہ نے حج کر لیا ہے۔ نانی اماں اور اماں کی طرف سے حجِ بدل بھی کر لیا ہے۔ آپ بھی حج کر لیجیے ابّا جان ——— آپ کو وہاں سے اڑ کر صرف یہاں آجانا ہے اور یہاں تو میں ہوں ہی۔ اور کیا لکھوں ابّا جان ——— بس آپ تیاری کیجیے اس عظیم فریضے کو ادا کرنے کے لیے ——— آپ کا بیٹا

■■■